۵ شمارہ ۱۰] لاھور [جنوری ۱۹۵۳

اس شمارہ میں

: بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

علمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

جنوری سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ۵

شمارہ ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶/۸ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کر یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور
سے شائع کیا

جلسہ تقسیم اسناد

اس سال پنجاب یونی ورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کی صبح کو یونی ورسٹی ہال میں منعقد ہوا۔ صوبے کے گورنر اور پنجاب یونی ورسٹی کے چانسلر جناب اسمٰعیل ابراہیم چندری گر صاحب نے کانووکیشن یڈریس پڑھا۔ اس خطبے میں موصوف نے نئے گریجویٹس کو آنے والی زندگی میں دشواریوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔

آپ نے فرمایا ''پاکستان کو متبحر عالموں، ذی فہم سیاست دانوں، قانون کے ذہین ماہروں اور بابلک دست صنعت کاروں کی ضرورت ہے۔ ماہرین فن کم یاب ہیں اور ان کی مانگ زیادہ ہے لیکن رلوگ حالاتِ زمانہ کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اپنا راستہ آپ تلاش کر لیتے ہیں اور ان کے ذاتی جوہر لک کر رہتے ہیں۔ انسان کو دنیا میں مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، مگر یہ مشکلات اتنی شدید نہیں ہیں کہ ان پر آسانی سے قابو نہ پایا جا سکے۔ جس شخص میں استعداد اور ہمت ہوتی ہے وہ ان مراحل سے گذرتا امنزلِ مقصود تک پہونچ جاتا ہے۔ اگرچہ جب ایک نوجوان یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے تو ہے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو پیشہ اس نے اختیار کیا ہے اس میں بہت زیادہ ہجوم ہے اور اس کے لئے قی کے امکانات بہت کم ہیں۔

آزادی کے حصول کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تدریسی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں، جو ممالک غلامی کی

زنجیروں کو توڑ چکے ہیں، ان کے اساتذہ اور طلبہ دونوں میں ایک نیا جوش، ولولہ اور ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے لیکن افسوس ہم آج بھی نشاطِ کار سے نا آشنا ہیں ہمیں ان بجھی بجھی طبیعتوں میں نیا ذوق وشوق پیدا کرنا ہوگا ..... تعلیم کے صحیح مقصد کو سامنے رکھ کر ہمیں نوجوانوں کے کردار کو قومی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی ہوگی، انھیں اچھے شہری بننے کی تربیت دینی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ انھیں معاشرے کی اقتصادی زندگی میں ایک مناسب مقام مل جاتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان میں اپنے فرائضِ منصبی کو بطریقِ احسن انجام دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے حالات کو سازگار بنانا ہوگا، ہماری شخصیتوں کی تشکیل بالعموم لاحاصل سی ہوتی ہے، یہ کسی سوچی سمجھی تجویز یا فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی، اسی طرح حصول روزگار بھی اتفاق اور قسمت پر مبنی ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض شعبوں میں نوجوانوں کو حسبِ ضرورت صحیح تربیت دی جاتی ہے لیکن بالعموم طلبہ کی اکثریت متوقع رہنمائی سے محروم رہ جاتی ہے ...... آخر کالج نے ہمیں ایسی تعلیم کیوں نہیں دی جو گریجویٹ ہونے کے بعد ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتی؟ یہاں سے جانے کے بعد یہ سوال آپ میں سے بیشتر کی زبان پر ہوگا۔

میں بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ ہمارا انتظامِ تعلیم اور طریقِ تدریس دونوں معیاری نہیں ہیں۔ اور لطف یہ کہ ہم اس نظام کو بہتر بنانے کے وسائل کو آج بھی نظر انداز کر رہے ہیں۔ لیکن تابکے، ہم ان متروک اور دور از کار طریقوں سے کب تک کام چلائیں گے، کیا ہم کسی معلم سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے شاگردوں کو عمدگی سے پڑھا سکے گا جب تک وہ خود ہی اس علم کی ماہیت کو نہیں سمجھتا؟ وہ طلبہ کو صحیح راستے پر نہیں ڈال سکتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کی کثیر تعداد نذرِ حوادث ہو جاتی ہے۔

یہ کہنا کہ طلبہ اور اساتذہ اسکولوں اور کالجوں میں متنازعہ مسائل سے دور رہیں، معقولیت اور حقیقت دونوں سے بعید ہے، ان کے گرد وپیش ہر وقت انھیں مسائل پر بحث ہوتی رہتی ہے، فلم، ریڈیو، اخبار ان کی نگاہوں کو کسی نہ کسی نقطۂ خیال پر مرکوز کر دیتے ہیں، جمہوری ملکوں میں طلبہ تعلیم کے اختتام کے ساتھ کچھ اپنے نظریات قائم کر لیتے ہیں، اور اپنی آئندہ زندگی میں اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں، کیا ہمارا مقصد ان نوجوانوں کو

روشن دماغ اور بالغ نظر شہری بنانا نہیں ہے ، کیا ہم انہیں ہر پروپگنڈا کرنے والے لیڈر کے سپرد کردیں گے ؟ یہ اسلامی آئین و ضوابط کے منافی ہے ...... اس لئے ہمیں اپنی تعلیم گاہوں کو چھوٹے چھوٹے جمہوری معاشروں میں تبدیل کرنا ہوگا۔

لیکن صرف ذہنوں کی تربیت ہی کافی نہیں ہوتی ، پچھلی ربع صدی میں فن تعلیم نے نصاب اور طریق تدریس میں بہت ترقی کرلی ہے ، مگر جب ہم اخلاقی تعلیم کی طرف نگاہ اٹھاتے ہیں تو معاملہ کچھ مشکوک سا نظر آتا ہے ..... سماجی اور اخلاقی اقدار ، ماحول ، ہمدردی ، اور توجہ سے حاصل ہوسکتی ہیں ، اخلاقی تعلیم میں ہماری ناکامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نصابی تعلیم پر زیادہ زور دیتے ہیں اور سماجی اقدار کی ترقی یا اخلاقی عادتوں کو سنوارنے سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں ،

ان تمام دشواریوں کا ایک سبب موجودہ نظام امتحانات بھی ہے ، یہ نظام ابتدائی امتحانوں سے لے کر اعلیٰ امتحانوں تک قوت حافظہ پر منحصر ہوتا ہے ، جو طلبہ ضروری واقعات کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھ سکتے ہیں وہ کامیاب ہوکر وظیفہ پاتے ہیں ، پروفیسر بن جاتے ہیں ، یا ملک کے نظم و نسق میں کسی عہدے پر پہونچ جاتے ہیں . امیدواروں میں کچھ قوت فکر بھی ہے یا نہیں ، امتحانات اسے متعین نہیں کرسکتے "

اس پورے خطبے میں نظام تعلیم ، طلبہ کے محسوسات اور قومی ضروریات کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے ، اس کے تجزیئے سے حسب ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں ۔

(۱) ہمارے سامنے تعلیم کا کوئی واضح اور متعین مقصد نہیں ہے ۔

(۲) جو طریق تدریس ہماری تعلیم گاہوں میں رائج ہے اس سے طلبہ کی اکثریت فائدہ نہیں اٹھا سکتی ۔

(۳) ذہنی اور دماغی تربیت و اصلاح کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے ۔

(۴) سماجی اور اخلاقی قدروں کے حصول کی کوشش نہیں کی جاتی ۔

(۵) نظام امتحانات ناقص ہے ، اس میں طلبہ کی قوت حافظہ کا تو جائزہ لیا جاسکتا ہے . لیکن ان کی قوت فکر و جودت طبع کی پیمائش نہیں کی جاسکتی ۔

ایسے موقعوں پر بالعموم تعلیم کے بنیادی نقائص اور قوم کی تعلیمی ضروریات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے

اور یہ امید ظاہر کی جاتی ہے کہ چند باتیں دنیائے تعلیم میں ذہنی انقلاب لانے کا موجب ہوں گی، اس میں شک نہیں کہ وقتی جوش و خروش بھی پیدا ہو جاتا ہے، عزم و ہمت کے پیمان بھی باندھے جاتے ہیں لیکن جلسے کا ہنگامہ ختم ہوتا ہے تو یہ خوش آئند باتیں بھی اسیر نگاموں میں ڈوب کر رہ جاتی ہیں۔ اس خطبے میں جن بنیادی خرابیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ سب درست اور برحق ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے نوجوانوں اور اساتذہ میں جوش و خروش کی کمی ہے، ہم ان اونچی ذہنی اقدار کے بھی حامل نہیں ہیں جو آزاد قوموں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں، ہماری تعلیم گاہوں میں طلبہ کی صحیح راہ نمائی بھی نہیں کی جاتی، اور پانچ چھ سال یونی ورسٹی یا کسی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب وہ اس دنیا میں آتے ہیں تو یہ ان کے لئے ان کی خیالی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے، انہیں جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس کا ہلکا سا تصور بھی ان کے ذہن میں اس سے پہلے کبھی نہیں آتا، یہ بھی صحیح ہے کہ تعلیم گاہوں میں رعنائی افکار اور بلندی فکر و نظر نہیں ہے، سماجی اور اخلاقی تربیت میں بھی ہم اوروں سے بہت پیچھے ہیں اور جب تک مختلف سماجی قدروں کو بطریق احسن اپنانے کی کوشش نہیں کی جائے گی کسی اچھے نتیجے کی توقع موہوم محض ہے، یہ بھی مانا کہ ہمارا نظام امتحانات بھی ناقص ہے لیکن مرض کی تشخیص سے مرض کی شدت میں تو کمی نہیں ہوتی، ان نقائص کو دور کرنے کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے، صرف نظام تعلیم کی تنقیص سے مطلب براری نہیں ہو سکتی۔

تعلیمی تنقید کا یہ عجیب مسئلہ ہے کہ بالعموم نقائص سے واقف ہونے پر بھی ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، یہ ظاہر ہے کہ وہ تنقید جو اخباروں اور پلیٹ فارموں سے کی جاتی ہے یا تو اس کا مقصد تنقیص ہوتا ہے یا تنقید برائے تنقید، اس میں اصلاحی او تعمیری سرگرمی نہیں ہوتی، لیکن جب یہی کلمات کسی ذمہ دار شخص کی زبان سے نکلتے ہیں تو کچھ ڈھارس بندھتی ہے کہ یہ محض نقائص کی نشان دہی نہیں ہے، ان میں تعمیر و استحکام کا جوش اور ولولہ بھی ہے، ہم جناب گورنر صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے گذارش کریں گے کہ آپ صاحب اختیار بھی ہیں اور بحیثیت چانسلر یونی ورسٹی کے نظم و نسق سے متعلق بھی اور آپ اس تعلیمی کج روی کو شدت سے محسوس بھی کر رہے ہیں ہمیں توقع ہے کہ آپ نے جس تعلیمی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا ہے، اس کے لئے عملی اقدام بھی کریں گے ۔

برطانیہ کے دارالاطفال

خواجہ غلام نبی بٹ

برطانیہ کے دارالاطفال (NURSERY SCHOOL) برطانوی نظام تعلیم کی شاندار عمارت میں خشتِ اوّل کا درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ یہی وہ اسکول ہیں جن میں سب سے کم عمر کے بچے یعنی ۲ سال سے لے کر ۵ سال کی عمر تک کے بچے داخل کئے جاتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو برطانیہ کے دارالاطفال دورِ حاضر ہی کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد چند ماہرینِ تعلیم نے اس بات پر زور دیا کہ ایک بچے کی عمر میں ۲ سال سے لے کر ۵ سال کی عمر تک کا درمیانی وقفہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بچے کا دماغ ہر بُرے یا اچھے اثر کو جلد قبول کر سکتا ہے اور اس کی آئندہ زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار انہی تین سالوں کی تربیت پر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ طبِ جدید کے ماہرین نے بھی اس بات پر زور دیا کہ یہی وہ تین سال ہیں جن میں طبی نقطۂ نگاہ سے بچے کی دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہے تاکہ اس کی آئندہ صحت کی بنیاد استوار کی جا سکے۔

ماہرینِ تعلیم میں مس مارگریٹ میکملن (MISS MARGARET MACMILLAN) پیش پیش تھیں۔ اس نیک دل خاتون کے خیالات کی حمایت میں انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے [illegible]ات نے لمبے چوڑے مقالے لکھے لیکن یہ تمام آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں، اور کسی نے [illegible]مدگی سے اس کی باتوں کو سننے کی کوشش ہی نہ کی۔ یہاں تک کہ گلاسگو جیسے بڑے شہر [illegible] جہاں اس وقت ۶۰ سے زیادہ دارالاطفال ہیں، سنہ ۱۹۳۶ء میں صرف ایک دارالاطفال [illegible] اور وہ بھی ایک پرائیویٹ ادارہ تھا جو ایک مخیّر خاتون کی فیاضیوں کا مرہونِ منت تھا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی، اور ہٹلر کی جنگی تیاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے برطانیہ کو اپنے تمام ذرائع کو میدان میں لانا پڑا، یہاں تک کہ فوجی ضروریات کا سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو بھی کام کرنا پڑا، باپ تو پہلے ہی کارخانوں میں کام کر رہے تھے، ان کے ساتھ ماؤں کو بھی ان میں کم سے کم آٹھ گھنٹوں کے لئے گھریلو زندگی کو خیرباد کہنا پڑا باقی رہ گئے ننھے بچے، سو ان کی تربیت کے لئے گورنمنٹ کو زمانہ جنگ کی پرورش گاہوں — (WARTIME NURSERIES) کا اہتمام کرنا پڑا، دوران جنگ کے تجربات نے ثابت کردیا کہ یہ پرورش گاہیں چھوٹے بچوں کی مناسب اور صحیح تربیت کے لئے بہترین قسم کے ادارے ہیں، چنانچہ انہی نتائج کے پیشِ نظر انگلستان کے تعلیمی قانون مجریہ ۱۹۴۴ء اور اسکاٹ لینڈ کے تعلیمی قانون مجریہ ۱۹۴۵ء کی رُو سے جہاں بہت سے دوسرے ترقی پسندانہ اقدامات کئے گئے وہاں ہر مقامی تعلیمی حکومت (L.E.A) کے ذمے یہ فرض عائد کردیا گیا کہ وہ اپنے حلقہ اثر میں دارالاطفال کے اجراء کا اہتمام کرے، ان قوانین کی رو سے والدین کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے بچے کو دارالاطفال میں بھیجیں کیونکہ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں لازمی تعلیم کی عمر کا عرصہ ۵ سال سے ۱۶ سال تک ہے لیکن ان اسکولوں کی افادیت کو دیکھ کر والدین کی بیش از بیش تعداد اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ ان کے کم عمر بچوں کی تربیت کے لئے دارالاطفال میں داخلہ کا انتظام کیا جائے۔

ذرا غور سے دیکھا جائے تو عام گھروں میں ایسا ماحول پیدا کرنا بہت مشکل ہے جس میں بچے کی دماغی اور جسمانی نشوونما کے عمدہ مواقع میسر آسکیں، اسی ماحول کے فقدان نے ہی دارالاطفال کی اہمیت کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ دارالاطفال خاص طور پر ایسے بچوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے ہیں جن کے والدین کی رہائش صنعتی علاقوں میں ہوتی ہو، اور ان کے گھروں کے آس پاس کھیلوں کے میدان نہ ہوں، یا جن کی مائیں اسقدر کمزور واقع ہوئی ہوں کہ بچوں کی تربیت کا بارِ عظیم اپنے کمزور کندھوں پر نہ اٹھا سکیں، یا جن بچوں کی ماؤں کا انتقال ہو گیا ہو، یا جہاں میاں بیوی کے تعلقات اچھے نہ ہوں اور ان کی آپس کی کئے دن کی شکر رنجی سے ننھے اور معصوم بچے کی آئندہ زندگی پر برا اثر پڑنے کا

مال ہو۔ یا جہاں ماں کو کنبے کے بڑا ہونے کی وجہ سے گھر کے کام کاج سے فرصت ہی نہ مل سکے، یا اپنے
بنے کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے کسی کارخانے یا دفتر میں کام کے لئے جانا پڑے، ایسے حالات
یں ایک آزاد مملکت کی حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ننھے بچوں کی صحیح اور مناسب تربیت کا انتظام کرے تاکہ
ج کے چھوٹے بچے کل کے بالغ شہری بن سکیں اور ملک وملت کے کام آسکیں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ایک اچھا گھر جہاں ماں اور باپ اپنے کم عمر بچوں
کی تربیت میں پوری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہوں اور جہاں ان کے دماغی اور جسمانی قویٰ کے پھلنے
پھولنے کے بہترین مواقع میسر آرہے ہوں، یقیناً ایک دارالاطفال سے بہتر ہوگا، اور ہمیں مشہور
ماہر تعلیم (COMENIUS) سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ انسانی عمر کے پہلے چھ سالوں تک بچے کی
درس گاہ ماں کی گود ہی ہونی چاہئے لیکن ہم میں سے کتنے باپ اور کتنی مائیں ایسی ہیں جو روزمرہ کے
دھندوں سے فرصت کے کچھ ایسے لمحات بھی نکال سکیں جن میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی نگہداشت کر سکیں
دارالاطفال کو دراصل اسکولوں کے لفظ سے یاد نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ صرف تربیت گاہیں کہہ دینا
ی ہوگا کیوں کہ اسکولوں سے مراد ہم عام طور پر ایسی جگہیں لیتے ہیں، جہاں لکھائی۔ پڑھائی اور
اب وغیرہ کے سکھانے کا اہتمام ہو لیکن دارالاطفال میں اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اس کے
س اسکول کے وسیع وعریض کھیل کے کمروں، ان کی خوبصورت دیواروں، مفید تعلیمی کھیلوں، باغیچے کے
خوبصورت پودوں اور رنگا رنگ پھولوں کی صحبت ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ جس میں بچوں
، پوشیدہ قوتوں کو ابھرنے کا موقع دیا جاتا ہے، ان کی عادتیں درست رکھی جا سکتی ہیں، انہیں اپنے
عضائے جسمانی پر مکمل اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی آنے والی تعلیمی زندگی کے لئے بہتر طریق پر تیار
کرتے ہیں۔

ایک عام دارالاطفال میں چالیس سے پچاس بچوں تک کی تربیت کا انتظام ہوتا ہے، ایک
ایسے اسکول کا اسٹاف پانچ خواتین پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں سے ایک سپرنٹنڈنٹ ہوتی ہے۔ جو
دارالاطفال میں کام کرنے کے لئے تربیت یافتہ ہوتی ہے، اور وہ اس کی معاونین ہوتی ہیں۔

معاونین عام طور پر ۱۸ سے ۲۰ سال کی عمر تک کی نوجوان لڑکیاں ہوتی ہیں جو بسا اوقات غیر تربیت یافتہ ہوتی ہیں، اور سپرنٹنڈنٹ کی زیر ہدایت کام کرتی ہیں، ایک باورچن ہوتی ہے، جو بچوں کے لئے دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے کا انتظام کرتی ہے، اور ایک چوکیدارن جو اسکول کے بیش قیمت سامان کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اسکول کی صفائی وغیرہ کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے، ان پانچ خواتین کے علاوہ ایک ڈاکٹر اور نرس وقتاً فوقتاً بچوں کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے اسکول میں آتے رہتے ہیں اسٹاف کا تقرر کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ کام صرف ایسی خواتین کے سپرد کیا جائے جو صحیح معنوں میں بچوں کی بے لوث خدمت کا جذبہ دل میں لئے ہوئے ہوں، طبعاً خوش مزاج ہوں اور بچوں کے ساتھ انہیں خاص پیار اور محبت ہو۔

معاونین کے انتخاب میں اور بھی زیادہ احتیاط برتی جاتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ ان کا اپنا طرز تکلم نہایت صاف اور شستہ ہو، تاکہ بچوں کو صاف ستھرا بولنا سکھا سکیں۔

ایک عام دارالاطفال کے روزمرہ کے پروگرام کو سمجھنے کے لئے میرے خیال میں بہتر ہوگا، اگر میں آپ کو گلاسگو کے ایک دارالاطفال میں لے چلوں، گلاسگو کا یہ دارالاطفال گلاسگو کے ایک نہایت ہی گنجان آباد علاقے اینڈرسن اسٹریٹ (ANDERSON STREET) میں واقع ہے اور اسی نسبت سے اس کا نام بھی اینڈرسن اسٹریٹ دارالاطفال (ANDERSON STREET NURSERY SCHOOL) ہے، یہاں کی سپرنٹنڈنٹ ایک نہایت ہی خوش اطوار خاتون مس ٹیلر (MISS TAYLOR) ہیں، وہ اپنے شاگردوں کو اپنے حقیقی بہن بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی ہیں، اگر آپ اس دارالاطفال کے سارے پروگرام کو دیکھنا چاہیں تو آپ کو ٹھیک نو بجے اسکول کی چار دیواری میں پہنچ جانا چاہیئے، نو بجے سے ساڑھے نو بجے تک بچے اپنی ماؤں کی انگلیاں پکڑے اسکول میں آتے رہتے ہیں اور تقریباً ساڑھے نو بجے تک تمام بچے اسکول میں حاضر ہو جاتے ہیں، جب بچہ اسکول کی چار دیواری میں داخل ہو جاتا ہے، تو ماں کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اس کا نور نظر محفوظ ہاتھوں میں ہے، اور اسے اس کی حفاظت کے متعلق کسی قسم کی تشویش کرنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ

کسی قریبی بس اسٹینڈ پر قطار میں کھڑی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اس کے کارخانے کی طرف جانے والی بس چند ہی منٹوں میں اسے کارخانے تک لے جاتی ہے اور وہ پورے آٹھ گھنٹوں کے لئے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔

انگلستان آپ جانتے ہیں ایک سرد ملک ہے اور اسکاٹ لینڈ دور شمال میں ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ سرد ہے۔ وہاں اوورکوٹ کے بغیر گذارا نہیں ہو سکتا، اوورکوٹ ان کے لباس کا ایک ضروری جزو ہے چنانچہ ہر چھوٹا بڑا، بچہ بوڑھا، مرد عورت اوورکوٹ پہن کر ہی باہر نکلتے ہیں جب ایک بچہ اسکول کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اُسے بڑے سلیقے سے اوورکوٹ کو اتارنا ہوتا ہے، اگر اس پر برف کے گالے یا بارش کے چھینٹے تیرتے ہوئے ہوں تو اُسے جھاڑ کر ایک خاص جگہ لٹکانا ہوتا ہے، اب دو یا تین سال کا بچہ ہے لکھ پڑھ سکتا نہیں کہ کھونٹی پر اس کا نام لکھ دیا جائے چنانچہ مس ٹیلر نے یہاں ایک بڑی دلفریب ترکیب نکالی ہے اور وہ یہ ہے کہ مختلف کھونٹیوں کے اوپر مختلف جانوروں اور پرندوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں ہر بچے کو ایک خاص کھونٹی الاٹ کر دی جاتی ہے، اور وہ کھونٹی کے اوپر لگی ہوئی تصویر کو بغور دیکھ لیتا ہے، آئندہ ہمیشہ وہ اپنا کوٹ اسی کھونٹی پر لٹکائے گا جو اسے تفویض ہو چکی ہے چنانچہ باہر سے آنے والے شخص کو ایک خاص ترکیب میں رنگارنگ کے اوورکوٹ ٹنگے دیکھ کر مس ٹیلر کی اس خاص ترکیب کی خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کمرے کو جہاں کہ بچے اپنے اوورکوٹ محفوظ رکھتے ہیں اطاق پوشاک (CLOAK ROOM) کہتے ہیں، اس میں گرم ہوا کے آنے جانے کا انتظام ہوتا ہے تاکہ اسکول سے جاتے وقت بچوں کے اوورکوٹ پھر خشک ہو جائیں اور باہر کی سردی سے ان کے نرم و نازک جسموں کو محفوظ رکھ سکیں۔

اطاقِ پوشاک کے آداب سے فارغ ہونے کے بعد بچہ ایک مرکزی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں مس ٹیلر یا ان کی معاونین بچے کو خوش آمدید کہنے کے لئے موجود ہوتی ہیں، بچہ نہایت ادب سے انہیں سلام کرتا ہے جس کا جواب نہایت شفقت بھرے لہجے میں دیا جاتا ہے، ہر بچے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ علیک سلیک سے فارغ ہونے کے بعد فوراً اس وسیع و عریض کمرے کی طرف جائے جہاں مختلف قسم کے

دلپسند کھیلوں کا انتظام ہوتا ہے کہیں بچوں کے لئے ٹرائی سکل ہیں تو کہیں بچہ گاڑیاں ہیں، کہیں ننھی منھی موٹر کاریں ہیں تو کہیں لکڑی کے گھوڑے سواری کی دعوت دے رہے ہیں، کہیں کودنے کے اسٹینڈ ہیں تو کہیں پھاندنے کی رسیاں رکھی ہیں (SEE-SAWS) جھولے اور اسی قسم کے اور بے شمار کھیل موجود ہیں، بچے باری باری اپنی پسند کے کھیلوں سے لطف اٹھاتے ہیں اور خوب خوش ہوتے ہیں، اگر کوئی چھوٹا بچہ کسی بچہ گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے تو اس سے ذرا بڑی عمر کا بچہ اس گاڑی کو کبھی آگے دھکیل کر اور کبھی پیچھے کھینچ کر اپنے جسمانی اعضا کی ورزش کا سامان بہم پہونچاتا ہے۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے ایک گھنٹی بجتی ہے اور تمام بچے مرکزی کمرے میں پہونچ جاتے ہیں جہاں ان کی ذاتی صفائی کی پریڈ ہوتی ہے، صاف ستھرے بچوں کو کھیل کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے، اور گندے بچوں کا منہ ہاتھ دھلایا جاتا ہے، ان کے دانت صاف کرائے جاتے ہیں، بالوں میں کنگھی کی جاتی ہے، اور تھوڑی ہی دیر میں سب بچے صاف ستھرے نظر آنے لگتے ہیں، اس وقت تک سوا دس بج جاتے ہیں، سب بچوں کو گھنٹی کے ذریعے ایک دفعہ پھر مرکزی کمرے میں جمع کیا جاتا ہے، اور ہر بچے کو سرکاری خرچ پر دودھ کی ایک بوتل دی جاتی ہے جسے وہ نالی کی مدد سے پی جاتا ہے اور روز بروز اپنی صحت کو بہتر سے بہتر بنائے جاتا ہے، اس کام میں تقریباً پندرہ منٹ صرف ہو جاتے ہیں، اب سب بچے ایک بڑے دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں اور درمیان میں پڑے ہوئے گراموفون پر (NURSERY RHYMES) بچوں کے گیتوں کے ریکارڈ بجنا شروع ہوتے ہیں، بچے ان ریکارڈوں کو خوب شوق سے سنتے ہیں، ایک ایک ریکارڈ کو حسب ضرورت دو دو تین تین دفعہ بجایا جاتا ہے، اور پھر بچوں کو باری باری اسی انداز میں ان گیتوں کو گانے کے لئے کہا جاتا ہے کئی بچے اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ جلد ہی ان گانوں کی ہو بہو نقل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہونچاتے ہیں، بچوں کے گیت بچوں کو بہت ہی مرغوب ہوتے ہیں، اور ہر قوم کے بچے خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں انہیں بہت ہی پسند کرتے ہیں اور خوب شوق سے گاتے ہیں، مقام شکر ہے کہ ہماری قوم کے شعرائے کرام نے بھی بچوں کی اس اہم ضرورت کا احساس کیا ہے اور صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم، عبدالمجید صاحب بھٹی اور بعض دوسرے اصحاب نے بچوں کی فطرت کے مطابق

گیت لکھے ہیں جنہیں بچوں نے خوب پسند کیا ہے، ننھے بچے ساڑھے گیارہ بجے نرسری ٹائم سے فارغ ہو جاتے ہیں، اور پھر ایک گھنٹے کے لئے تعلیمی کھیلوں میں مصروف ہو جاتے ہیں، تصویروں میں رنگ بھرے جاتے ہیں، لکڑی کے ٹکڑوں کو جوڑ کر مختلف جانوروں کی تصویریں مکمل کی جاتی ہیں، مٹی اور ریت سے گھروندے بنائے جاتے ہیں، اوزان - پیمانوں اور لکڑی کے مکعبوں کو ایک خاص انداز میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ تاکہ بچے چھوٹے اور بڑے، کم اور زیادہ کے فرق کو سمجھ سکیں۔ ساڑھے بارہ بجے سے ایک بجے بعد دوپہر تک سب بچے ننھی ننھی میزوں کے پیچھے بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں، مس ٹیلر اور ان کی معاونین بچوں کے ساتھ ہی بیٹھ جاتی ہیں، اور انہیں کھانا کھانے کے آداب سکھاتی ہیں، بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ چھری کس ہاتھ میں پکڑی جاتی ہے اور کانٹا کس ہاتھ میں، کھانے سے فارغ ہو کر چھوٹے بچے اپنی توتلی زبان میں کہانیاں سناتے ہیں، اور ان کے ساتھی انہیں بڑے شوق سے سنتے ہیں، کہانیاں سناتے سناتے چند بچے اونگھنے لگتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے سو جانے کا وقت ہے، اسکول کی بالائی منزل میں بچوں کی تعداد کے مطابق ایک وسیع کمرے میں بستر لگے ہوتے ہیں، ہر بستر کے سرہانے وہی تصویر لگی ہوتی ہے جو الماری پوشاک کی کھونٹیوں پر لگی ہوتی ہے، گویا یہاں بھی ہر بچے کا بستر مخصوص ہوتا ہے، بچے اپنے اپنے بستر میں داخل ہو جاتے ہیں، پردے گرا دیئے جاتے ہیں، کمرے میں خاموشی کا دور دورہ ہو جاتا ہے، اور پانچ سات منٹ کے اندر اندر سب بچے خراٹے بھرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں، ٹھیک دو گھنٹے کے بعد بچے یکے بعد دیگرے بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اور اپنے بستروں سے باہر آجاتے ہیں، اور نچلی منزل کے مرکزی کمرہ میں کھانے کی میزوں پر بیٹھ جاتے ہیں، باورچن اس وقت تک چائے تیار کر لیتی ہے، اور سب بچوں کو ایک ایک پیالی چائے اور دو دو بسکٹ مل جاتے ہیں، کچھ بڑے بچے باری باری مختلف ایام میں کھانا اور چائے اپنے ہمجولیوں کے سامنے رکھتے ہیں، اور اس طرح دسترخوان چننے کے طریقوں سے واقف ہو جاتے ہیں، اسی اثنا میں چار بج جاتے ہیں، اور بچوں کی مائیں فیکٹری سے واپسی پر انہیں اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہیں۔

دارالاطفال کی وجہ سے برطانیہ میں چھوٹے بچوں کی تربیت کا انتظام روز بروز بہتر ہوتا چلا جا رہا ہے اور بعض ایسی مائیں جنہیں اپنے گھروں میں فارغ البالی میسر ہے، اور انہیں اس قدر فرصت بھی ہے کہ وہ

اپنے بچوں کی دیکھ بھال خود کر سکیں وہ اکثر ان اسکولوں میں آتی ہیں، یہاں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر، اپنے بچوں کی بہتر تربیت کا انتظام خود اپنے گھر میں ہی کر لیتی ہیں۔

آپ حیران ہو کر دریافت کریں گے کہ برطانوی بچوں کو اس قدر آسائشیں کس طرح میسر آسکی ہیں، اور ہمارے بچوں کے اسکولوں میں اس قسم کا ماحول کب پیدا کیا جا سکے گا، اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ برطانوی قوم کے ذرائع آمدنی ہماری نسبت بہت وسیع ہیں، اور پھر وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کرنا بھی جانتے ہیں، صرف گلاسگو کی مثال آپ کے سامنے رکھوں گا، گلاسگو کا شہر جزائر برطانیہ میں لندن سے دوسرے درجے پر ہے، اس کی آبادی تقریباً ساڑھے دس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے، گویا اتنی ہی جتنی کہ شہر لاہور کی تقسیم ملک سے قبل تھی، ساڑھے دس لاکھ کی آبادی والے اس شہر کا تعلیمی بجٹ نو کروڑ روپیہ سالانہ ہے، اور ہمارے پاک پنجاب کا تعلیمی بجٹ ہماری بے شمار اصلاحی کوششوں کے باوجود ابھی تین کروڑ روپیہ سالانہ سے کچھ کم ہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں برطانیہ والے تعلیم پر فی کس تقریباً ساٹھ روپے خرچ کرتے ہیں وہاں ہم صرف ایک روپیہ فی کس خرچ کرتے ہیں، ان حالات میں آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہمارے بچوں کو بھی وہی تعلیمی سہولتیں حاصل ہوں جو برطانوی بچوں کو حاصل ہیں، خدا کرے کہ ہمارے ذرائع آمدنی میں اضافہ ہو اور ہم بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنا بھی سیکھ جائیں

فروبل اور انگریزی تعلیم

محمد عبدالعزیز

ہماری موجودہ تعلیم اور اس کے نظام کو منقلب اہرام (INVERTED PYRAMID) سے تعبیر کیا گیا ہے
مدراس میں کلام بھی نہیں، برطانیہ سے جو نظام تعلیم ہمیں ورثے میں ملا ہے اس کے مختلف مدارج کچھ غیر مربوط
سے ہیں، ہم اپنی تمام تر قوت اعلیٰ تعلیم کے اہتمام میں صرف کر دیتے ہیں، اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف
بہت کم توجہ دیتے ہیں یعنی ہم کسی ایسے محل کی تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں جس کے کنگرے خوبصورت ہوں۔ اور جس کے بالائی
نقش و نگار جاذب نظر ہوں اس کی بنیاد کھوکھلی ہی کیوں نہ ہو، اگر بچوں کی تعلیم و تربیت سے یوں ہی اغماض کیا
گیا تو توقعات کا یہ شیش محل بہت جلد گر جائے گا۔ تعلیم تو ایک مسلسل کڑی اور ایک مربوط کل ہے اسے تقسیم نہیں
کیا جا سکتا، بچے کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما ہماری قومی دیوار میں چونا گارا کا کام دے سکتی ہے لیکن ابھی تک
ہم اپنے تعلیمی نظام میں بچے کو کوئی نمایاں جگہ نہیں دے سکے، اس ملک میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جو
ابتدائی مدارس موجود ہیں، ان کی تعلیمی حالت نہایت مایوس کن ہے، کنونٹ (متعلق بہ کلیسا) مدارس سے قطع نظر
میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مدارس میں بچوں کو تعلیم نہیں دی جاتی، تعلیم کا منہ چڑھایا جاتا ہے
پنجاب میں صرف ایک بچہ اسکول ہے جسے سرکاری اعانت حاصل ہے، اور غالباً سرکاری اور لوکل بورڈوں
کی تعلیم گاہوں میں اپنی نوعیت کا یہ منفرد ادارہ ہے جہاں کنڈر گارٹن (KINDER GARTEN) طریق تعلیم
رائج ہے، پچھلے سال اس ادارے میں تیس بچوں کے داخلے کی گنجائش تھی، ان تیس جگہوں کے لئے ۳۲۵
درخواستیں موصول ہوئیں، ان میں سے ۲۹۵ بچوں کی درخواستوں کو چار و ناچار مسترد کرنا پڑا، داخلے کا ہنگامہ

تم ہوا، ناکام بچے گھروں کو واپس گئے اور انجام کار انہیں مدارس میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا جن میں "رعنائی افکار"
مفقود ہوتی ہے، یا ان میں سے بعض بچوں کے والدین کسی اور موقع کی تلاش میں بچے کی تعلیم میں تاخیر کرتے
رہتے ہیں اور آسودہ حال والدین اپنے بچوں کو کونونٹ مدارس میں بھیج دیتے ہیں، ان مدارس کا تمام تر ماحول
مسیحی اور فرنگی ہوتا ہے، یہاں مشرقی مزاج میں مغربی آب و رنگ بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان سے
ان کی قوتِ فکر بھی چھین لی جاتی ہے اور ان کی آنکھوں پر مغربی تہذیب کی ایسی عینک لگا دی جاتی ہے
کہ دیکھیں تو اسی مستعار نگاہ سے اور سوچیں تو اسی زاویۂ نگر سے۔

قیام پاکستان کے بعد ہم ہر کام کو حکومت پر چھوڑ دینے کے عادی ہو چکے ہیں اور ہمارے موجودہ جمود
اور تعطل کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ ہم اجتماعی طور پر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی کچھ نہیں
سوچ سکتے، صرف لاہور شہر میں ایک نہیں بیسیوں کنڈر گارٹن مدارس کی ضرورت ہے۔ کیا اپنے بچوں کے لئے
نئے مدارس اور نئی تربیت گاہیں کھولنے کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی؟ نجی اداروں کے قیام پر ہمیں
سب سے زیادہ زور دینا چاہیئے نجی اداروں سے میری مراد پرائیٹ کالجوں کی تجارت گاہیں نہیں بلکہ عوامی
مدارس ہیں جو کسی انجمن کے زیر اہتمام مصروف کار ہوں، زندہ قومیں اپنی حکومت کی مساعی پر ہی قانع نہیں
رہتیں وہ اپنے قومی مفاد کے پیش نظر تعلیم کو فروغ دینے کے ہر ممکن وسیلے کو اختیار کر لیتی ہیں، آج سے
کوئی سو برس پہلے فروبل نے کنڈر گارٹن طریق تعلیم کی بنیاد ڈالی، اس تحریک نے تھوڑے ہی دنوں میں عالمگیر
شہرت حاصل کر لی، اور اس کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے مختلف یورپی ممالک نے اسے اپنے یہاں
رواج دیا، انگلستان نے بھی اس نظام تعلیم کا خیر مقدم کیا، اور اسے اپنے ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا
چونکہ ہمارا نظام تعلیم براہ راست برطانوی نظام تعلیم سے متاثر ہے، اس لئے انگریزی مدارس پر
فروبل کے اثرات کا مجمل خاکہ پیش کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس ملک میں کنڈر گارٹن طریق تعلیم کی ابتدا اور
اس کی اہمیت سے بحث کی جائے گی۔

فروبل کے انتقال کے سو سال بعد فروبل سمر اسکول (FROEBEL SUMMER SCHOOL) میں ایک
تربیت یافتہ مدرس کی زبانی یہ کلمات سنے گئے ——— "فروبل کون تھا؟ .... مرد یا عورت؟" انسان

وقت تک اس دنیا میں اپنے ماحول اور سماجی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرتا رہا، ہر عہد کے حالات
ف ہوتے ہیں، لیکن عام انسان کو مسائل کیف وکم سے کبھی دلچسپی نہیں ہوتی، دنیا کیسے بنی اس کا انجام
ہوگا، یہ ایسے مسائل ہیں جن میں الجھنا ان میں سے کوئی پسند نہیں کرتا، لیکن اس طریق تدریس کے
دی اصولوں کو جو اس کانفرنس میں زیر بحث آئے فروبل نے انتہائی غور و فکر کے بعد نہایت موثر انداز
پیش کیا، اور بقدر ضرورت اس کا پروپگنڈا بھی کیا۔ ۱۸۲۶ء میں فروبل کی کتاب ایجوکیشن آف مین (انسانی
) شائع ہوئی، اُس وقت سے لے کر اس وقت تک نظری اور عملی لحاظ سے یہ طریق تدریس مسلسل ترقی کرتا رہا ہے۔
فریڈرک فروبل ۱۷۸۲ء میں آبرویس بخ (OBERWEISSBACH) واقع تیورنجیا (جرمنی) میں پیدا
، وہ ایک گاؤں کے پادری کا بیٹا تھا، بچپن سے ہی اسے اپنی ذہنی کیفیات کے تجزیہ کا موقع ملا، اس نے
پنے ۱۸۲۷ء کے خط میں جو دراصل خود نوشتہ سوانح حیات کا درجہ رکھتا ہے، واضح الفاظ میں بیان کیا ہے
یری ابتدائی زندگی کے تجربات نے میری بالغ شخصیت کی تعمیر میں کتنا حصہ لیا ہے، اس کے باپ کے "تقدس"
اس کی شدت پسندی نے بیٹے میں مذہبی فلسفے کی شکل اختیار کر لی، جسے اس نے نہایت پرجوش انداز میں
ایا، فروبل کو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں سوتیلی ماں کے مظالم سہنے پڑے، وہ دوسرے گھروں کی مسرت
مادرانی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا، فی الحقیقت اسی جذبے سے سرشار ہو کر اس نے "آئیڈیل ماں"
نظری تخیل پیش کیا، اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی ترقی میں ماں اور بچے کے تعلقات کی اہمیت کے متعلق
ن کے حصول کی راہ متعین کی، فروبل نے سب سے پہلے محکمہ جنگلات میں ملازمت کی، اس وقت اس کے سپرد
روے (پیمائش) کا کام تھا، وہ تیورنجیا کی پہاڑیوں اور جنگلوں میں تا دیر پھرتا رہا، اس کے دل و دماغ میں
ہبی خیالات اور معتقدات تو پہلے ہی کار فرما تھے، جب اس نے قدرت کی صناعی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ
یا تو اس کے جذبات میں اور شدت اور اس کے خیالات میں اور وسعت پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ یہی اثرات
س کے جملہ کاروبار میں عملی طاقت کی صورت میں جلوہ نما ہوئے، اس نے کبھی کسی یونیورسٹی میں مکمل تعلیم
ہیں پائی، لیکن ان تعلیم گاہوں کو اس نے ہمیشہ محور کیا، جہاں اس نے مختلف موضوعات پر تحقیقی کام کیا
س کے تحقیقاتی کام مختلف مضامین پر مشتمل ہوتے تھے جن میں ریاضی، ہئیت، طبعیات اور لسانیات

بالخصوص قابل ذکر ہیں اور انہیں علوم نے اس کے ابتدائی غیر مربوط اور غیر منظم تعلیمی خلا کو پُر کیا، اور نظام کائنات میں انسان کے مقام کے متعلق اس کے خیالات کو اور تند بنا دیا، یہ ایک مربوط کل ہے۔

۱۸۰۵ء میں فروبل فرینک فرٹ گیا، یہاں آنے کا مقصد فن تعمیرات کا مطالعہ تھا، اس کی ملاقات فرینک فرٹ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہوئی جو پستولزی (PESTALOZZI) کا شاگرد تھا، اس نے اسے اس مدرسے میں پڑھانے کی دعوت دی، در اصل اسی وقت سے اس کی زندگی کی راہ متعین ہو گئی، اس کا نصب العین اس کے سامنے آ گیا۔

۱۸۰۷ء میں جب فروبل ایک امیر کے بچوں کا اتالیق مقرر ہوا تو اس نے درس و تدریس کا سلسلہ منقطع کر دیا، وہ انہیں سوئٹزرلینڈ میں پستولزی کے مدرسے میں لے گیا اور دو سال تک وہیں قیام کیا، بچوں کی تکریم اور محبت میں وہ پستولزی کا ہم نوا تھا، تعلم بالعمل اور وجاہت کا در کا قائل تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے یردن (YVERDON) کے مبہم اور غیر واضح نظام تدریس پر کڑی نکتہ چینی بھی کی، کیوں کہ پستولزی کے پیروؤں میں مطابقت اور ہم آہنگی کا فقدان تھا۔

۱۸۱۳ء میں اس نے الحالوی سپاہ میں ملازمت کر لی، یہاں اسے ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملا جنھوں نے اسے اپنا استاد تصور کیا، یہی نوجوان بعد میں اس کے شاگرد بنے اور اس کی تعلیمی مہم میں اس کے شریک کار رہے۔

۱۸۱۶ء میں فروبل نے اپنا پہلا اسکول قائم کیا، اور اس وقت سے تا دم آخر (۱۸۵۲ء) اس کی زندگی کا مقصد پڑھانا، لکچر دینا اور لکھنا ہی رہا۔

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے فروبل فلسفی نہیں کہا جا سکتا، اس نے تو کبھی فلسفے کا باقاعدہ مطالعہ بھی نہیں کیا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا مزاج بھی ایسا فلسفیانہ نہیں تھا کہ وہ کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے سے پہلے اس کے خیر و شر کا ثبوت فراہم کرتا، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے ذہن میں کائنات کا واضح خاکہ تھا، اور وہ انتہائی جوش اور انہماک سے ان نظریات پر قائم رہا، اس کے دیرپا اثرات اس کی زندگی میں نمایاں رہے، اس کی تقریر میں سوز و گداز اور اس کے تصورات میں اس کی حرارت

نفوذ کر چکی تھی، اور اس چیز نے اسے اس مخصوص طریق تدریس کا عالمگیر پیش رو بنا دیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے اصول و ضوابط تھے جنہیں اس نے اس جوش و خروش سے کبھی افلاس و نکبت میں اور کبھی مایوس کن اور حوصلہ فزا حالات میں مرتب کیے، اور اپنی زندگی کے پورے پچاس برس اسی میں صرف کیے، اس کا بنیادی اور مرکزی خیال یہ تھا کہ انسانی وجود اس کائنات کا ضروری جُزو ہے، اسے اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، اور یہی انسان خالق کائنات کی روح کا حقیقی مظہر ہے، اور ایک قدرتی اتحاد اس دنیا کے مختلف حصوں کو ایک مربوط رشتے میں باندھ دیتا ہے ـــ سیارے، پہاڑ، سمندر، چشمے، حیوانات، نباتات، انسان اور اس کے کاروبار سب ایک دوسرے سے متعلق اور وابستہ ہیں، ان میں سے ہر ایک، کائناتی قانون کے تابع ہے اور یہ سب ایک دوسرے میں اپنے اثرات کو نفوذ کرتے رہتے ہیں، ارتقائی منازل طے کرتے رہتے ہیں لیکن فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ نہیں، ان سب کا ایک دوسرے پر کلی انحصار ہے، ان میں انسان خود آگاہ بھی ہے اور نقطۂ اوج پر فائز بھی، جو شخص انسان کو تکلیف پہونچاتا ہے دراصل خدا کو تکلیف پہونچاتا ہے، چناں چہ اگر مقصد انسانی زندگی کو تباہ کرنا ہے تو اسے کسی ایسی تعلیم میں لپیٹا جا سکتا ہے جو بچوں کے فطری پھیلاؤ اور اس کی فطری صلاحیتوں کی ترقی میں مانع آسکے، بچہ بڑھتا ہے اور ترقی کرتا ہے، جب وہ خارجی اثرات کو قبول کر لیتا ہے یعنی اپنے گرد و پیش کے حالات و عواقب کی پیچیدگیوں کو سمجھ کر اسے اپنا لیتا ہے اور پھر اپنے پوشیدہ جبلی میلانات کو واضح کرتا ہے ۔ ان تمام وسائل اور ذرائع سے جو انسانی افکار و خیالات میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں مثلاً طبعی اشیاء کا استعمال، ضروریات کی پیداوار، موسیقی و مصوری فن تعمیر و ادب وغیرہ۔

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ بخشا ہے، اگر وہ برائی کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کی وجہ غلط رجحانات یا متبذل ماحول ہے اس سے اس کی صلاحیتوں کے پھول پر اوس پڑ جاتی ہے، شروع سے ہی اس کے گرد و پیش لطف و مہربانی، افہام و تفہیم اور حسن و آرائش کی جلوہ گری ہو تو اسے برائی سے روکا جا سکتا ہے، ماہرین تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ابتدائے کار سے ہی بچوں کی تعلیم و تربیت سے اپنی وابستگی کا اظہار کریں اور بہر صورت ماؤں کی امداد کریں، ماں کی محبت، اس کا دکھ رکھاؤ اور اس کی نگہداشت،

دنیا میں بچہ سب سے پہلے اسی سے تو متعارف ہوتا ہے، اور اسی کے زیر اثر وہ اپنی ضروریات کو سمجھتا ہے، ماؤں
کے لئے چھوٹے چھوٹے گانوں کے کھیلوں کا مجموعہ مرتب ہو چکا ہے، اسے وہ اپنے ان ننھے منے پاؤں پاؤں چلنے
کی کوشش کرنے والوں کی خوش نودی اور اصلاح کے لئے استعمال کر سکتی ہے، ان میں انگلیوں کے کھیل۔
چڑیوں اور جانوروں کے مختصر گانے، بچوں کے گرد وپیش عمومی طور پر مختلف کھیلنے والی چیزوں کو پھیلانا۔
غرض اس میں سبھی کچھ شامل ہے، ان میں سے ہر ایک کی تشریح ایک تصویر کے ذریعہ کی گئی ہے، اس
کتاب کی تحریر میں انیسویں صدی کی جاذبیت موجود ہے، اس کی ناصحانہ، معلمانہ اور علاماتی قدریں تو آج بھی
ختم نہیں ہوئیں۔

فروبل کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیمی نظریات میں بچے کے لئے ایک مخصوص مقام پیدا کر دیا
اور اس امر پر اصرار کیا کہ بچہ کھیلوں کے ذریعہ بہت کچھ سیکھ سکتا ہے، فروبل پہلا شخص ہے جس نے اس واضح
اور متعین حقیقت کی تشریح کی، اور یہ تشریحات تمام تر بچے کے مشاہدے پر موقوف ہیں، اس نے محسوس کیا کہ
کھیل میں بچے کی ذہنی اور جسمانی قوتیں بیدار ہوتی ہیں، ہموار اور متوازن انداز میں ترقی کرتی ہیں۔ اور
جب وہ اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھ جاتا ہے اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو یہ ہم آہنگی
اور مطابقت اور بڑھ جاتی ہے، فروبل مدتوں اس کوشش میں رہا کہ وہ اس نئے ادارے کا نام کیا رکھے، یہ
ادارہ نہ تو مدرسہ تھا اور نہ گھر، یہاں تو چھوٹے چھوٹے بچے اطمینان وسکون کے ساتھ بلکہ انتہائی انہماک کے ساتھ
ایک سوچی سمجھی فضا میں جہاں امن وآشتی اور محبت کا دور دورہ ہے کھیلتے ہیں اپنی صلاحیتوں کو
بروئے کار لاتے ہیں اور اس طرح بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں، آخر انتہائی کاوش کے بعد اسے ایک نام مل گیا۔
یعنی باغ ـــــ اور اس طرح کنڈر گارٹن (بچوں کا باغ) کا لفظ پیدا ہوا۔

لیکن اچھے یا بُرے ـ فروبل نے صرف اصول ہی پیدا نہیں کئے ـ ان سب کے طریق کار بھی اسی کی ذہنی
تخلیق ہیں، انسان نظام کائنات کا ضروری جزو ہے، اس لئے اسے کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے
کچھ ایسے آلات وادوات (اپلائنس) بنائے گئے جن کی علاماتی اہمیت مسلم ہے، ان کی مدد سے بچہ بتدریج
بڑھتا ہے اور اپنے گرد وپیش کو سمجھنے میں مصروف ہو جاتا ہے، فی الحقیقت یہ آلات چھوٹے چھوٹے

صندوقوں میں چھ چھ تحفوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کا مختصر سا بیان فروبل کی ذہنی کیفیات کو واضح کریگا
پہلے تحفے میں اونی کپڑے کی بنی ہوئی چھ چھوٹی چھوٹی گیند ہوتی ہیں جن میں تین کا رنگ اصلی اور تین کا ثانوی
ہوتا ہے اور جو نظری اہمیت ان گیندوں کے ذریعہ مرتب ہوتی ہے اس پر ہمیں یقین کرنا چاہیئے، یہ تحفے پورے
نظام کائنات کو، دنیا، اتحاد و وحدت، تکمیل، حرکت اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان سے
بچے رنگوں کا امتیاز سیکھتے ہیں، معلم کی ہدایت کے مطابق وہ انہیں لڑھکا بھی سکتے ہیں، انہیں ہوا میں
پھینک سکتے ہیں، یا جب یہ کھیل ختم ہوجائے تو اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں کھیل کی
اسپرٹ کا جو تقاضہ ہو اور ان میں جیسا جوش اور ولولہ پیدا ہوسکے۔ یہ سب کائناتی اور کھیلنے کے اہم آلات ہیں۔

دوسرا تحفہ بھی ایک صندوق پر مشتمل ہوتا ہے جس میں لکڑی کی ایک گیند، ایک سلنڈر اور ایک
مکعب ہوتا ہے، گیند سے مراد حرکت ہوتی ہے، مکعب میں استحکام اور سلنڈر میں دونوں کے خواص مجتمع
ہوتے ہیں، اسے لڑھکا بھی سکتے ہیں اور ایک سرے پر کھڑا بھی کرسکتے ہیں، اور ان سب کو چھوٹی چھوٹی
رسیوں میں باندھ بھی سکتے ہیں، اور جب یہ حرکت میں آتے ہیں تو ریاضی کے دوسرے ٹھوس کی شکل بنتی
معلوم ہوتی ہے، دوسرے تحفے میں مختلف شکلوں کے مستطیل نما ٹھوس ہوتے ہیں، اور ان سے بچے کو اس
نت متعارف کیا جاسکتا ہے جب اس میں ریاضی کے اولاصولوں کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے
ے وہ اینٹ بنانے میں استعمال کرسکتا ہے، شروع میں براہ راست معلم کی نگرانی میں یا بعد میں جس طرح
س کا مزاج چاہے۔

فروبل کے آلات و ادوات (اپریٹس) کا دوسرا حصہ مشغلہ (OCCUPATION) ہے، اس میں
مختلف قسم کے سامانوں کی علیحدہ علیحدہ ترتیب ہوتی ہے، اور ان سب کا الگ الگ جوڑ ہوتا ہے، اور اس میں
چھوٹی چھوٹی ٹکیاں، چھڑیاں، لکڑی کی پٹیاں، دھاگے، کاغذ، دھاریاں۔ گتے، لکڑی، کارک، رنگ
مٹی، ریت، تسبیح کے دانے وغیرہ ہوتے ہیں، زیر تربیت بچوں کو ان سب کا صحیح استعمال واضح اور مشرح
طور پر سکھایا جاتا ہے، اگر اس کی کتاب تشریحات کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خود فروبل کو علم الہندسہ
سے بہت زیادہ شغف تھا، اس کے اپنے معتقدات کے مطابق معلم کا فرض ہے کہ وہ فطرت کے پا فیبا

حسن کو آشکارا کرے

لیکن اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کہ یہی تحفے اور مشغلے ہی اس کی تعلیمات کا سرمایہ ہیں، کنڈرگارٹن طریق تدریس کے لئے فی الواقع باغ کا ہونا ضروری ہے اور مطالعۂ قدرت، حیوانات، اور نباتات سے زندہ رابطہ پیدا کرنا، موسمی کیفیات اور زبان بچے کی تربیت کے اہم اجزاء ہیں، موسیقی کو بھی اس نظام تعلیم میں وسیع درجہ دیا جاتا ہے اور ڈرائنگ کے ابتدائی اسباق میں بچے جو سطریں کھینچتے ہیں وہ بھی کم اہم نہیں ہوتیں، اور انہیں چھڑیوں، کاغذوں، دھاگوں اور پٹیوں کے ذریعہ آرٹ پیدا کیا جاتا ہے کنڈرگارٹن کے جملہ مشاغل بچے کی مسلسل ترقی کے ابتدائی مدارج کہے جا سکتے ہیں اور اسکول کے معمولی مضامین کے ذریعہ آگے چل کر سائنس فلسفہ اور آرٹ کی تعلیم میں منتہی ہو سکتے ہیں۔

آج اس سیدھے سادے ساز و سامان، اس کی رسمی پابندیوں اور اس کے استعمال پر ہنسنا آسان ہے بالخصوص اس کی علاماتی اہمیت کے بوجھ پر جو دو سالہ بچے کی گیند پر پڑتا رہتا ہے، یا آرٹ پر جو علم الہندسہ کی تشریح سمجھا جاتا ہے، فروبل کی تعلیم ان لوگوں کے لئے کشف و کرامات کا درجہ رکھتی ہے جنہیں فی الواقع بچوں کی بھلائی اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال ہے، لیکن ان کے پیش نظر تعلیم ابھی تک اداس اور تیرہ و تار ماحول میں سخت محنت کا کام تھا، اور اس کا سب سے بڑا مقصد چند رسمی اطلاعات بہم پہونچانا تھا، اور سزا ہوا کے لئے مہمیز کا کام دیتی تھی۔

فروبل نے بہت کچھ لکھا اور بے شمار لکچر دیئے، اور اس کے محنت شعار اور پرجوش رفقائے کار نے بھی اس نظریۂ تعلیم کے پھیلانے میں کافی ہمت سے کام لیا، اس کی اپنی زندگی میں بہت سے کنڈرگارٹن مدارس کھولے جا چکے تھے اور یہ تحریک اچھی خاصی رفتار سے شاہراہ ترقی پر گامزن نظر آنے لگی تھی، لیکن فروبل کے مخالفوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی، حالاں کہ اس کے تعلیمی نظریات کی بنیاد تمام تر مذہبی تھی اور زندگی کا جو نصب العین اس نے پیش کیا اس کی اساس بھی مذہبی تھی، پھر بھی اس پر لادینی کا الزام لگایا گیا، بہر صورت وہ بھی کچھ عجیب و غریب طبیعت کا مالک تھا، اب اس کے پرجوش مبلغین کی جماعت پر رجعت پسند عناصر کی انگلیاں اٹھنے لگیں۔ امراء اکابر کی بارگاہوں میں اس کی کھلی ہوئی مخالفت شروع ہو گئی، اور ۱۸۴۸ء کی لبرل

ریک کے دبانے کے سلسلے میں تمام پرشن کنڈرگارٹن اسکول بند کر دیئے گئے۔

جرمنی میں فروبل کے ان نظریات کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے ممالک میں انہیں نظریات نے
دغ پایا، بہت سے آزاد خیال تارکین وطن انگلستان بھی آئے اور ۱۸۵۱ء میں ہی الماتوی نمونے کے کنڈرگارٹن
برس اس ملک میں قائم ہو گئے۔ بیرنس وان میرن ہولز بولو (BARONESS VON MARENHOLTZ BULOW)
ربل کے نظریات کا سب سے زیادہ پرجوش پروپیگنڈا کرنے والی تھی، اس نے ۱۸۵۴ء میں انگلستان میں تقریریں کیں
ن کی باتوں کا اثر ہوا اور لوگ اس کی حمایت کے لئے آمادہ ہو گئے، اس طریق تدریس کے مرتب کرنے والوں کا
سب سے اہم مقصد زندگی کے مختلف مدارج میں تعلیم دینا تھا چوں کہ اس تحریک اصلاح میں ایک تعمیری
روح کارفرما تھی، اور اس کے طریق تدریس کی تفصیل پہلے ہی مرتب کر لی گئی تھی، اس لئے اسے بہت آسانی
سے اپنایا جا سکا، چارلس ڈکنس کو اس تحریک سے دلچسپی تھی، اس نے اس سلسلے میں "ہاؤس ہولڈ" میں
ایک طویل مضمون لکھا، اس مضمون کی اشاعت سے اس مقصد کے حصول میں بڑی کامیابی ہوئی۔

رفتہ رفتہ انگلستان میں کنڈرگارٹن مدارس قائم ہونے شروع ہو گئے، اور اساتذہ کی تربیت کے لئے
چھوٹے چھوٹے تربیتی ادارے کھلنے لگے ۱۸۷۴ء میں دو قومی انجمنیں ممتاز مربیوں کے زیر اہتمام قائم ہوئیں۔
فروبل سوسائٹی (FROEBEL SOCIETY) اور نیشنل فروبل یونین (NATIONAL FROEBEL UNION)
موخر الذکر ایک امتحانی ادارہ تھا جو فروبل ٹیچرز سرٹیفکیٹ دیتا تھا، انیسویں صدی کے ربع آخر میں فروبل
ٹریننگ کالج قائم ہوئے۔

ابھی یہ تحریک اعلیٰ اور متوسط طبقے میں محدود تھی، پوری قوم میں اس تحریک کو پھیلانا اتنا آسان نہیں
تھا، اس کے لئے مال و زر اور ہمت دونوں کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ اگر پروپگنڈا کرنے والوں کی سماجی حیثیت
بھی مسلم ہو تو لوگوں کی توجہات کو مبذول کرنا آسان ہو جاتا ہے، اس عہد کے بہت سے دولت مند حضرات
کے دل میں تعلیم کو فروغ دینے کا جذبہ موجود تھا، اپنے بچوں کے لئے بھی اور پوری قوم کے بچوں کے لئے بھی
وہ اس تحریک میں حصہ لینے کے لئے وقت اور دولت دونوں کی قربانی کے لئے آمادہ تھے، فروبل مدارس کے
قیام میں تاخیر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس طریق تدریس کے لئے تربیت اساتذہ اور کھلی ہوئی جگہ

اور تدریسی لوازمات کی ضرورت تھی، ان سب کا اس وقت آسانی سے فراہم ہونا مشکل تھا، انگلستان کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ ہے جب حکومت تعلیم پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی تعلیم ہو خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی ہو، اس کے پاس ایسے وسائل اور ذرائع نہیں تھے جو اس طریقِ تدریس کے رواج دینے میں ممد ثابت ہوتے، اس زمانے میں اس کے اہتمام میں اچھی خاصی لاگت آتی تھی، لیکن بورڈ آف ایجوکیشن کی رپورٹ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بہت سے انسپکٹر اس تحریک سے متاثر ہوئے اور فروبل سوسائٹی نے بہت جلد ان مدارس میں تقریروں اور اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا، مزید براں جو اساتذہ فروبل کالج میں تربیت حاصل کر لیتے وہ دوسرے تربیتی اداروں میں ملازم ہو جاتے اور اپنے طلبہ کے ذریعے ملک کے عام مدرسوں کو متاثر کرتے رہتے۔

اس وقت یہ ممکن نہیں کہ اس تحریک کی پوری تاریخ لکھی جائے، یہاں تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ فروبل کے نظریات کا اس کی موت کے ایک سو سال بعد کیا حشر ہوا، یہ حقیقت ہے کہ اس کے بنیادی اصول آج بھی اتنے ہی اہم ہیں اور انہوں نے اپنی معقولیت کو آج بھی نہیں کھویا۔ بلکہ اگر ہم مجموعی طور پر اپنے مدرسوں کا جائزہ لیں تو موجودہ صورت حال میں ان کا قدم آگے ہی بڑھ رہا ہے بعض مدارس کو ابھی اپنی تعلیمی دوڑ میں بہت آگے جانا ہے اور جب تک وہ ترقی کے ان مراحل کو طے نہیں کر لیتے ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے بچے اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کچھ سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور آزادانہ طور پر اپنے ساتھیوں سے تعاون کر کے ان مشاغل میں حصہ لے رہے ہیں جو انہیں اچھے اور قیمتی معلوم ہوتے ہیں، یا خود ہی ایک حقیقی دنیا کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں اور الفاظ کے گورکھ دھندوں سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں، فروبل کے اپنے اسکول کا ماحول دیہاتی تھا، اس نے جسمانی تعلیم کو دیہی مشغلہ قرار دیا، اس میں ٹہلنا، چڑھنا اور کھیت میں کام کرنا سب شامل ہیں اور یقیناً جنگلوں کے کھیلوں کو، فوجی دستے کے چال اور دوسرے چست رکھنے والے سارے ساز و سامان کو جسے ہم آج مہیا کر رہے ہیں منظور کر لیتا اور اسے اپنے تعلیمی نظریات میں ایک اہم مقام دیتا۔ مگر ابھی وقت اور زمانہ سازگار نہیں تھا۔

حالاں کہ فروبل تعلیمی تقسیم کا قائل نہیں تھا، اس کے اپنے نقطۂ نگاہ میں پیدائش سے لیکر بلوغت
تعلیم کا مسلسل اور مربوط ہونا ضروری ہے، پھر بھی بعض حضرات اس طریق تدریس کو صرف سات سال سے
کم عمر بچوں کی تعلیم و تربیت ہی سے متعلق سمجھتے ہیں، اس کی وجہ محض یہی ہو سکتی ہے کہ فروبل نے لوگوں کی
توجہات کو چھوٹے بچوں کی طرف مبذول کرایا. کیوں کہ اس سے پہلے تو بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ زیر بحث
آیا ہی نہیں تھا، اور تعلیمی نظام میں بچوں کو اپنی توجہات کا مرکز بنانے کا تصور بھی کسی ذہن میں موجود نہیں
تھا، جرمنی اور یورپ کے دوسرے ممالک میں کنڈرگارٹن مدارس ادارہ ماقبل مدرسہ شمار کیے جاتے ہیں
اس ملک میں کنڈرگارٹن مکمل مدرسے مفقود ہوئے اور بچوں کے ان مدرسوں میں کنڈرگارٹن طریق تعلیم
بھی استعمال کیے جانے لگے، جہاں لازمی ابتدائی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع ہو جاتی ہے، فروبل سوسائٹی
کے کسی پہلے اجتماع میں اس مسئلے پر بحث ہو چکی ہے کہ فروبل کے طریق تعلیم کو جونیر اسکول میں بھی شروع کیا جا
سکتا ہے یا نہیں، اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ اس صورت میں بہت سی نمایاں تبدیلیاں کرنی پڑیں گی
اسی زمانے سے فروبل سوسائٹی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جونیر اسکول کے بچوں سے بھی دلچسپی لینے لگی۔

فروبل کے طریق تعلیم کی تاریخ سو سال پرانی ہو چکی ہے، اس طویل عرصے میں خیالات و نظریات میں بہت
بڑا انقلاب آچکا ہے، ماہرین تعلیم اور ماہرین نفسیات کے نئے تجربے اور ان کے نئے طریقوں نے فروبل کی
حیثیت کو بھی بدلا، یہ تحریک اب اپنی منزل سے ہٹ چکی ہے، اتنی لمبی چوڑی تحریک میں مختلف خیالات اور
مختلف عقائد کا داخل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ نئے معتقدات اور نئے اصولوں کے قبول اور عدم قبول
کا مسئلہ خیالات و عقائد کی شدت پر مبنی ہے، تحلیل نفسی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ بچے پھول کی طرح مکمل پیدا نہیں
ہوتے، بچے اگر ذہین اور فہیم و بصیر ہیں اور اچھی خاصی رفتار سے ترقی کر رہے ہیں تو ہمیں تو انہیں دیدہ زیب
پھولوں کی طرح محفوظ رکھنا چاہیے، انسانی مزاج میں غیظ و خوف تو آغاز کار سے مستولی ہوتا ہے اور یہ تو انسانی
لوازم حیات کے ضروری اجزاء ہیں، معلم کا کام یہ ہے کہ وہ ان دونوں جبلی میلانات کی تعدیل میں بچوں کی
امداد کرے، اس کی زندگی کو زیادہ خوشگوار بنانے کی اور اس کے تعمیری پہلو کو ترقی دینے کی کوشش کرے
اس پورے مبحث میں ابھی تک کھیل کا ذکر نہیں آیا، بچوں کی زندگی میں کھیل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بچے صرف ذوق و شوق کے ساتھ کھیل میں مہارت حاصل نہیں کرتے، واقفیت عامہ سے ہی بہرہ اندوز نہیں ہوتے اور اپنے جذبات کی تعدیل و تنظیم میں ہی مصروف نہیں ہوتے۔ اس سے ہمیں ان کے حقیقی مسائل کا علم ہوتا ہے۔

تعلیمی طریق کار میں فروبل کی تعلیم کے دو حصے کئے جا سکتے ہیں۔ انسانی تعلیم کا پہلا حصہ، جو گھریلو تعلیم سے بحث کرتا ہے، فروبل کی باریک بینی اور اس کے تفحص کا آئینہ دار ہے۔ جو لوگ تعلم بالعمل سے بخوبی واقف نہیں ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ اس کی تصنیف کے اس حصے کو پڑھیں۔ فروبل نے نقل و حرکت کی آزادی، دنیا سے حقیقی روابط قائم رکھنے، سماج اور ماحول کے مطالعے، موسیقی، تخلیقی آرٹ وغیرہ کے متعلق جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں اثر اور جاذبیت ہے، دل ہے کہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ ان خیالات کے پیش نظر ہم آج ایک نیا ماحول اور ایک نئی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور اس سلسلے میں مصروف کار نظر آتے ہیں، اور رسمی مشغلوں کو مدرسے سے گھر تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ آج یہی ہمارے مدارس کے بنیادی اصول ہیں۔

لیکن فروبل کی تعلیم کا دوسرا حصہ جس میں تحفے اور مشغلے کی تفصیلات مندرج ہیں اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ طریق تدریس کچھ زیادہ موزوں نہیں رہا کہ پہلے بچے کو معمولی اور سادی چیزوں کے حصے دکھائے جائیں اور پھر انہیں کی مدد سے انہیں زیادہ پیچیدہ اور مکمل کل کی حیثیت میں پیش کیا جائے۔ نئے تجربات بالعموم مکمل مگر پیچیدہ تشکل میں صورت پذیر ہوتے ہیں، جیسے انسان جسمانی اور ذہنی طور پر بیک دستی اور ہوشیاری سے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ میرین رچرڈسن کے طریق تحریر کا نفسیاتی پہلو ہے جو ٹیڑھے شوشے (POT HOOK) کے نام سے موسوم ہے۔ اس لئے بعض مشاغل کو ترتیبی نظام سے خارج کر دیا گیا ہے، اور محض اس ساز و سامان کو قابل استعمال سمجھا گیا جس میں تخلیقی وسعت موجود ہے، مثلاً گیلی مٹی، ریت، اور رنگ وغیرہ۔ اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ فروبل کے تحفے اور مشغلے کی ہر چیز بری تھی، فرینک لائڈ رائٹ نے اپنی خودنوشتہ سوانح حیات میں لکھا ہے کہ "ایام طفولیت میں فروبل کے ان تحفوں میں مجھے بہت زیادہ راحت ملتی تھی، مجھے ان میں یک گونہ سکون میسر ہوتا تھا" اور یہ محض خیال اور وہم نہیں، امریکہ کی بہت سی خوبصورت عمارتوں کے پتھروں، کنگروں اور سطح ہمواروں میں فروبل کے پانچویں تحفے کے اثرات کا عکس نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ فروبل کے عہد سے دوسری نظری ترقی جس سے ہمیں بچے کے سمجھنے میں مدد ملی ہے انفرادی اختلافات
نفسیات ہے۔ اب ہمیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ بچے میں ایک نہیں بیسیوں پیدائشی اختلافات ہوتے ہیں، ان کی
نوع جدا جدا ہوتی ہیں، اور ان کے فطری میلانات کے دھارے الگ الگ بہتے نظر آتے ہیں۔ فروبل نے چھوٹے
بچوں کے لئے بہت سی چیزیں وضع کیں خوابی مسرت، شہرت اور خواب ۔۔۔ یہ سب فروبل کے لئے زندہ حقیقتیں
تھیں جنہوں نے زندگی کی قدر و قیمت کو اور بڑھا دیا، فروبل کے لئے دنیائے طبیعات وریاضی اس شہرت و امتیاز
کی حامل تھی اس کی علامتیں اسی طرف اشارہ کرتی تھیں اور اس کی ہدایت اس کی تفہیم کی طرف رہنمائی
کرتی تھیں، اس نے یہ محسوس نہیں کیا کہ معمولی شہریوں کے لئے اس کا سمجھنا دشوار ہے، ان کی نگاہیں اتنی
گہری اور متنوع نہیں ہوتیں محض چلتی پھرتی باتوں پر ان کی توجہات مرکوز ہو سکتی ہیں، اس طرح یہ
حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے نظام کو فروبل کے نظریات سے زیادہ لچک دار ہونا چاہیئے تاکہ
انفرادی طور پر ہر بچہ تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے اور اس سے کچھ استفادہ بھی کر سکے۔

یہ ساری باتیں ایک مرتبہ پھر ہمیں فروبل کے اس مسلک سے قریب تر کر دیتی ہیں کہ ہمیں بچے کے
جوش و خروش اور اس کی ذاتی صلاحیتوں کو ہر ممکن انداز میں استعمال کرنا چاہیئے، اور یہ مدرس کا کام ہے
کہ وہ بچے کو ہر قسم کے ذہنی مواقع بہم پہونچائے، جماعتی اسباق کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔
اس کے باوجود اگر حالات بہتر نہ ہوں تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا کام تو مواقع فراہم کرنا ہے اور بچے کی
پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنا۔ انہیں اپنی راہ خود متعین کرنی چاہیئے، کوتاہ دستی میں ہمیشہ محرومی ہوتی ہے۔

یہ مخصوص نظریہ خالص انگریزی اور امریکی ہے یعنی لوگوں کو اس انداز میں تربیت دینی چاہیئے
کہ وہ خود سوچیں اور آسانی سے ہر چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، ردّ و کد کر کے حقائق کو معلوم
کرنا سیکھیں، کتاب کا مطالعہ اتنا مفید نہیں ہوتا۔ اس علم پر گہری نظر کا ہونا ضروری ہے، صحیح علم اور تعلیم
بیش قیمت ہوتی ہے، اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے، جمہوری شہریت کے حقوق سے مراد مثلاً نرم
سماجی خدمات بھی ہوتی ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ لوگ تعلیم یافتہ، گھر میں اور مدرسے میں اپنی اہمیت
کو سمجھتے ہوں، اسی سے احساس ذمہ داری اور تعاون پیدا ہوتا ہے۔

تعلیمِ بالغان

مفتی محمد اقبال

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے جب کبھی غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنے کے لئے جدوجہد کی گئی تو جو حربہ اس امر کی تکمیل کے لئے منتخب ہوا وہ بالغوں کو خواندہ بنانے کی تحریک تھی۔ یہ امر دیگر بات ہے کہ یہ تحریک قلیل عرصے میں ہی ناکامی کا شکار ہو کر رہ گئی، اور جس طرح ٹوٹی ہوئی طنابیں اور بکھری ہوئی راکھ کسی قافلے کے کوچ کی غمازی کرتی ہے، اسی طرح بالغوں کی کتب اور نوشت و خواند کا سامان خواندگی کی مہم کی ناکامی کا مظہر ہیں لیکن یہ ناقابلِ انکار حقیقت باقی رہتی ہے۔ اس مہم کو قومی ترقی کے ساتھ کچھ نسبت ضرور

پاکستان بن جانے کے بعد جب نصابِ تعلیم تبدیل ہوا، جب لوگوں کو بدلے ہوئے حالات اور آزاد فضا میں کام کرنے کے لئے ہوش و خرد کو درست کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا، جب دینیات کو مدارس میں نصاب کا لازمی جزو قرار دیکر لوگوں کو دین کی طرف مائل کیا گیا کہ وہ اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو کر ترقی ا جدوجہد کی تگ و تاز میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں تو بالغوں کی خواندگی کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے بھی مناسب اقدام کیا گیا، بالغوں کی تعلیم کے لئے جا بجا مدارس کھولے گئے، نوشت و خواند کا ضروری سامان کیا گیا لیکن تھوڑے عرصہ میں ہی وہ مدارس روبہ انحطاط نظر آئے اور سال کے خاتمہ سے پہلے حکومت کو ا سے اکثر کو بند کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا، لیکن اس ناکامی کے باوجود اب بھی پاکستان کی ت اور خوشحال کے اسباب پر تدبر کرتے وقت خواندگی کی مہم پر توجہ مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔

جب یہ تحریک ایسی اہم ہے کہ اس سے کسی صورت میں گریز ممکن نہیں اور جو سابقہ ناکامیوں ا باوجود قومی ترقی کی ایک نمایاں کڑی ہے تو آئیے آج ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ یہ تحریک کیوں نا کا

دی۔ کیا اس کی کامیابی کی کوئی صورت موجود بھی ہے یا یہ ہمارے لئے ایک عقدۂ لاینحل بنی رہے گی۔

انگریزی عہد میں بالغوں کی تعلیم کے سلسلہ میں جو کام کیا جاتا وہ نمود و نمائش میں اس طرح ڈوبا ہوا
ہوتا تھا کہ غلط بینی اور فرض کاری کے سوائے کچھ حاصل نہ ہوتا چھ روپے ماہوار قلیل الاؤنس پر جب پہلی با
مدرسین کو رات کے وقت بالغوں کو تعلیم دینے کا کام سپرد ہوا تو چند ماہ میں ہی یہ مدارس سراپا فرض کاری
ین کر رہ گئے۔ تعلیم بالغاں کی یوں ابتدا ہوئی جو خشت اول چوں نہد معمار کج کے مطابق تا ثریا کج کی کج
چلی گئی۔ اگرچہ قلیل الاؤنس کی جگہ پوری تنخواہ نے لے لی اور رات کی سیاہی سپیدۂ سحر میں تبدیل ہوگئی لیکن
فرض کاری اور زیادہ روشن اور نمایاں ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وزرا اور بالغوں کی خواندگی کی تحریک کے قائدین
دورے پر جاتے تو نیم خواندہ۔ خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کا جم غفیر ان کی پیشوائی کے لئے جگہ جگہ جمع کردیا
جاتا اور وہ اپنی تحریک کی کامیابی پر مسرور و شاداں واپس لوٹتے لیکن یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہوئی کہ
جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض تماشہ ہی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب بالغوں کی خواندگی کی مہم کو اور تیز کیا گیا اور تمام محکموں کے افسران کی وساطت
سے ہر ملازم سے اپیل کی گئی کہ وہ اس میں پوری مدد کرے تو نتیجہ بدستور غیر اطمینان بخش ظاہر ہوا، اور
جیسا کہ ابتدائی سطور میں مرقوم ہے۔ بالغوں کے یہ مدارس بتدریج بند ہوتے گئے، اخبارات میں خوب چرچا
ہوا کہ حکومت ان مدارس کے قیام پر جو روپیہ خرچ کر رہی ہے وہ ضائع ہو رہا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر مدارس
ایک سال کے بعد بند کر دیئے گئے، لیکن جو باقی ہیں وہ بھی چراغِ سحری کی طرح ٹمٹماتے نظر آتے ہیں بلکہ
بعض کی حالت تو ایسی ہے - ع

کب ٹوٹ کے رہ جائے یہ ساز نہیں معلوم

ان مراکز کی ناکامی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) عوام کا جمود اور تعلیم بالغاں میں دلچسپی کا فقدان۔
(۲) بالغوں کی تعلیم کے لئے موزوں مدرسین کا قحط۔
(۳) بالغوں کے لئے موزوں کتب کی کمی۔

۴ ۔ مراکز کھولتے وقت غلط جگہوں کا انتخاب ۔

۵ ۔ بالغوں کا کسی مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پر جمع نہ ہونا۔

۶ ۔ بالغوں کی نفسیات سے مدرسین کی بے خبری اور بالغوں کی تعلیم کے متعلق نا تجربہ کاری ۔

لیکن یہ اسباب ایسے ہیں جن پر مراکز کھولنے سے پہلے پورے تدبر سے غور کر لیا گیا تھا، چناں چہ حتی الامکان مدرسین کے انتخاب میں اسی امر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا کہ جو مدرسین بھی منتخب ہوں وہ پوری دلچسپی، کوشش، شوق اور محنت سے کام کریں نیز مراکز کے لئے بھی وہی جگہیں چنی گئیں جہاں مدرسین کا کافی اثر و رسوخ تھا اور وہ وثوق سے بالغوں کو مراکز کی طرف کھینچ لینے پر یقین رکھتے تھے تعلیم بالغاں کے لئے کتابیں بھی بڑے تدبر کے بعد تیار کی گئیں اور ان کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئیں، اگر ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ مراکز ناکامیاب ہوئے تو ظاہر ہے کہ ہمارے طریق کار میں کوئی خامی ضرور ہے جو ہماری کوششوں کے بار آور ہونے میں سدّ راہ ہے۔ آئیے ذرا اس خامی کو تلاش تو کریں ۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گبن ایک مشہور مؤرخ گذرا ہے، وہ ہندوستان پر عربوں کے حملے کی ناکامی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے عربوں کا حملہ ہندوستان پر ناکام تھا، اس لئے کہ یہ غلط طرف سے کیا گیا تھا، کم زرخیز حصوں کے راستے عرب ہندوستان میں داخل ہوئے اور کمک کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔" اگر تدبر کیا جائے تو تعلیم بالغاں کی مہم کی ناکامی کے بھی کم و بیش یہی تین اسباب متصور ہو سکتے ہیں، چنانچہ حملہ غلط طرف سے کیا گیا اس لئے کہ تمام توجہ مدرس پر مرکوز کی گئی کہ وہ اثر و رسوخ والا ہو، وہ صاحب ذوق ہو اور مہم کی کامیابی پر پورا یقین رکھتا ہو۔ اور اس طرح بالغ کو جس کے لئے یہ تمام کارروائی عمل میں لائی جارہی تھی بالکل نظر انداز کر دیا گیا، پھر دوسری وجہ ناکامی کی یہ ہوئی کہ یہ تحریک کم زرخیز حصوں پر آزمائی گئی، مراکز کھولتے وقت ہر طرف ایک بات کا خیال تھا اور وہ یہ کہ یہاں مدرس کا اثر و رسوخ کافی ہو۔ تاکہ وہ اپنے رسوخ سے بالغوں کو مراکز پر جمع کر سکے، اس بات کو کلیتہً فراموش کر دیا گیا ۔ کہ بالغوں کے جمع ہونے کے امکانات بھی ہیں

ہیں یا نہیں ہو یوں کے جملے کی ناکامی کی تیسری وجہ نمک کی کمی تھی، یہی وجہ یہاں بھی ناکامی کا باعث ہوئی اس لئے کہ جب مراکز کھول دیئے گئے تو محکمے نے ماسوائے نوشت و خواند کے کچھ سامان کے اور ایک آدھ معائنہ کے مدرس کو کوئی مدد نہیں پہونچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یکہ و تنہا ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتا ہوا تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اور بالآخر مرکز کے بند کرنے کے لئے رپورٹ داغ دی۔

ناکامی کے اسباب پر غور کرنے کے بعد ضروری ہے کہ ہم مدرس سے توجہ ہٹا کر اپنی تمام توجہات ناخواندہ بالغ پر مرکوز کریں اور اس طرح ایک نئے باب کا آغاز کریں۔ ناخواندہ بالغ کی اس محوری حیثیت کو قوی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ناخواندگی کو ایک مرض مزمن قرار دیتے ہوئے اسی کے لئے مناسب علاج تشخیص کریں، اور پرہیز سوچیں اور اس طرح اس مرض سے خلاصی پانے کے لئے تگ و دو کریں مدرس کی حیثیت ایک حکیم کی رہ جائے گی۔

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ اس وقت تک خواندگی کی مہم کے سلسلے میں ہماری معکوس ترقی واضح ہے، ہمیں انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس میں رکاؤ پیدا ہو جائے تاکہ ہم بتدریج صعود کر سکیں۔ شاید اسی طرح کچھ تلافی مافات ہو سکے۔

سب سے پہلی بات جو ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہے وہ بالغوں کو ایک مقام پر جمع کرنا ہے؟ پچھلے تجربوں کی بنا پر یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہم قسم کے بیرونی دباؤ بالغوں کو ہمارے اداروں کی طرف کھینچنے میں ناکام رہے ہیں، اس لئے اگر کوئی ایسا طریق کار معلوم ہو جائے جس سے ناخواندہ بالغوں کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ خود بخود ہمارے مراکز کی طرف چلے آئیں تو ہماری ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را، اس کے درست ہونے میں کسی کو کلام نہیں، اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ خوشی سے خوشی پیدا ہوتی ہے، اگر ہم کسی طریقے سے ناخواندہ بالغوں کے دلوں میں ایسی خوشی پیدا کر سکیں جس کے تاثر سے وہ اپنے گرد و پیش کی موجودہ مسموم اور ناسازگار فضا کو ایک بالکل مختلف نظریئے سے دیکھنے لگیں اور اس طرح ہماری کوششوں کو ناکام بنانے کی بجائے خود بخود

اپنی خوشی سے مراکز کی طرف رجوع کریں تو ہمارا مطلب آسانی سے حل ہو جائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا خوشی بالغوں کے دلوں میں کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ بالغوں کا موجودہ مدرس اپنے متنوع طریقہائے تعلیم۔ اپنے مذہبی تاثرات اور اثر آفرینی سے ان میں یہ مطلوبہ خوشی پیدا کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے، اس لئے سابقہ ناکامیوں کے پیش نظر بہتر یہی ہے کہ بالغوں کے مدرس سے قطع نظر ہم پرانے طریق کار کو خیرباد کہہ دیں۔

آیئے اب ذرا ہم اس مسئلہ پر موجودہ رنگ میں کچھ سوچیں، ہمارے سامنے ایک بالغ ہے جسے ہم جاہل۔ اجڈ اور ناخواندہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ روزمرہ کے طریق بود و ماند میں ہمارا ہم نوا اور ہم نگاہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ہم سے الگ تھلگ رہتا ہے، اس لئے کہ ناخواندگی کا مرض اسے ہمارے قریب آنے سے روکتا ہے اور سد راہ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا مطمع نظر بالغوں کی خواندگی محض نہیں ہے بلکہ ہمارا .... مقصود یہ ہے کہ ہم ناخواندہ بالغ کو اس قعر مذلت۔ احساس کہتری (کم تری) سے جس میں وہ گرا پڑا ہے دور ہٹا کر اپنی سطح پر کھینچ لیں تاکہ وہ قوم کی مشینری کا مفید پرزہ بن جائے، ہمارا نصب العین بالغ کو خواندہ بنانا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ احساس پیدا کرنا کہ اگر وہ اس بیماری سے نجات حاصل کر لے جس کو ناخواندگی کا روگ کہتے ہیں تو وہ ملک و ملت کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

جب نصب العین متعین ہو چکا ہے، تو آیئے ہم اور زیادہ تدبر اور سوچ بچار سے کام لے کر معلوم کریں کہ ناخواندہ بالغ کو کیوں کر ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔

ابتدا یوں کریں کہ ہم ناخواندہ بالغ کو اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ایک انسان ہے جو دکھ درد اور تکالیف میں مبتلا ہے، وہ ایک حاجت مند ہے جو ہماری توجہ کا طالب ہے، وہ ایک ایسا بیمار ہے جس کو ناخواندگی کا روگ ہے۔ اس روگ سے چھٹکارا دلانے کے لئے ڈاکٹر کی تشخیص کی ضرورت ہے، دوا، درکار اور کسی ایسے شخص کی خدمت ضروری ہے جو اس دکھ۔ درد اور بیماری میں اس کا مددگار بن کر اس کی تسکین خاطر اور دل جوئی کا باعث ہو۔ بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ وقت تک ناخواندہ بالغ کے لئے ایسا

یسر ہوتا رہا۔ اس کے پاس ایسے قیمتی نسخے موجود ہیں جو بالغ کی استطاعت سے کہیں بالاتر ہیں، یہی وجہ ہے برسہا برس کے دُکھ درد اور بیماری نے اس کو ڈاکٹروں سے اس درجہ متنفر اور بیزار کر دیا ہے کہ وہ ان کے علاج اور نسخوں سے ہمیشہ راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور اس طرح دور دور رہتا ہے۔ اسی تنفر، بیزاری اور فرار کا دوسرا نام جمود یا جہالت ہے۔

جب مرض کی تشخیص ہو چکی تو قیمتی نسخے کی جگہ کم قیمت نسخہ تلاش کرنا مشکل نہیں۔ اس سستے نسخے کے اجزا یہ ہیں .... ہمدردی .... اخوت .... اور مدد

جب ہم کسی ناخواندہ بالغ سے دوچار ہوں تو ہمیں سراپا ہمدردی بن جانا چاہیئے، اس کی بیماری یعنی ناخواندگی کے روگ کو اس نظریئے سے نہ دیکھیں کہ وہ ایک نہایت ہی بُری قسم کا چھوت والا روگ ہے جس سے ہمیں دور بھاگنا چاہیئے، بلکہ ہمیں احساس ہونا چاہیئے کہ تھوڑی سی توجہ تھوڑی سی ہمدردی اور تھوڑا سا ہمدردانہ برتاؤ مریض کے لئے اتنا مفید ہوگا کہ وہ مرض سے نجات پانے کے لئے اپنے میں قوتِ مدافعت محسوس کرے گا۔

پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہے تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، بلکہ اس سرزمین میں بسنے والی اقلیتیں بھی ہمارے بھائی ہیں، جو اخوت اور مودت کے مضبوط اور پائدار رشتہ میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں، یہ بات ڈنکے کی چوٹ تمام اطراف واکناف پاکستان میں مشتہر کی جانی چاہیئے کہ ہم سب بھائی ہیں اور بھائی ایک دوسرے کے دوست بھی ہوتے ہیں، مصیبت کے ساتھی اور دُکھ درد میں شریک۔ چناں چہ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

دوست بھائی نہیں دوست ہے تو بھی لیکن
بھائی اگر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اس اعلانِ عام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا ناخواندہ بالغ جو اس وقت تک قعرِ گمنامی میں پڑا احساسِ کمتری کا شکار ہے سنبھل جائے گا اور اپنے آپ میں نیا ولولہ پائے گا اور اس طرح وہ خود ناخواندگی روگ سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرے گا۔

مدد آخر میں آتی ہے، لیکن بالغوں کے لئے کونسی مدد درکار ہے؛ اور انگریزوں کے زمانے کی تلخ کلامی اور ترش روئی فی الفور ترک کی جائے، اور اس کی جگہ اخوت، محبت اور ہمدردی کو دی جائے، اس محبت اور مدد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے بالغوں میں ایک نئی روح اور نئی خوشی پیدا ہو جائے گی جو ان کو ہمارے قریب تر لانے کی ضامن ہو گی۔

ایک نہایت ہی تحقیر آمیز نظر ہے کہ بالغوں کو چھوٹے بچوں کی طرح چٹائیوں پر بٹھا کر الف۔ ب پڑھائی جائے۔ اور یہی خواندگی کی مہم کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہے، اس لئے کہ جس چیز کا انحصار تحقیر پر ہوگا، وہ یقیناً تحقیر پر ہی منتج ہو گی۔

اگر حاجت مند، دکھ، درد اور بیماری میں مبتلا بالغ ڈاکٹر تک جانے سے معذور ہے۔ تو حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ڈاکٹر کی فیس ادا کرے، اور اسے مریض کے پاس جانے کو کہے، ہر خواندہ مرد اور عورت ہر دورہ کرنے والے افسر کو اپنی اس نمائشی بلندی سے جو غلامی کے زمانے کی لعنت ہے نیچے اتر کر نہایت ہی قریب سے ان بیماروں کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جنہیں ہم ناخواندہ بالغوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور پھر محبت، خلوص اور ہمدردی سے ان کو بیماری سے نجات دلانی چاہیئے۔

گذشتہ سال جن سماجی مرکزوں کا تذکرہ اخبارات میں ہوتا رہا ہے، وہ امسال نہایت وسیع پیمانے جاری کئے جانے چاہئیں، تاکہ ناخواندہ بالغوں کو اکثر جگہ مواقع بہم پہونچائیں، وہ شکست اور ندامت کے تکیوں سے اپنے سروں کو بلند کر کے اردگرد کی پُرفضا اور پُرمحبت دنیا سے لطف اندوز ہوں۔ جب ناخواندہ بالغوں کو یہ احساس ہو جائے گا وہ اس کل کا ایک جزو ہیں جسے ناخواندگی کے روگ نے کل سے دُور رہنا رکھا تھا، تو وہ اپنے آپ میں مسرت اور خوشی کے وہ تاثرات پائیں گے جن کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے، اور اس طرح وہ اپنے گردوپیش کے ماحول کو خوشی سے بھرپور پائیں گے، اور اشیاء کو ان کے اصل رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہو جائے گی، اور یہی ہماری خواندگی کی مہم کا مقصد اولین و آخرین ہے، یہ وہ وقت ہوگا جب کہ ان کی درخواست پر ان کے لئے بالغوں کے مدارس جاری کئے جائیں، ایسے مدارس اور مراکز کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھیں گے۔

یونیسکو مشن برائے ابتدائی تعلیم کے لیڈر سے درخواست کی جائے کہ وہ خواندگی کی مہم کی ناکامی کے
ب کو جلد از جلد طشت از بام کریں۔ نیز ان مفید تجاویز کو بھی منظر عام پر لائیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم جہالت
ت اور بیکاری سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔
مندرجہ ذیل تجاویز اسی سلسلہ میں پیش کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔
علیم بالغاں کا عنوان تحریک ہذا کے لئے نہایت ہی محدود معنی رکھتا ہے، بہتر ہو کہ اس مفید ضروری
ور اصلاحی تحریک کا نام "فلاح بالغاں" رکھا جائے۔ تاکہ محکمہ تعلیم کے علاوہ باقی محکمے اور افراد بھی اس
یں مناسب حصہ لے سکیں۔
فلاح بالغاں کی تحریک کو فروغ دینا تمام محکموں اور ان کے جملہ افسروں کے فرائض میں داخل ہو۔
ور وہ سب اس کی توسیع و ترقی کے لئے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کریں۔
تمام کوآپریٹو سوسائٹیوں، انجمنوں۔ تھانوں، پنچایتوں، ہائی اسکولوں اور فیکٹریوں کو فلم اسٹرپ
پروجیکٹر مہیا کئے جائیں، جن کے لئے فلم اسٹرپ دیہاتی ماحول اور سمجھ بوجھ کے مطابق تیار کئے جائیں
اور ہر روز ان کو یہ فلم اسٹرپ دکھلائے جائیں، موجودہ وقت میں جو کام پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ
کی سینما لاریاں سر انجام دے رہی ہیں وہ چنداں سود مند نہیں، جو فلمیں دکھلائی جا رہی ہیں وہ دیہاتیوں
کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں اور سوائے نقل ڈیولپمنٹ کی چند ریلوں کے ان کے لئے ان میں کسی قسم
کی کوئی دلچسپی نہیں۔
- ہر کوآپریٹیو سوسائٹی، انجمن، ہائی اسکول، سنٹرل اسکول، تھانے اور فیکٹری میں ریڈیو سیٹ مہیا کئے
جائیں، جو خواہ حکومت مہیا کرے، خواہ مخیر حضرات، تاکہ شام کے وقت ان پڑھ اور ناخواندہ بالغ ایک طے شدہ
پروگرام کو سن سکیں، یہ پروگرام ریڈیو کے محکمہ کو خاص طور پر تیار کرنے کی ہدایت کی جائے، موجودہ دیہاتی
پروگرام اس ضرورت کو بالکل پورا نہیں کرتا، ریڈیو پروگرام سننے کے لئے ایک ہی قسم کے بنچ مہیا کئے جائیں
تاکہ جو لوگ پروگرام سننے کے لئے آئیں وہ یہ محسوس کریں کہ خواندہ یا ناخواندہ سب مساوی ہیں اور اس طرح
آدمیت احترام آدمیت کے صحیح معنوں سے آگاہی حاصل کریں۔

۵۔ تمام عدالتوں، تھانوں، تحصیلوں میں بالخصوص اور دوسرے محکموں میں بالعموم اس بات کا اعلان کیا جائے کہ ناخواندہ لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی یا ترش روئی نہ کی جائے۔ بلکہ ان کے ساتھ کمال مہربانی اور شفقت کا سلوک کیا جائے، اگر ان سے کوئی لغزش، فروگذاشت اور کوتاہی سرزد ہو جائے تو اس کو ان کی جہالت کے روگ کا نتیجہ گردانتے ہوئے ان سے درگذر کی جائے۔ تاکہ وہ احساس کہتری کا شکار نہ رہیں۔

۶۔ تقسیم ہند کے بعد جرائم میں جو بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے اور جس کی وجہ ناپسندیدہ عنصر کا کثیر تعداد میں انخلا ہے، حکومت کی فوری توجہ کا محتاج ہے، ان حالات میں ناگزیر ہے کہ جرائم کی رفتار کو روکنے اور لوگوں کو جرائم سے بچانے کے لئے فلاح بالغاں کی تحریک کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے مجرموں کی سرکوبی اور بیخ کنی اس طرح کی جائے کہ ان کی مجرمانہ ذہنیت کو یکسر بدل دیا جائے، تاکہ وہ اچھے اور پرامن شہری بن جائیں۔ اور اس طرح قوم اور ملک کے لئے مایۂ ناز اور قابل فخر ہوں۔

۷۔ فلاح بالغاں کی تحریک کی کامیابی اس امر پر ہے کہ بیکاری کو دور کیا جائے، اس لئے کہ بے کاری اور جہالت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، حکومت کو بیکاری دور کرنے کی طرف فوری توجہ کرنی چاہئے، اور یہ توجہ فلاح بالغاں کی تحریک کا ایک جزو ہوگی۔

۸۔ تمام ہائی اسکولوں اور سنٹر۔ اسکولوں میں فٹ بال، والی بال اور اگر فنڈ اجازت دیں اور کھیل کے میدان موجود ہوں تو کرکٹ اور ہاکی ٹیمیں بنائی جائیں، اور ان ٹیموں کے ساتھ ساتھ دیہاتی ٹیمیں بھی بنائی جائیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ ناخواندہ دیہاتی میدان میں اکٹھے کئے جا سکیں، اور اس طرح نہ صرف وہ تنفر و بُعد جو خواندہ اور ناخواندہ لوگوں میں موجود ہے دور ہوگا، بلکہ ناخواندہ لوگ وہ خوشی حاصل کر سکیں گے جو ان کی فلاح اور ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے، کرکٹ کے کھیل کو تمام علاقوں میں پوری شدت سے رائج کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اس کھیل میں دوسرے کھیلوں کی نسبت اجتماعیت پیدا کرنے کی خوبی کہیں زیادہ ہے۔

۹۔ قومی رضاکار تحریک کو فروغ دیا جائے۔ اور ہر ناخواندہ بالغ کو رضاکار بھرتی ہونے پر مجبور کیا جائے

ئی اسپرٹ پیدا کرنے کے علاوہ فلاح بالغاں کی تحریک کی نشو و نما میں
مجھے قومی امید ہے کہ حکومت، احباب دانش و بینش اور مصلح حضرات تعلیم بالغاں کو اسی نظریئے کے
ت دیکھتے ہوئے مناسب اقدام کریں گے کیوں کہ میں اس امر پر یقین رکھتا ہوں کہ جب تک
پنی کثیر ناخواندہ جماعت کو بقول علامہ اقبال ؒ

یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اپنی نادانی اور انگریزی نظری سے غیر حقیر اور کہتر سمجھ رکھا ہے جب تک ہم انہیں اپنی سطح پر نہ
ں گے۔ اس وقت تک ہم خوش حالی، امن اور سلامتی سے ہم کنار نہ ہو سکیں گے۔

منصوبی طریقِ تعلیم

نذیر احمد آثم

اکثر حضرات غلطی سے طریقِ تہجی، طریق الصوت، طریق ہین وگو، اسٹوری میتھڈ، ہوگا میتھڈ، یا مخلوط
طریقے کی طرح پروجیکٹ میتھڈ (منصوبی طریقِ تعلیم) کو بھی مبتدی کو پڑھنا سکھانے کا ایک طریقہ سمجھتے ہی
اور اسے محض طریقِ استقرائی اور استخراجی کی طرح حساب کا نیا قاعدہ یا گرامر کی تعریف سکھانے کا طریق تص
کرتے ہیں بعض حضرات کے خیال میں منصوبی طریقِ تعلیم نصاب کے مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے
مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے، مگر فی الحقیقت ان تمام نظریوں سے بالکل الگ تھلگ اور مختلف ہے

منصوبی طریقِ تعلیم کی اصطلاح میں میتھڈ کا لفظ ان محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا، حقیقت یہ
کہ منصوبی طریقِ تعلیم سے مراد وہ فلسفۂ تعلیم ہے جس کی رُو سے ہم تعلیم کے دقیق مسائل سے واقفیت حا
کرتے ہیں، اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ سیکھنے کا عمل کس طرح واقع ہوتا ہے؟ نیز سیکھنے کے عمل کو کس طر
دلچسپ، موثر، دیرپا اور کارآمد بنایا جاسکتا ہے؟ رنج و تسکین کے جذبات ذہنی آمادگی اور دما
یکسوئی کا سیکھنے کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے؟ کیا ایک وقت میں ہم صرف ایک بات سیکھتے ہیں، یا اس کے
اور بہت سی باتیں بھی سیکھتے ہیں؟ نصاب کے عام مضامین پڑھاتے وقت ہم ضمنی طور پر اخلاق کے ا
اصول بچوں کو کس طرح سکھاتے ہیں، اسلاف سے علم کس طرح حاصل ہوسکتا ہے؟ تعلیم کا زندگی سے ک
ہے؟ زندگی میں علم کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اور کس طرح اسے تبدیل کرتا ہے؟ الغرض یہ ہیں وہ ا
ارفع رموز و نکات جن کے سمجھنے کا اہل منصوبی طریقِ تعلیم بناتا ہے، منصوبی طریقِ تعلیم کی ماہیت سمجھ

ی سیکھنے کے چند اصولوں کو پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

پہلا اصول "آمادگی" ہماری تعلیم اسی وقت موثر ہو سکتی ہے، جب ہمارے جبلّی میلانات بیدار ہوں۔ ہم مطلوبہ کام کرنے کی خواہش محسوس کر رہے ہوں، کیونکہ جب ہم کسی کام کو کسی اس پہلو سے انجام دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو اس فعل کے کرنے سے بھی راحت ملتی ہے، اور اگر ہمیں س سے روکا جائے تو رنج پہونچتا ہے، اسی طرح جب ہم ذہنی یا جسمانی طور پر کسی کام کے لئے تیار نہ ہوں۔ اور ہیں وہ کام کرنے کے لئے مجبور کیا جائے تو اس سے کوفت ہوتی ہے۔

فرض کیجئے مجھے سخت بھوک لگی ہے اور میں کھانے کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں۔ اگر مجھے اس وقت مطالعے کے لئے مجبور کیا جائے تو مجھے سخت رنج ہوگا، اور میرا مطالعے میں ہرگز جی نہ لگے گا، کیوں کہ مجھے تو اس وقت کھانے کی سخت ضرورت ہے اس لئے میں معمولی سا اشارہ پاتے ہی فوراً کھانے کے کمرے کی طرف دوڑوں گا۔ اور پنی اشتہا پوری کرنے کی کوشش کروں گا، اس وقت میرا معدہ کھانا ہضم کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار ہے میرا دماغ اس بات کا خواہش مند ہے کہ کوئی کھانے کی چیز معدے میں داخل ہو، لیکن کیا کھانا کھانے کے بعد بھی مجھ میں وہی خواہش باقی رہے گی؟ کیا پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اگر کوئی اور چیز مجھے پیش کی جائے تو میں اسے اسی رغبت سے کھاؤں گا جس رغبت سے خالی معدہ ہونے کی صورت میں کھاتا رہا ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔

یا فرض کیجئے آپ کسی ضروری کام میں مشغول ہیں، اگر آپ کا دوست اس وقت تفریح طبع کے لئے آپ کو کہانی سنانا چاہے تو کیا آپ اس کی کہانی سننے کے لئے تیار ہوں گے، لازمی طور پر آپ اسے کسی اور وقت کہانی سنانے کے لئے کہیں گے، لیکن اگر وہ اسی وقت سنانے پر اصرار کرے تو آپ اس کے اس فعل پر سخت ناراض ہوں گے، اسی طرح ذہنی تیاری کی حالت ہمارے سیکھنے کے عمل میں کارفرما ہوتی ضروری ہے۔ یہ اصول ہم کے حصول علم پر عائد ہوتا ہے۔ دماغی نسل کے تیار ہوتے کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سب سے بہتر طریقۂ تعلیم وہ ہے جس میں مندرجہ ذیل دو اصول مدنظر رکھے جائیں۔

(ا) بچے میں دلچسپی پیدا کرنا (ب) بچے کو علم سیکھنے کے لئے آمادہ کرنا۔

علم اسی صورت میں جلد سیکھا جاتا ہے جب اکسانے والا جذبہ یعنی سیکھنے کی خواہش بچے کے اندر موجود ہو۔

دوسرا اصول - مقصد یا مدعا

جب کوئی شخص کسی خاص کام کو انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آنے کی سنجیدہ کوشش کرتا ہے، اُس کام کو انجام دینے کے لئے جتنا بڑا اس کا مقصد ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ شخص اس بات کے سیکھنے کے لئے تیار ہوگا جو اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے ضروری ہو۔ اور اتنا ہی وہ اس امر سے گریز کرے گا جو اس کے مقصد سے غیر متعلق ہوگا۔

فرض کیجئے کوئی لڑکا پتنگ بنانے کا ارادہ کرتا ہے، اور اس کا ارادہ بھی مضبوط ہے تو اس کا پورا جسمانی نظام یعنی اُس کا جسم، دماغ اور نفس اپنی مقصد برآری کے لئے مصروف کار ہوگا، وہ ان باتوں میں خاص دلچسپی لے گا۔ جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد ہو سکتی ہیں، اور ان باتوں سے نفرت کرے گا جو اس کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہیں، وہ ایسی لکڑی کا متلاشی ہوگا جو پتنگ بنانے کے لئے ہر طرح سے موزوں ہو یعنی ہلکی بھی ہو اور مضبوط بھی، وہ لکڑی کی پیمائش نہایت احتیاط سے کرے گا، اس کے ٹکڑے صحت سے کاٹے گا، وزن کرکے ایک دوسرے کا مقابلہ کرے گا، کاغذوں کے نمونے حاصل کرنا، پتنگوں کی بناوٹ اور مختلف نمونوں سے واقفیت حاصل کرنا، ڈور تیار کرنا، خرچ کا اندازہ لگانا اور اُسے پورا کرنے کے لئے روپیہ کی فراہمی وغیرہ یہ باتیں اس کے لئے جاذبِ توجہ ہوں گی۔

اس کے ارادے کی یکسوئی اور مضبوطی کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ وہ اپنے حصولِ مقصد کے لئے کسی قدر مشکلات کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آیا ہے، جب اس کا ارادہ مضبوط اور خیال پختہ ہوگا تو وہ کڑی مشکلات کے باوجود آگے بڑھتا جائے گا، اسی لئے علم کو موثر اور پختہ کرنے کے لئے دماغی یکسوئی یا زبردست خواہش کا ہونا ضروری ہے

تیسرا اصول تعلیم بالعمل (LEARNING BY DOING)

یہ اصول نہایت ضروری ہے، کیونکہ تجربہ ہی سب سے بہتر علم ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں اس ضروری اصول کو بہت بُری طرح نظر انداز کیا جاتا ہے ہم اپنے بچوں کو زبا

ں واقفیت بہم پہونچانے اور چند حقیقتیں طوطے کی طرح از بر کرانے پر اکتفا کرتے ہیں، ہمارے خیال میں تعلیم کا
ترین مقصد یہ ہے کہ بچے کو اعلیٰ نمبروں سے امتحان پاس کرا دیا جائے۔

انگلستان کے مشہور ماہر تعلیم مسٹر سینڈرسن زمانۂ مستقبل کے اسکولوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔
"اسکول ایسی جگہ نہیں ہوگی، جہاں بچے محض سبق یاد کرنے کے لئے آئیں گے۔ بلکہ یہ ایسی جگہ ہوگی
جہاں بچے نئی نئی چیزیں اختراع کرنا سیکھیں گے یعنی زمانۂ مستقبل کا اسکول محض ایک درسگاہ
نہ ہوگا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر منبع تجربہ گاہ ہوگا تعلیم کا جدید نظریہ ہے کہ تعلیم کی بنیاد انسان
کے ذاتی تجربہ پر رکھنی چاہیئے"

اس لئے ہر مدرس کے پیش نظر مولانا حالی کا یہ مصرعہ رہنا ضروری ہے "کہ مثل ہے کہ کرتے کی سب ہے بدّیا"
اس پر پوری طرح اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے کہ بچے کے اسکول کے کام کو ایسے مسائل اور امور سے
بستہ کر دیا جائے جن سے نہ صرف اس کی دلچسپی قائم رہے بلکہ اُسے گوناں گوں تجربات بھی حاصل ہو سکیں
حامیانِ تعلیم اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ بچوں میں سوچنے کی عادت پیدا کی جائے، ہمیں یہ حقیقت
درکھنی چاہیئے کہ بچہ اسی صورت میں سوچنا سیکھ سکتا ہے، جب اسے کامیابی کے ساتھ سوچنے کا موقع
یا جائے، سوچنے کی قابلیت اس حالت میں پیدا ہوتی ہے جب ہمیں مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے
ی حل طلب مسئلے کے پیش آنے پر انسان کا دماغ قدرتاً اس کا حل سوچتا ہے، اور وہ اپنے سابقہ تجربات
ی بنا پر اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی راہ نکالتا ہے۔

اگر ہم اپنی زندگی کے مسائل کا تجزیہ کریں تو ہمیں ان کو حل کرنے کے لئے ذیل کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے
(ا) کسی مسئلے کے متعلق ہمارے دل میں خواہش یا ضرورت کا پیدا ہونا، چنانچہ اسے حل کرنے یا سرانجام دے
لئے ہمارے دل میں جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(ب) اس جذبے کے ماتحت ہم اسے سرانجام دینے کا مضبوط ارادہ کرتے ہیں۔

(ج) اسے پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے تجویزیں سوچتے ہیں۔

(د) ان تجویزوں کو بہترین طریق پر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۷) مسئلے کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے جن مشکلات سے ہمیں دوچار ہونا پڑتا ہے اپنی استعداد
کے مطابق ہم ان پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۸) جب ہمیں اس کام میں کامیابی ہوتی ہے تو آئندہ کے لئے نہ صرف اس سے ملتے جلتے تجربات کو دوہرانے
کا رجحان ہم میں پختہ ہو جاتا ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت مشکلات کا مقابلہ کرنے کی جرأت بھی پیدا ہو جاتی
ہے، ناکامی کی صورت میں ہم اپنی گذشتہ کارروائی پر نظر ثانی کرتے ہیں جس بات کی وجہ سے ہمیں
ناکامی ہوئی ہے آئندہ کے لئے اس سے محتاط رہ کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے از سر نو کمربستہ ہو جاتے
ہیں، اور اس طرح ناکامی کو کامیابی کی سیڑھی پر چڑھنے کا پہلا زینہ بناتے ہیں، اگر ہم اپنے بچوں میں سوچنے
کی عادت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف دوسروں کے سوچے ہوئے نتائج پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں
کرنا چاہیئے، اور اسی نوعیت کی تعلیم زندگی میں داخل ہو کر اس کی تبدیلی کا موجب بنتی ہے، جو دراصل
تعلیم کا بڑا مقصد ہے، حقیقت میں تعلیم اس حاصل کردہ (اکتسابی) طریق زندگی یا کردار کا نام ہے جو ہمیشہ
انسان کے ساتھ رہے اور اسے تبدیل ہونے والے حالات کے مطابق بہتر سے بہتر طریق پر زندگی بسر کرنے
کے قابل بنائے۔ پس ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ سوچنے کا مادہ صرف تجربے سے ہی پیدا
ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ سوچنے کا عمل تجربے کی ترمیم بھی کرتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بچوں کو ہر حال میں صرف اپنے ذاتی تجربوں پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے
نہیں بلکہ اکثر حالتوں میں انہیں دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھانا ضروری ہے، کوشش یہ ہونی چاہیئے
کہ ہر ممکن ذریعے سے بچے کی واقفیت کو بڑھایا جائے، اور اس حاصل شدہ واقفیت کی اصلیت کو جانچا جائے
اس طرح جو واقفیت حاصل کی جائے گی وہ بچے کی زندگی میں گھر کر جائے گی، بشرطیکہ اس واقفیت کا بچے کے مقصد
یا مدعا کے ساتھ گہرا تعلق ہو،

ان تمہیدی نکات پر غور کرنے کے بعد ہم منصوبی طریق تعلیم کی ماہیت کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے، پروجیکٹ
سے مراد کوئی ایسا مقصد یا منصوبہ ہے جو ارادتاً اپنے ذاتی شوق سے منتخب کیا جائے اور جسے قدرتی حالات کے
ماتحت سرانجام دیا جائے۔

منصوبے کی اس تعریف پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ جن تین اُصولوں کا تمہید میں ذکر کیا گیا ہے، وہ اس تعریف میں موجود ہیں۔ حقیقی پروجیکٹ یا منصوبے کے سرانجام دینے میں بچوں کی اپنی خواہش یا ان کا دلی شوق موجود ہے۔ مدرس کی طرف سے بچوں پر ٹھونسا ہوا کوئی کام یا مشغلہ اس وقت تک پروجیکٹ نہیں کہلا سکتا جب تک بچے خود اس کام یا مشغلے کو اپنا بنا کر اس کی تکمیل کے لئے اپنے دل میں خواہش نہیں رکھتے۔ اس مشغلے کو سرانجام دینے کے لئے ان کا ارادہ یا قصد مضبوط ہو، پختہ قصد کی موجودگی میں وہ مشکلات سے گھبرانے کی بجائے ان پر عبور حاصل کرنے کے لئے مختلف تجویزیں سوچیں گے اور مختلف ذرائع عمل میں لائیں گے۔ تیسرا عنصر قدرتی حالات کے ماتحت سرانجام دینا ہے۔ اصلی تجربہ وہی ہے جو قدرتی حالات کے ماتحت سرانجام دیا جائے۔ مثلاً اگر بچے مکان بنانے کا قصد کرتے ہیں، تو جن جن حالات کے ماتحت انہیں اپنی زندگی میں مکان بنانے کے لئے گزرنا پڑتا ہے اپنے تعلیمی مشغلے کو سرانجام دینے میں وہ انہیں حالات سے گزریں گے۔

پروجیکٹ میتھڈ یا منصوبی طریقۂ تعلیم سے مراد بچوں کو ان کے منصوبوں کے ذریعہ تعلیم دینا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم میں بچوں کی اس دلچسپی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو ان کے حقیقی مقصد میں پائی جاتی ہے۔ بچے جب ایک ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور اسے پورا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو انہیں اسے پورا کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اپنے منصوبے کا فیصلہ کرنے کے بعد وہ اس کے سرانجام دینے کے لئے اپنی تجویزیں پیش کرتے ہیں، اور پھر ان پر عمل کرتے ہوئے مطلوبہ واقفیت کا علم حاصل کرتے ہیں۔ کام کے دوران میں مشغلہ فنون کی مشق کی جاتی ہے۔ مکمل ہونے پر کام کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ اس کی کامیابی سے انہیں اطمینان اور تسکین حاصل ہوتی ہے، اور ناکامی کی صورت میں وہ اُن وجوہات پر غور کرتے ہیں جن کی وجہ سے انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس طرح مرکزی مشغلے کو سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ نصاب کے بہت سے مضامین کو سیکھنے اور ان کا عملی طور پر استعمال کرنے کا بھی انہیں موقع ملتا ہے، اور اس طریق پر وہ اپنے علم کو حقیقی زندگی سے مربوط کرتے ہیں مختلف مرحلوں پر انہیں خود اپنے مسائل کے متعلق سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ انہیں اپنے علم کو بنانے کے ذرائع میسر آتے ہیں، کیونکہ ان کی تعلیم عملی ہوتی ہے، وہ اپنی غلطیوں اور خامیوں کو اپنی ذاتی سعی یا دسترس

کے مشوروں سے مدد کرتے ہیں، اپنے نتائج کار کام کے دوران میں مختلف مرحلوں پر اور آخر میں اس کے پایۂ تکمیل تک پہونچنے پر موازنہ کرتے ہیں، جو نا مرکزی مشغلے کی ضرورت کا زبردست احساس ان کے دلوں میں موجود ہوتا ہے، لہٰذا اس مشغلے کی تکمیل کے لئے جس علم یا ہنر کے سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، اسے حاصل کرنے کے لئے ان کی دلچسپی قائم رہتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان میں اخلاق کو پختہ بنانے والی عادات راسخ ہوتی جاتی ہیں، مثلاً دوسروں کے ساتھ رواداری، گروپ لیڈر کی فرماں برداری، ذمہ داری احساس، نیا کام کرنے کے لئے صحیح قدم اٹھانا اور اپنے فیصلے آپ کرنا وغیرہ۔

اگر غور کریں تو "بیسک نیشنل ایجوکیشن" میں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے یعنی حرفوں یا مشغلوں کو مرکز میں رکھ کر نصاب کے مختلف مضامین کو عملی طور پر پڑھانے پر زور دیا گیا ہے،

فرق صرف اتنا ہے کہ اس اسکیم میں حرفے یا مشغلے نصاب میں مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان کو مرکز میں رکھ کر نصاب کی کتابیں لکھی گئی ہیں، پروجیکٹ طریقہ تعلیم میں کوئی منصوبہ یا مشغلہ بچے پر ٹھونسا نہیں جاتا بلکہ بچہ خود بخود اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اور اسے پورا کرنے کا قصد کرتا ہے، اس کی تکمیل میں جس واقفیت کی اسے ضرورت پڑتی ہے اس کا علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً درسی یا لائبریری کی کتب، رسالہ جات یا اخبارات کے مطالعہ سے یا واقف کار اصحاب سے گفتگو کر کے وہ اپنے منصوبے کو سرانجام دینے کے لئے مطلوبہ واقفیت حاصل کرتا ہے، خطوط اور درخواستیں لکھنے اور تجربات کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا ہے، خرچ کا تخمینہ لگانے، اشیا کی خرید و فروخت کا عملی کام کرتا ہے جغرافیہ، تاریخ، مطالعہ قدرت وغیرہ کے علوم سے واقفیت پیدا کرتا ہے، اور مرکزی مشغلے میں کام آنے والے ہنروں کی مشق کرتا ہے، یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس طریق تعلیم سے نصاب کے تمام مضامین نہیں پڑھائے جا سکتے۔ اسی لئے ان کے ذریعے بچوں کو صرف وہی مضامین پڑھائے جائیں، جن کا تعلق مجوزہ مشغلے سے قدرتی ہو، مثلاً باغیچے کے منصوبے میں رقبے کے قاعدے کا قدرتی تعلق ہے، یہ قاعدہ بڑی آسانی سے سکھایا جا سکتا ہے، اسی طرح اسکول کے بینک کے ذریعے سود۔ ڈاک خانے کے منصوبے کے ذریعے روپے۔ آنے پیسوں کی تحویلوں وغیرہ کے سوالات قدرتی طور پر سکھائے جا سکتے ہیں جن مضامین کا منصوبوں سے قدرتی تعلق نہ ہو، ان کے

جانے کے لئے یا تو دوسرے طریقے استعمال میں لائے جائیں یا ان کے پڑھانے کے لئے دوسرے منصوبے استعمال کئے جائیں۔

منصوبے ہر بچے کے لئے انفرادی بھی ہو سکتے ہیں اور اجتماعی بھی، عام طور سے اسکولوں میں جماعتی منصوبے منتخب کرنے مفید ہوتے ہیں، ایسے منصوبوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، مثلاً مکان بنانا ہے تو اس منصوبے میں ایک گروہ مکان کا نقشہ تیار کرتا ہے، دوسرا گروہ اینٹیں بناتا ہے تیسرا عمارتی سامان فراہم کرتا ہے، چوتھا آرائشی سامان بہم پہونچاتا ہے وغیرہ۔ مختلف مدارج پر ہر گروہ کا لیڈر اپنے مفوضہ کام کی رپورٹ جماعت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس طرح پوری جماعت کو ہر گروہ کی کارگذاری سے واقفیت ہوتی رہتی ہے اور مشترکہ صلاح مشورے کے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

منصوبی طریق تعلیم میں مدرس کا درجہ کیا ہوتا ہے؟ جن اسکولوں میں منصوبی طریق تعلیم پر عمل کیا جاتا ہے وہاں مدرس کا لڑکوں سے بڑا قریبی تعلق ہوتا ہے، وہ ایک رہنما اور دوست کی حیثیت سے کام کرتا ہے، اپنی دانائی، فہم اور تجربے سے انہیں غلطیوں سے بچاتا ہے، انہیں اپنے منصوبوں کی تجاویز سوچنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی ترغیب دیتا ہے، مقصد کو ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رکھنے میں مدد کرتا ہے، طلبا کو جمہوریت کے اصول پر کاربند رہنے کی ہدایت کرتا ہے، ضبط کا اصلی مفہوم سمجھا کر ضابطے کے مطابق کام کرتا ہے اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے، طلبا کے منصوبوں میں مدد دینے والی تصاویر، کتب، دوسری اشیا مہیا کرتا ہے، تعلیمی سیر مقامی کارخانوں یا تاریخی مقامات کے مشاہدوں کا انتظام کرتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ عام مدرسین کی طرح آمر کی حیثیت سے کام نہیں کرتا، نہ وہ علم طلب ٹھونسنے ہی کی کوشش کرتا ہے، بلکہ وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ طالب علموں کو اپنے اردگرد کے وسیع امکانات کے سمجھنے کے قابل بنائے، ان میں تجسس کا مادہ پیدا کرے، وہ اپنے طالب علموں کو اپنی مدد آپ کرنے، نیز اپنے تجربے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے قابل بنانے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ یہی منصوبی طریق تعلیم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

منصوبی طریق تعلیم سے پڑھانا کوئی آسان کام نہیں، ان اصولوں کو استعمال کرنے کے لئے ہر مدرس کو اپنے تجربے سے بہترین طریقہ دریافت کرنا چاہئے کلپٹرک کی ہدایت کے مطابق ٹائم ٹیبل میں شروع کا ایک پیریڈ

طلبا، کی طرف سے آزادانہ طور پر منتخب کئے ہوئے مشغلے کے لئے وقف کیا جائے، مدرس کو اس بات کا انتظام کرنا چاہئے کہ اس کی جماعت مقصود مقاصد کو اختیار کرے، ان کو سرانجام دینے کے لئے تجاویز سوچے انہیں عملی جامہ پہنانے اور اپنے اپنے تجربے کے نتائج کا موازنہ کر کے ان سے بیش از بیش فائدہ حاصل کرے۔ ایسے مواقع نظرانداز نہ کرے، جہاں پروجیکٹ کے تجربات کو علم کی وسیع شاخوں سے مربوط کیا جا سکے، مختلف مضامین کو مصنوعی طریقے پر مربوط کرنے کے لئے ان کی نامناسب کھینچ تان سے پرہیز کیا جائے، اس بات کا یقین کرنے کے لئے کہ کارآمد باتیں سیکھی جا رہی ہیں اور مفید عادات طلبہ کے دلوں میں گھر کر رہی ہیں، ہر مدرس کو اپنی فہم و فراست استعمال کرنی چاہئے، الغرض منصوبی طریق سے تعلیم دینے کے لئے فہم و فراست کی بھی بڑی ضرورت ہے۔

منصوبی طریق تعلیم کی خوبیاں

(۱) منصوبی طریق تعلیم میں طالب علم اسکول میں سیکھی ہوئی حقیقتوں اور ہنروں کو عملی طور پر استعمال کرنا سیکھتا ہے نئے مسائل کے حل کرنے اور حقیقی منصوبوں کے انجام دینے کے لئے جب بچہ اپنے پرانے حاصل کردہ علم کو استعمال کرتا ہے۔ تو اس علم کی ماہیت اس پر بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) اپنے منصوبوں کے کارآمد اور مناسب نتائج پیش کرنے سے بچوں میں تعلیمی کام کے متعلق بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جب بچے پر کام کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اور اس کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر قسم کی کوشش عمل میں لانے سے گریز نہ کرے۔

(۳) منصوبوں کے ذریعے [illegible] ان کو عملی جامہ پہنانے، مناسب اشیاء کے بہم پہونچانے اور اوزاروں کے استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے، اس طرح ان میں وہ عادت پختہ ہوتی ہے، جس پر دوراندیشی، عمل میں اقدام اور جدت پسندی کی بنیاد استوار کی جا سکتی ہے۔

(۴) منصوبوں کے ذریعے نئی حقیقتوں کے دریافت کرنے اور جدید مواد کے تلاش کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، اس ضرورت کے ماتحت بچوں کو آزادانہ جستجو میں مصروف رہنے، کتب اور رسالہ جات کا مطالعہ کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہے، جب کسی منصوبے یا ہنر کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، مثلاً ڈرائنگ، خوشخطی دستکاری یا حساب تو بچے کے دل میں ان ہنروں میں مہارت پیدا کرنے کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔

اجتماعی منصوبوں کے ذریعے سماجی زندگی کو بہتر بنانے والی عاداتِ حسنہ کی مشق کا موقع ملتا ہے، مثلاً دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا اوروں کی راہ نمائی کرنا۔ یا اپنے سے اچھوں کی فرماں برداری کرنا، اہلیت کے مطابق گروہوں کے افراد میں کام تقسیم کرنا، جھگڑے کے فیصلے کے لئے اکثریت کے فیصلے کے سامنے تسلیم خم کرنا اور ذمہ داری محسوس کرنا وغیرہ اس قسم کی عادات کی پختگی سماجی زندگی کے لئے ازبس ضروری ہے۔

۶) منصوبے کے ذریعے مشکلات کا جائزہ لینے اور ان کے حل کرنے کی تجویزیں عمل میں لانے کا موقع ملتا ہے، جن کی وجہ سے طلبہ اور مدرسین کے دلوں میں تعمیری محنت طلب کام کی قدر و منزلت پیدا ہوتی ہے۔

۷) منصوبوں کے ذریعے ہمیں کسی ایک منصوبے کو مختلف درجوں میں تقسیم کر کے ہر درجے کی انجام دہی کے لئے مناسب تدبیریں اختیار کرنے اور حصول مقصد کے لئے ایک مرحلے کے بعد دوسرے مرحلے کو مکمل کرنے کی مشق ملتی ہے، اسی طرح صبر اور باقاعدگی کے ساتھ اپنی کوشش جاری رکھنے اور فائدۂ بعید کو حاصل کرنے کے لئے مستقل مزاجی سے محنت کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔

منصوبی طریقِ تعلیم کی خامیاں مندرجہ بالا خوبیوں کے پہلو بہ پہلو اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینا مناسب نہ ہوگا۔

(۱) عام طریقوں کے مقابلے میں اس طریقے پر کام کرنے سے خرچ زیادہ ہوگا اور وقت بھی زیادہ صرف ہوگا۔

(۲) کم سمجھ اور ناتجربہ کار مدرس کی زیرِ نگرانی کام کرنے سے اس طریقِ تعلیم سے وہ فائدے حاصل نہیں ہو سکتے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ لڑکوں کی مشغولیت محض سطحی ہو اور تعلیمی نقطۂ نگاہ سے وہ نقصان دہ غلطیاں سرزد کر رہے ہوں محض منصوبے کے سرانجام دینے کے لئے شمولیت اور محنت کرنے کے امکانات زیادہ پائے جا سکتے ہیں۔

(۳) بچے کی توجہ عام طور پر کسی عملی مشغلے کے سرانجام دینے پر لگی ہوتی ہے، اسے سرانجام دینے کے لئے بچہ صرف اُن حقیقتوں یا ہنروں کو سیکھنے کی خواہش کرے گا، جن کا حاصل کرنا اس کے منصوبے کی تکمیل کے لئے اشد ضروری ہو، ممکن ہے اپنی مقصد برآری کے لئے بعض اوقات وہ غلط طریقے ہی اختیار کرے

کیونکہ اس کا نصب العین کسی علم یا ہنر کا حاصل کرنا نہیں، بلکہ اپنے منصوبے کی تکمیل ہے، علم یا ہنر میں مہارت تو صرف ضمنی طریق سے حاصل ہوگی، اپنے منصوبے کے انجام پر نگاہ رکھنے کے باعث ہو سکتا ہے، کہ بچہ کسی علم و ہنر کے حاصل کرنے میں پوری مشق نہ کرے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے منصوبے کا فوری نتیجہ حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے طریقۂ کار میں من مانی کارروائی عمل میں لاتے ہوئے ان تمام ضروری مدارج کو نظر انداز کر دے جن پر عمل کرنا کسی علم یا ہنر میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو۔

(۲) منصوبے کے ذریعہ جو علم بچہ حاصل کرے گا وہ عام طور پر بے ترتیب اور بکھرا ہوا ہوگا لیکن کسی علم کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے کسی ترتیب سے ایک لڑی میں پرو دیا جائے اور بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ کر اوپر کے درجوں کی حقیقتوں میں مہارت پیدا کی جائے محض اسے استعمال میں لاکر ہم اپنے علم میں وسعت اور پختگی نہیں پیدا کر سکتے۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ منصوبے کو استعمال میں لایا ہی نہ جائے، اگر اس طریق تعلیم میں چند نقائص ہیں تو اس کے فوائد بھی تو بے شمار ہیں، لہذا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ منصوبی طریق تعلیم کو ترقی یافتہ طریقہ ہائے تعلیم کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جائے، جیسا کہ پہلے تجویز کیا جا چکا ہے کہ وقت نامے کے شروع میں روزانہ ایک پیریڈ صرف منصوبے کے لئے ہی مخصوص کر دیا جائے جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ایک تجربہ کار اور فہیم مدرس اس طریق تعلیم کی خوبیوں سے بخوبی فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور اس کی خامیوں سے بھی ہر طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔

ایمیل
یا
رُوسو کی تعلیم

توقیر مرزا ارزقی

مسلسل ۱۷

پڑھنا بچپن کی ایک لعنت ہے

جب بچوں کو اِس طرح سبق دینے سے میں نجات پا جاؤں گا تو گویا میں اِن کے سب سے بڑے مصائب و آلام کے سبب یعنی اِن کی کتابوں کی پریشانیوں سے محفوظ ہو جاؤں گا، پڑھنا بچپن کی ایک لعنت اور بیگار ہے، لیکن آپ بچوں کے لیئے بس ایک ہی مشغلہ میّسر ہے، اسمٰعیل کو بارہ سال کی عمر تک تو یہ مشکل سے ہی خبر ہوگی کہ کتاب کس چڑیا کا نام ہے لیکن آپ فرمائیں گے کہ کم از کم پڑھنا تو ضرور آجانا چاہیئے، یہ میں تسلیم کرتا ہوں جب پڑھنا اس کے لئے مفید ہوگا وہ خود بخود دیکھ لے گا، لیکن جب تک کہ اس کے لئے پڑھنا کچھ فائدہ مند نہ ہوگا اسے پڑھنے میں الجھن ہی معلوم ہوگی۔

سیکھنے کی خواہش یا شوق پیدا کردینا ہی سب سے بہتر طریقہ ہے

اگر بچوں سے کوئی کام بحیثیت خدمت گار نہ لیا جائے تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ بچے صرف اسی کام کو سیکھیں گے جس میں وہ حقیقی اور موقتی فائدہ یا تفریح محسوس کریں گے سیکھنے کے لئے اس کے سوا اور کیا ہونا چاہیئے؟ ہمارے غیر حاضر دوستوں سے باتیں کرنے اُن کے الفاظ سننے اور انہیں اپنی حسّیات، خواہشات اور تمناؤں سے براہ راست آگاہ کرنے کا فن ایک ایسی چیز ہے جس کے فوائد کی صراحت ہر عمر میں کی جاسکتی ہے، بھلا اس قدر کارآمد اور دل پذیر فن

بچوں کے لئے ہوّا کیوں کر بن جاتا ہے ؟ اس لئے کہ سیکھنے پر بچے کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کیا جاتا ہے اور اسے ایسے مقاصد کے لئے استعمال کرایا جاسکتا ہے جو بچے کی عقل و فہم کے باہر ہوتے ہیں ایک بچے کو آلۂ جلادی کے استعمال میں مہارت حاصل کرنے کی خواہش کچھ زیادہ نہیں ہوتی ہے ۔ بلکہ بچہ تو اس آلہ کو تفریح کا ذریعہ بنا لیتا ہے ، اور پھر چند ہی دن بعد آپ اس بچے کو اس آلے کے استعمال سے باز نہیں رکھ سکتے ہیں ۔ لوگ بچوں کو پڑھنا سکھانے کا بہترین طریقہ معلوم کرنے کے لئے بڑا شور و غل مچاتے ہیں وہ بیورو[1] (BUREAU) اور پتے (CARDS) ایجاد کر کے ایک چمن کو چھاپا بنا دیتے ہیں "لاک" کی خواہش تھی کہ بچوں کو گتوں کے ذریعہ پڑھنا سکھایا جائے ۔ کیا خوب خیال ہے لاحول ولا قوۃ ! ایک طریقہ ان سب سے کہیں افضل اور اعلیٰ موجود ہے ، جسے عموماً بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ یہی یہ طریقہ کسی چیز کے سیکھنے کی خواہش یا شوق میں مضمر ہے ۔ آپ اپنے شاگرد میں صرف یہ شوق یا خواہش پیدا کر دیں اور اس بیورو اور پتوں پر لعنت بھیجیں ، پھر آپ جو چاہیں طریقہ اختیار فرمائیں وہی کارآمد ثابت ہوگا ۔

پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کی مثال موقتی حاجت یعنی حرکت دینے والی قوت ہی وہ چیز ہے جو ہمیں خیر و عافیت کے ساتھ بڑی دور تک پہونچا دیتی ہے

بسا اوقات اسمٰعیل کے والدین عزیز و اقارب اور اس کے دوست احباب کے دعوتی رقعے اسمٰعیل کے پاس آتے ہیں ، کبھی رات کے کھانے کی دعوت ہوتی ہے کبھی چہل قدمی ، کبھی کشتی رانی اور کبھی کسی عام تفریح گاہ کی سیر کا بلاوا ہوتا ہے ۔ ان رقعوں کا مضمون سیدھا سادہ صاف اور خوشخط ہوتا ہے ۔ ان رقعوں کو پڑھ کر سنانے والا کوئی نہ کوئی ضرور ہونا چاہیے ، لیکن بوقت ضرورت کوئی پڑھ کر سنانے والا نہیں ملتا ہے ۔ اسمٰعیل کا کوئی اس سے زیادہ خیال نہیں کرتا ہے جتنا کہ خود

---

[1] بیورو ایک قسم کا تھیلہ ہوتا ہے جس میں پتوں پر لکھے ہوئے حروف ہوتے ہیں کہ جنہیں جوڑنے سے الفاظ بن جاتے ہیں ۔ پڑھنا سکھانے کے لئے یہ ایک نہایت ہی پسندیدہ طریقہ تصور کیا جاتا تھا اور اس طریقہ کا نام "بیورو کا طریقہ برائے حصول خواندگی" رکھ دیا گیا ہے ۔

سی کا خیال کرتا ہے۔ پس وقت گذر جاتا ہے اور موقع نکل چکتا ہے۔ تب آخر کار وہ رقعہ پڑھکر سے سنایا جاتا ہے اور کاش اسمٰعیل یہ جانتا کہ کیوں کر پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسمٰعیل کے پاس مختصر ور دلچسپ چٹھیاں آتی ہیں، اب وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ انہیں پڑھ لے بعض اوقات سے امداد بھی مل جاتی ہے بعض اوقات نہیں بھی ملتی پس اسمٰعیل انہیں پڑھنے کی انتہائی کوشش رتا ہے، اور بالآخر نصف مضمون پڑھ ہی لیتا ہے۔ اس چٹھی میں کسی جگہ کل صبح بالائی کھانے کے لیئے چلنے کی دعوت ہوتی ہے، لیکن کہاں جانا تھا، اور کس کے ساتھ چلنا تھا۔ یہ وہ نہیں پڑھ سکا، اب اس چٹھی کا سارا مضمون پڑھنے اور معلوم کرنے کے لئے اسمٰعیل اس قدر کوشش کرتا ہے کہ اللہ کی پناہ، میں نہیں سمجھتا کہ اسمٰعیل کو کسی بیہودہ کی ضرورت پڑے گی۔ کیا اب میں لکھنا سکھانے کی تعلیم کا بھی ذریعہ بتاؤں؟ ایک تعلیمی رسالے میں ایسی معمولی چیزوں کا ذکر چھیڑتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، میں چند الفاظ کا ذیل میں ابھی اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں جن میں ایک بہت اہم اصول بھی شامل ہے، یعنی جس چیز کے حصول کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہوتی ہے وہ نہایت سُرعت اور کامل وثوق کے ساتھ ہمیں حاصل ہو جاتی ہے مجھے یقین کامل ہے کہ اسمٰعیل دس سال کی عمر کے قبل ہی لکھنا پڑھنا دونوں از خود سیکھ جائے گا، اور یہ محض اس وجہ سے کہ مجھے پڑھنا سکھانے کی پندرہ سال کی عمر تک بھی قطعاً کوئی فکر نہیں ہے، لیکن میں بذاتِ خود ان تمام امور کو قربان کر کے جو خواندگی کو مفید بناتے ہیں اس فن کو حاصل کرنے کی نسبت اسمٰعیل کا عمر بھر قطعی طور پر ناخواندہ رہنا ہی زیادہ پسند کرتا ہوں، پس جبکہ قراءت سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا رہا ہے تو اسے پڑھنے سے بھلا کیا خاک فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

خودرو یا طبع زاد طریقہ تعلیم میں مجھے اس کے خلاف اتنے ہی اعتراضات ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، آپ کا شاگرد اگر آپ سے کچھ نہ سیکھے گا تو وہ دوسروں سے سیکھ جائے گا، اگر آپ اس میں صداقت اور راست گوئی پیدا نہ کریں گے تو وہ کذب اور دروغ گوئی سیکھ جائے گا جن تاثرات کو سکھانے سے آپ ڈرتے ہیں انہیں وہ آس پاس والوں سے اپنے

حواریوں کے ذریعہ از خود سیکھ جائے گا، جو یا تو پختگی کے قبل ہی اس کی عقل کو مسخ کر دیں گے یا بیکار اور بے حس رہنے کی وجہ سے اُس کے دل کو سُن کر کے مادی اشیا میں محو کر دیں گے اگر ہم بچوں کی طرح سوچ بچار کی عادت نہ ڈالیں تو تمام عمر کے لیئے ہم میں سے قوت تخلیہ ہی زائل ہو جائے۔

میرا خیال ہے کہ اس اعتراض کا جواب میں باسانی دے سکتا ہوں لیکن ہر اعتراض کا آخر میں جواب ہی کیوں دوں۔ پس اگر میرا طرزِ تعلیم خود بخود آپ کے اعتراض کا جواب دے دے تو بہتر ہے اور اگر نہ دے سکے تو یہ خود بخود ناکارہ ہے۔ لہذا میں اپنی توضیحات اور تشریحات کو جاری رکھتا ہوں۔

اگر میرے مجوزہ نقشے کے مطابق آپ ان اصولوں پر کاربند ہو جائیں جو مروجہ طریق عمل کے بالکل خلاف ہیں اور اپنے شاگرد کو آپ اگر میدانوں میں لے جانے اور دور افتادہ مقامات، ممالک بعیدہ، قرون ماضیہ زمین کے کناروں اور خود آسمانوں میں آوارہ گردی کرنے کی بجائے اس کی ذاتی شخصیت اور دلچسپیوں میں مصروف رکھنے کی سعی فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ دیکھتا بھی ہے، یاد بھی رکھتا ہے اور عقل سے بھی کام لیتا ہے، یہ قدرتی نظام ہے، ذی حس مخلوق جب متحرک ہو جاتی ہے تو اس مخلوق کی قوتِ تمیز اس کی طاقت کے ساتھ ہی ساتھ نشو و نما پانے لگتی ہے، اور جب تک اس کی طاقت حفاظت خود اختیاری کی ضروریات سے زائد نہ ہو جائے قوت تمیز پختگی اختیار نہیں کرتی ہے، اور یہ وہ قوت ہے جو اس فالتو طاقت کو دیگر معاملات میں استعمال کرنے کے لیئے ہی ودیعت ہوئی ہے۔ اگر آپ اپنے شاگرد کی عقل تیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ اس طاقت کو ترقی دیجیئے جسے قابو میں رکھنے کے لیئے عقل بنائی گئی ہے، بچے کو جسمانی ورزشیں برابر کراتے رہیئے اور اسے تندرست و توانا بنا دیجیئے اور ہمیشہ کسی نہ کسی شغل میں اسے مصروف رکھیئے۔ الغرض آپ اسے شدید القوی آدمی بنا دیجیئے تو وہ بہت ہی جلد ایک عقلمند اور دانا انسان از خود بن جائے گا۔

جسمانی قوت ذہنی افعال کو قوت پہونچاتی ہے

اگر آپ بچے کو ہر وقت ہدایت دیتے اور یہ کہتے رہیں گے کہ یہاں آؤ۔ وہاں جاؤ۔ ٹھہرو۔ یہ کرو۔ وہ مت کرو تو بلاشک آپ اس طرزِ تعلیم سے بچے کو اور بھی غبی اور ٹس بنا دیں گے، اگر آپ اس کا

ہاتھ پکڑ کر اپنے دماغ کے ذریعہ ہی بچے کی راہنمائی فرمائیں گے تو بچہ کا ذاتی دماغ بالکل بیکار و معطل ہو جائے گا۔ لیکن ذرا ہماری معین کردہ شرائط کو یاد فرمائیے، اور اگر آپ نام و نمود کے دلدادہ ہیں تو آپ کو میری یہ کتاب پڑھنی ہی سزاوار نہیں ہے۔

یہ خیال کرنا کہ جسمانی یا طبعی کام کاج سے ذہنی افعال کی کوئی مزاحمت ہوتی ہے ایک مہیب اور اندوہناک غلطی ہے کیوں کہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہر دو قوتوں کو بیک وقت کام میں نہ لگانا چاہیئے اور یہ کہ ایک قوت دوسری قوت کی راہنمائی کے لئے گویا مقدر کی ہی نہیں گئی ہے۔

صرف دو ہی طبقات کے لوگ ہمیشہ جسمانی محنت میں مصروف رہتے ہیں، کسان اور وحشی اور بلاشبہ ان میں سے ایک بھی ذہنی تیاری کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ کسان غیر مہذب اجڈ۔ بیڈھنگا اور بیڈول ہوتا ہے، وحشی نہ صرف ذکی الحس ہونے کی صفات میں مشہور و معروف ہیں بلکہ اعلیٰ ذہنی چالاکیوں کے لئے بھی شہرۂ آفاق ہیں، اگر دیکھا جائے تو کسان سے زیادہ سست اور کاہل وجود اور وحشی سے زیادہ تیز و چالاک عموماً کوئی دوسری مخلوق نہیں ہوتی ہے اس اختلاف کا آخر کیا سبب ہے؟ کسان ہمیشہ وہی کام کرتا ہے جو اس کے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں اور وہ خود ہمیشہ سے کرتا چلا آرہا ہے، اس لئے وہ عادت کا بندہ ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی ایک خود رفتہ کل یا مشین کی مانند ایک ہی کام اور ایک ہی حال پر گذار دیتا ہے، عادت اور آلات عقل کی جگہ حاصل کر لیتی ہیں، وحشی کا معاملہ بالکل دگرگوں ہوتا ہے، وہ کسی کا بندہ ہو کر نہیں رہتا اور نہ اس کا روزمرہ کا کوئی مقررہ کام ہی ہوتا ہے، اور نہ وہ کسی بالادست کا مطیع ہوتا ہے اپنی مرضی کے سوا وہ کسی اور قانون سے واقف نہیں ہوتا، لہٰذا قدم قدم پر اسے غور و خوض سے کام لینا پڑتا ہے، انجام سوچے بغیر وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرتا پس جس قدر اس کی جسمانی ورزش ہوتی ہے اتنا ہی وہ دماغ کا چاق و چوبند اور لیس ہوتا جاتا ہے، اس کی جسمانی طاقت اور عقل دونوں ساتھ ساتھ اکٹھی ترقی اور ایک دوسرے کی نشو و نما میں معاونت کرتی رہتی ہیں۔

آئیے لائق اساتذہ آئیے! دیکھیں کہ ہم دونوں کے شاگردوں میں کس کا شاگرد وحشی سے بازی

مشابہت رکھتا ہے اور کس کا کس سے ، آپ کا شاگرد تو ایک قوت کا مطیع ہے جو ہر لحظہ اس کی ہدایت میں لگی رہتی ہے ، وہ صرف احکام کی تعمیل کرتا ہے ، بھوک کے وقت کھانا کھانے کی جرأت نہیں کر سکتا اور نہ خوشی کے وقت ہنس سکتا ہے نہ رنج کے وقت رو سکتا ہے اور نہ ایک ہاتھ کی بجائے دوسرا ہاتھ بڑھا سکتا ہے ، اور نہ بلا حکم قدم ہلا سکتا ہے اور عنقریب شاید سانس بھی لینے کی ہمت نہ کر سکیگا ، اب آپ ہی فرمائیے کہ جب اس کی طرف سے تمام غور و خوض آپ خود ہی کر لیتے ہیں تو پھر آپ اس سے کس چیز پر غور و خوض کرانا چاہتے ہیں ؛ جب وہ آپ کی دور اندیشی سے خود بخود محفوظ رہتا ہے تو پھر وہ اپنی فکر آپ کیوں کرے ؛ یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری آپ نے لے رکھی ہے ، اس لیے ان حفاظتی ذمہ داریوں سے وہ اپنی ذات کو بالکل آزاد خیال کرتا ہے ، اس کی رائے آپ کی رائے کی محتاج ہے ، پس جس کام کو آپ منع نہیں کرتے وہ یہ خیال کر کے کہ اس میں کوئی خدشہ نہیں ہے ضرور کرتا ہے ؛ بارش کی علامتوں سے وہ کیوں واقفیت حاصل کرے جبکہ وہ جانتا ہے کہ آپ خود ہی اس کی خاطر بادلوں کو دیکھا کرتے ہیں ؛ جبکہ وہ جانتا ہے کہ رات کے کھانے سے وہ محروم نہیں ہو سکتا تو وہ شام کی چہل قدمی کا وقت کیوں معین کرے ؛ جب تک آپ منع نہ کریں وہ کھاتا رہتا ہے اور جب آپ روک دیتے ہیں وہ کھانا ختم کر دیتا ہے ، وہ اپنے معدہ کا خیال نہیں کرتا بلکہ آپ کی ہدایتوں پر کاربند رہتا ہے ، آپ اس کے جسم کو معطل رکھ کر بیکار ۔ ڈھیلا ڈھالا اور لدھڑ بنا دیتے ہیں اس لئے کہ آپ اس طرز عمل سے اس کی ذکاوت اور فہم میں تیزی نہیں پیدا ہوتی ہے ، بلکہ یہ تو درکنار آپ ان چیزوں کے متعلق جو اسے بے حد معمولی معلوم ہوتی ہیں ، اس کی ذاتی قوت ادراک کو استعمال کرا کے عقل کی توہین کرانے کے کام کی تکمیل فرما دیتے ہیں ، اور چونکہ وہ اپنی عقل کو اپنی ذات کے لئے کبھی کارآمد نہیں پاتا اس لئے وہ آخر کار یہ طے کر لیتا ہے کہ عقل محض ایک بیکار شے ہے ، اگر وہ کوئی نامعقول بات کرتا ہے تو اس پر اعتراض کئے جاتے ہیں ، اور اس سے زیادہ اس کے لئے اور کوئی خرابی کی بات نہیں ہو سکتی ہے ، یہ اعتراضات اکثر و بیشتر اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ ان کی طرف توجہ ہی کرنا چھوڑ دیتا ہے ، اور اس لئے روزمرہ کے ایسے معمولی خدشوں کا اب اسے کوئی احساس تک نہیں رہتا ہے ۔

اس پر بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ دل رکھتا ہے، اور جس طریقہ کا میں قبل ذکر کر چکا ہوں اس کے مطابق وہ عورتوں سے باتیں کرنے میں کافی تیز اور چالاک ہوتا ہے، لیکن اگر وہ کسی مصیبت میں پھنس جائے اور مشکل حالات کے تحت اسے کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہو جائے تو آپ اسے غیر مہذب اور اجڈ سے اجڈ مزدور کے لڑکے سے بھی صدہا درجہ احمق پائیں گے۔

میرے شاگرد یا فطرت کے طالب علم کا یہ حال ہے کہ اسے ابتدا ہی سے حتی الامکان اپنی ذات پر بھروسا رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے، ہمیشہ دوسروں کی امداد حاصل کرنے کی اس نے عادت نہیں ڈالی ہے اور اپنے علمی ذخیرے کی نمائش کی تو اس میں اس سے بھی کم عادت ہے، وہ تو اس کے برخلاف اپنی قوت تیزی اور دور اندیشی سے کام لیتا ہے، اور ہر اس چیز کے متعلق اپنی عقل استعمال کرتا ہے جس کا اس کی ذات سے تعلق ہو، وہ باتیں نہیں بناتا کام کرتا ہے، دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کے متعلق وہ ایک حرف بھی نہیں جانتا ہے، لیکن یہ خوب جانتا ہے کہ اس کی ذات کو کونسی چیز متاثر کرتی ہے اور کیوں کر وہ ہر وقت متحرک رہتا ہے اس لئے وہ بہت سی چیزوں کو دیکھنے اور بہت سے اسباب اور نتائج کو پہچاننے پر مجبور ہے، لہذا بہت ہی جلد وہ کافی تجربہ حاصل کر لیتا ہے، اس کی انسانی قدرت ہوتی ہے، کوئی مخلوق نہیں ہوتی، چنانچہ اسی وجہ سے وہ علم اور بھی زیادہ جلدی حاصل کر لیتا ہے اس لئے کہ اسے اس کی خبر نہیں ہوتی کہ اسے کوئی سبق بھی یاد کرنا ہے، پس میرے شاگرد کا جسم اور عقل دونوں متحد ہو کر عمل کرتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے ہی خیالات کی تکمیل کرتا ہے اور دوسروں کی رائے پر عمل نہیں کرتا ہے اور اس طرح اپنے خیال اور عمل دونوں کو متحد کر دیتا ہے، پس امیل جس قدر توانا اور تندرست ہوتا جاتا ہے اتنا ہی عاقل اور فہیم بھی ہوتا جاتا ہے، جس چیز کو کو بڑے بڑے لوگوں نے حاصل کیا ہے۔ ناقابل حصول خیال کیا جاتا ہے، یعنی روحانی اور جسمانی قوت۔ فیلسوفوں کی دانائی اور زورآوروں کی چستی اسے زمانۂ مابعد میں حاصل کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔

نوجوان اساتذہ! میں آپ کے روبرو بلا حکم دیئے مطیع رکھنے اور بلا کچھ کہے ہر کام کرانے کی ایک مشکل مہم پیش کر رہا ہوں، یہ میں مانتا ہوں کہ یہ فن آپ کی بساط کے باہر ہے، اس سے شاگردوں کے

والدین پر نہ آپ کی قابلیت کی دھاک بیٹھ سکتی ہے اور نہ آپ کی شخصی قدر و منزلت نمایاں ہو سکتی ہے
لیکن کامرانی کا راستہ صرف ایک ہی ہے ، اگر ابتدا میں آپ ننھے ننھے شرارت کے پتلے تیار نہ ہونے دیں گے
تو آپ آدمیوں کو عقلمند بنانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے ، اسپارٹا والوں کی یہ بھی ایک تعلیم تھی انہیں
کبھی کوئی کتاب پڑھنی نہ سکھائی جاتی تھی ، بلکہ اپنی ذات کے لئے رات کا کھانا چورانا سکھایا جاتا تھا۔
تو اس سے کیا وہ لوگ اپنی زندگی مابعد میں کسی سے کم تر تھے ؛ وہ لوگ فتح و نصرت کے لئے شب و روز
تیار رہتے تھے ، اور ہر جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتے تھے ، باقی ایتھنز والے تو ان کے اقوال
سے بھی ایسے ہی خوفزدہ رہتے تھے جیسا کہ ان کے افعال سے۔

جب تعلیم کی طرف بے حد توجہ ہوتی ہے تو استاد اپنے احکام نافذ کرتا ہے اور اپنے آپ کو ایک آقا خیال
کرنے لگتا ہے لیکن در اصل حقیقی آقا تو بچہ ہی ہوتا ہے جس کام پر آپ اسے لگاتے ہیں اسی کے ذریعہ
وہ اپنی خواہشات کی تکمیل آپ ہی سے کرا لیتا ہے ، اور ہمیشہ گھنٹہ بھر کی محنت کے عوض آپ سے ہفتہ بھر
آرام حاصل کر لیتا ہے ، آپ کو اس سے ہمیشہ سودا کرنا ضروری ہوتا ہے ، یہی قول و قرار جنہیں تجویز تو آپ
اپنے لئے کرتے ہیں لیکن تکمیل ان بچوں ہی کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے ، ہمیشہ بچے کے ذاتی تصورات
ہی کی تائید میں ہوتے ہیں ، بالخصوص جبکہ اپنی حماقت سے آپ کوئی ایسی شرط قائم کر دیتے ہیں کہ جس کے
ذریعہ بچہ چاہے اپنے ذاتی شرائط پورے کرے یا نہ کرے لیکن کوئی فائدہ حاصل کرنے کا یقین کامل رکھتا
جس تیزی سے ایک بچہ عموماً اپنے استاد کے خیالات بھانپ لیتا ہے ، استاد اس تیزی سے اس کے خیالات
معلوم نہیں کر سکتا ہیں اسی وجہ سے جیسا کہ وہ بچہ جسے اگر اسی کے حال پر چھوڑ دیا جائے اپنی سادہ
عقل کو حفاظت خود اختیاری میں صرف کرتا ہے ، یہ بچہ اس عقل کو ایک ظالم کے چنگل سے اپنی پیدائشی
آزادی حاصل کرنے کی فکر میں صرف کرتا ہے ؛ اور ادھر استاد بھی جسے بچے کی باتوں کو سمجھنے کی ایسی کوئی
ضرورت نہیں ہوتی ہے بسا اوقات اپنا فائدہ اسی میں دیکھتا ہے کہ بچے کو فریب اور شیخی خوری ہی میں
پڑا رہنے دے۔

آپ اپنے شاگرد کے ساتھ بالکل مخالف برتاؤ رکھیں ، یعنی ہمیشہ اسے خود اپنے ہی کو استاد تصور

کرنے دیں درآں حالے کہ حقیقی استاد آپ ہی رہیں جس اطاعت میں آزادی کی شکلیں محفوظ رہیں اس سے زیادہ مکمل کوئی تسخیر نہیں ہوتی، وہ یہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ خود دل بھی مسخر کرلیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بیچارہ بے علم، بے طاقت اور بے عقل بچہ بالکل آپ ہی کے رحم وکرم پر نہیں ہوتا ہے؟ کیا آپ بچے کے سارے ماحول کے جس حد تک وہ اس سے متاثر کرتا ہے مختار کل نہیں ہوتے ہیں؟ کیا آپ جو چاہیں اسے وہی نہیں بنا سکتے ہیں؟ اس کا کام۔ اس کا کھیل اس کا آرام اور اس کی تکلیف یہ سب کے سب بچے کی لاعلمی میں کیا آپ ہی کے قابو اور قبضہ میں نہیں ہوتے ہیں؟ بلا شک وشبہ اسے وہی کام کرنا چاہیئے جو وہ کرنا چاہتا ہو، لیکن بجز اس کام کو کرنے کی خواہش کے جو آپ اس سے کرانا چاہتے ہیں اس میں دوسری خواہش پیدا ہی نہ ہونی چاہیئے اسے ایک قدم بھی ایسا نہ اٹھانا چاہیئے جسے آپ پہلے ہی سے نہ جانتے ہوں اور ایک حرف بھی زبان پر ایسا نہ لانا چاہیئے جس کی پیشن گوئی آپ نہ کر سکتے ہوں۔ پھر اس کے ذہن کو متاثر کئے بغیر بلحاظ عمر وہ جسمانی ورزشوں میں خود کو مشغول رکھ سکے گا۔ لہذا آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ غیر پسندیدہ پابندیوں سے بچنے کے لئے اور بہانے سوچنے کی بجائے وہ اپنی وقتیہ بھلائی کے لحاظ سے اپنی ماحولی فضا سے انتہائی فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا اور قابل حصول اشیا کو حاصل کرنے اور دوسروں کے خیالات کی امداد کے بغیر ان اشیاء سے حقیقی فائدہ اٹھانے کے لئے جو ذرائع وہ اختیار کرے گا ان کی ترکیب کو دیکھ کر آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ آپ بچے کو اس کی ذاتی خواہشات کا مختار تو بناتے ہیں لیکن آپ اس کے توہمات میں اضافہ نہیں ہونے دیتے پس جب کہ وہ محض اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے گا تو عنقریب وہ وہی عمل کرے گا جو اس کو کرنا چاہیئے، اور گو اس کا جسم برابر حرکت کرتا رہتا ہے لیکن جہاں تک بچے کی معقول اور وقتی دلچسپیوں کا تعلق ہے آپ اس کو بسبب استطاعت عقل کے ہر شعبے میں کہیں زیادہ ایسے طریقہ پر ترقی کرتا پائیں گے جو بچے کے لئے خالص علمی مطالعوں کی نسبت کہیں زیادہ موزوں اور سزاوار ہوتا ہے۔

پس جبکہ وہ آپ کو ہر معاملہ میں اپنا مزاحم نہیں پاتا تو وہ آپ سے مطمئن ہو جاتا ہے اور آپ سے کوئی راز نہیں رکھتا، نہ کبھی آپ سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ کبھی آپ کو دھوکہ دیتا ہے۔ بلکہ بے دھڑک

اپنی اصلیت آپ پر عیاں کردیتا ہے۔ اب آپ اس کی ذہنیت کا فرصت سے مطالعہ فرما سکتے ہیں اور جیسی بھی تعلیم اس کو دینا چاہیں غیر محسوس طریق پر آپ اس تعلیم کی ایسی فضا پیدا کرسکتے ہیں کہ بچے کو اس کا شبہ بھی نہ رہے۔

علاوہ ازیں آپ کے افعال و اعمال کو بھی وہ تجسس اور رقابت کی نظر سے نہ دیکھے گا اور نہ آپ کی غلطی پکڑنے میں کوئی مخفی لطف اٹھائے گا کیوں کہ اس سے محفوظ رکھنا بہت ہی بڑی بات ہے جیسا میں پہلے بیان کرچکا ہوں، ابتداءً بچہ کی ایک یہ بھی نیت رہتی ہے کہ اپنے استاد کی کمزوری معلوم کرے اور گو اس ذہنیت سے حقارت ٹپکتی ہے لیکن دراصل یہ حقارت سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو غیر پسندیدہ پابندیوں سے بچنے کی خواہش کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کے بوجھ سے عاجز آکر جو اس پر عائد کی جاتی ہیں بچہ نجات حاصل کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے ایسی اس کو استاد کی غلطیاں پکڑنے میں چھٹکارہ حاصل کرنے کا بہترین موقع حاصل ہوجاتا ہے لیکن خطاؤں یا کمزوریوں کی یہ جستجو اور ان سے خوش ہونے کی عادت بھی لوگوں کے ذریعہ ہی سے پیدا ہوجاتی ہے۔ یقین طور پر ہم نے اسمٰعیل کے دل میں بدی کا ایک اور چشمہ بند کردیا ہے، میری کمزوریوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکنے کی وجہ سے وہ ان کی جستجو میں نہ رہے گا اور نہ اس کو دوسرے لوگوں کی کمزوریاں معلوم کرنے کی ترغیب ہوگی۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

تعلیم مزید

ایڈن برا میں فرصتی مدارس (CONTINUATION SCHOOLS) کے لئے جو نصاب اور دستور العمل شائع ہوا ہے، اس میں تعلیم مزید کا اچھا خاصہ اہتمام کیا گیا ہے۔ ایڈن برا اپنی اس تعلیم کے لئے پہلے سے بھی مشہور ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مسلسل طریق تدریس جسے ہم نے ایک بے ... سے نام تعلیم مزید سے موسوم لیا ہے، فی الواقع زمانہ مابعد مدرسہ کو دو واضح اور مختلف النوع ادوار میں تقسیم کرتا ہے، ایک تو عنفوان شباب کا زمانہ ۱۸ سال کی عمر تک، اور دوسرا دور بلوغت ۱۸ سال سے ۲۰ سال یا اس سے زیادہ عمر تک دونوں زمانوں کے لئے تعلیم کی نوعیت اور اس کے طریق تدریس میں عظیم اختلاف ہوتا ہے، اور حق یہ ہے کہ انہیں ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینا چاہئے۔ ایڈن برا کمیٹی کے ناظم تعلیم مزید (FURTHER EDUCATION) نے اپنی رپورٹ میں زیادہ تر ان دونوں اداروں کی ابتدائی ضروریات سے بحث کی ہے اور جو نمایاں ترقی اس سلسلے میں ہوئی ہے، اسے اس رپورٹ میں منظر عام پر لایا گیا ہے، اس ترقی کی سب سے بڑی وجہ ... (EMPLOYERS) کا روشن خیال ہے، تجارتی کورس میں ... روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے، اس کے علاوہ دوسرے نئے مضامین کی مانگ بھی برابر بڑھ رہی ہے، طلبہ مختلف تجارتی اور پیشہ ورانہ امتحان میں شریک ہوتے ہیں اور سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں، اس ترقی اور طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد سے کچھ مشکلات بھی پیدا ہو جاتی ہیں ...ات اور ساز و سامان کی کمی بالخصوص صبر آزما ثابت ہوتی ہے، ایڈن برا کے موجودہ طریق تعلیم کی کامیابی کی وجہ ناظمین تعلیم اور تعلیمی کمیٹی کی ہمت و کوشش، استعداد و صلاحیت، حسن انتظام اور جذبہ کار ہے، مزید براں اس بڑھتی ہوئی ترقی میں صنعتی اداروں کے مالکوں اور کمیٹی کے اراکین کی گہری وابستگی اور تعلق کو بھی دخل ہے، ایڈن برا کی

موبائل کمیٹی نے تربیت اساتذہ کے لیے جس قدر تعاون کیا ہے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے
دریوتھ ایمپلائمنٹ سروس (YOUTH EMPLOYMENT SERVICE) کا اہتمام بھی بہت زیادہ اہم اور
ناگزیر تھا تعلیم کے اختتام پر ترقی و نشو ونما کا انٹرویو (باضابطہ ملاقات) ہوتا ہے، اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۲ء کو ۱۷۹۲
لڑکوں سے ۱۵۵۸ لڑکوں اور ۱۷۹۹ لڑکیوں میں سے ۴۸۶ لڑکیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، ان سب کا
انٹرویو ہوا، اسی تعداد اور اس اونچی نسبت سے اس اسکیم کی کامیابی اور اس کی خوبیاں واضح ہو جاتی ہیں۔
پچھلے سال ۴۲۲۳ روزگار تلاش کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں میں سے ۴۲۹۵ کو فی الفور ملازمتیں مل
گئیں، پوری رپورٹ صرف اساتذہ کے ہی نہیں، دوسرے شہریوں کے لئے بھی مفید ہے۔

اساتذہ کا تحفہ

کرکینیز (KIRKENES) ناروے کے انتہائی شمال میں ایک چھوٹا سا شہر ہے جنوبی ناروے کے اساتذہ نے اس شہر میں ایک عمدہ کتب خانہ تعمیر کیا ہے، اس کتب خانے کی تعمیر پر ۱۷۵۰۰ پونڈ صرف ہوئے ہیں، اور یہ ان اساتذہ کا تحفہ ہے جنہیں دوران جنگ میں جرمنوں نے اس شہر میں مقید کر کے جبری محنت کے لئے مجبور کیا تھا، یہ ۶۷۳ اساتذہ المانوی شدت پسندی اور خوراک کی کمی کو برداشت کرتے رہے اور ان میں سے بیشتر ان سخت گیریوں کے باوجود زندہ و سلامت رہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کرکنیز کے باشندوں نے انھیں خوراک بھی بہم پہونچائی اور ان کی ہر ممکن امداد بھی کی۔ اس دس ہزار کتابوں پر مشتمل کتب خانے کے علاوہ انھوں نے ناروے کے شمالی صوبے فن مارک کے نوجوانوں کی تعلیم کے لئے ۵۰۰۰ پونڈ کا وظیفہ فنڈ بھی قائم کیا۔

اساتذہ کی علم دوستی اور اشاعت علم کی یہ ایک زندہ مثال ہے۔ کیا ہمارے ملک میں بھی اساتذہ کا ایک گروہ پیدا ہو سکے گا جن کا نصب العین ترویج و اشاعت علم ہو؟

ویلز میں مدارس کی تعمیر

انگلستان کی وزارت معارف کے حلقہ ویلز کے مستقل سکریٹری سر بن بوین ٹامس نے پینڈگاٹ سکنڈری ماڈرن اسکول، ہیورفورڈ ویسٹ کا افتتاح کیا، اس عمارت کا نقشہ اسی کاؤنٹی کے مہندسوں نے تیار کیا ہے، اس کی تعمیر میں ۲۵۰۰۰۰ پونڈ لاگت آئی ہے، اس میں ہیورفورڈ ویسٹ اور پیمبروک شائر کے نواحی علاقوں کے ۵۰۰ سے زیادہ بچوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی گنجائش ہے، یہ اسکول پیمبروک شائر

میں مختلف النوع (کثیر الفروع) اور مستقل ثانوی تعلیم کے قیام و اہتمام کے پروگرام کا ایک جز و ہے۔ یہ ادارہ اس مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہے کہ اپنی روایاتی اقدار بھی باقی رہ سکیں اور پورے علاقے کی صحیح خدمت بھی ہو سکے۔ سر بن بوین ٹامس (SIR BEN BOWENTHOMAS) نے مقامی تعلیمی حکومت کے اس اقدام کی تعریف کی ہے کہ اس نے ہیور فورڈ ویسٹ گریمر اسکول کے اہتمام و انتظام کا فیصلہ کر لیا ہے انہوں نے ہیورفرڈ ویسٹ کے لئے ثانوی گریمر ٹیکنیکی اسکول کا سنگ بنیاد بھی رکھا، یہ اسکول پم بروک ڈاک اسکول کا بدل ہوگا، اس اسکول میں سائنس اور زراعت کی تعلیم کا بندوبست ہوگا، اس ادارہ میں پم بروک شائر کے سینئر طلبہ اور پم بروک ڈاک اسکول کے طلبہ کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں گی۔

ہیورفورڈ ویسٹ میں تقریر کرتے ہوئے، سر بن ٹامس نے کہا۔ "وزارت معارف کی کوشش ہے کہ وہ ملک میں اچھی سے اچھی تعلیم گاہیں قائم کرے، کیوں کہ ان اداروں کے قیام میں جو سرمایہ لگایا جائے گا وہ ملک کی آئندہ بہبود کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ مگر اس رفتار ترقی کا انحصار وسائل و ذرائع اور سامان عمارت کی فراہمی پر ہے، ویلز کو موجودہ وسائل و ذرائع میں سے قابل قدر حصہ مل رہا ہے اور نئے نئے ابتدائی، ثانوی اور ٹیکنیکی مدارس کھولے جارہے ہیں، تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھوں ساتھ اسکولوں کی تعداد بھی بڑھتی رہے، لیکن وزارت کو تعمیرات کی رفتار ترقی سے بھی بہت کچھ واسطہ ہے، جنگ کے بعد ویلز میں ۴۵۰۰ نئے اسکولوں کے منصوبوں کا سامان فراہم کیا گیا، ان میں سے اب تک صرف ۱۸۰۰ اسکول تیار ہو سکے ہیں، حالاں کہ ۱۹۴۶ء سے ان کی تعمیر میں نہایت تیزی سے کام لیا جا رہا ہے لیکن پھر بھی یہ رفتار مجوزہ اعداد و شمار کو پورا نہیں کر سکی، مدرسوں کی وہ عمارتیں جو ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں شروع کی گئی ہیں، ان میں سے ۷۰۰ اور ۸۰۰ اسکول کی عمارتیں اب تک غیر مکمل ہیں، اور وزارت کی تجویز کے مطابق تیزی سے مکمل نہیں ہو رہی ہیں، مقامی تعلیمی حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنی عمارتوں کی تعمیر میں زیادہ عجلت سے کام لیں، یہی ایک صورت ہے کہ وہ وقت کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کا ساتھ دے سکتے ہیں۔"

یونی ورسٹی محاصل

انگلستان کی یونی ورسٹی گرانٹ کمیٹی نے جو رپورٹ شائع کی ہے، اس میں اسکاٹ لینڈ، انگلستان

اور ویلز کی یونی ورسٹیوں کا دل چسپ موازنہ موجود ہے، اسکاٹ لینڈ میں ہمہ وقتی جامعی طلبہ کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے اور انگلستان میں یہی تعداد برابر بڑھ رہی ہے، اور اگر دونوں ملکوں کی آبادی کا مقابلہ کیا جائے تو آج بھی اسکاٹ لینڈ میں طلبہ کی تعداد انگلستان کی نسبت زیادہ ہے، تعلیمی سال ۵۲-۱۹۵۱ء میں ہمہ وقتی طلبہ کی تعداد ۸۵۳۱۴ تھی جن میں سے ۱۶۰۰۱ طلبہ اسکاٹ لینڈ کی یونی ورسٹیوں کے ہیں آبادی کے لحاظ سے یہ تناسب بہت زیادہ ہے، ان میں سے ۱۲۰۱۰ لڑکے ہیں اور ۳۹۹۱ لڑکیاں۔ پچھلے سال کی نسبت اس سال ۷۹۹ لڑکوں اور ۸۱۲ لڑکیوں کی کمی ہو گئی ہے، اسکاٹ لینڈ کی مختلف یونی ورسٹیوں کے کلیوں (FACULTIES) کے اعداد و شمار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ۳۹ء۵ فی صدی طلبہ آرٹس میں ۲۵ء۴ طب میں، ۸ء۴ ٹکنالوجی میں، ۲۴ء۲ مجرد (PURE) سائنس میں، باقی ماندہ زراعت و بیطاری میں مساوی اعتبار سے منقسم ہوتے ہیں، مجرد اور مخلوط سائنس (PURE AND APPLIED SCIENCE) کی طرف طلبہ کی توجہ بہت زیادہ ہو رہی ہے، اور اگر رفتار یہی رہی تو کچھ دنوں میں طلبہ کی کثیر تعداد اس کلیہ میں جمع ہو جائے گی، آرٹس کے مضامین میں طلبہ کی مستقل کمی سے ابتدائی مدارس کے لئے اساتذہ کی کمی کا احتمال ہے، اور سائنس میں بڑھتی ہوئی تعداد اس کی کمی کو پورا نہیں کر سکے گی، جن کے پاس سائنس کی ڈگریاں ہوتی ہیں وہ بچوں کو ابتدائی مدارس میں پڑھانے کے لئے موزوں۔۔۔ نہیں ہوتے، ثانوی مدارس میں اساتذہ کے تقرر کے سلسلے میں یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ اسکاٹ لینڈ میں ۱۰۴۹ آنرز ڈگریاں حاصل کی گئی ہیں اور ۲۳۲۲ معمولی ڈگریاں، لیکن ان میں سے بیشتر ماہرین مضامین دوسرے پیشے اختیار کر لیتے ہیں، ریاضی اور سائنس کے بہت کم گریجویٹ ہیں جو پڑھانا پسند کرتے ہیں، ثانوی مدارس میں حالات اس قدر نازک ہو رہے ہیں کہ آگے چل کر یونی ورسٹی کو خود تعلیم یافتہ طلبہ کی کمی محسوس ہوگی جو ان کے مختلف شعبوں میں تحقیقی کام کرنے کے لئے آ سکیں۔ اسکاٹش یونی ورسٹیوں میں اسٹاف کی حالت بہت ہی بہتر ہے، برطانیہ عظمیٰ کے جامعی اساتذہ کی کل تعداد ۸۶۰۳ جن میں سے ۱۵۷۰ اسکاٹ لینڈ میں ہیں، طلبہ اور اساتذہ کی نسبت ۱ : ۱۰ ہے۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

زیڈ/۴/۳۸۹۷ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۱ء — چودھری عبدالستار بی اے پی ای ایس (دوم) ڈی آئی ایس منٹگمری، میاں رسول بخش، پی ای ایس دوم ریٹائرڈ کی جگہ حلقہ ملتان کے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز مقرر ہوئے۔ بمشاہرہ خود۔

م فدا حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ڈی۔ آئی۔ ایس شیخوپورہ۔ ڈی۔ آئی۔ ایس منٹگمری چودھری عبدالستار کی جگہ جو تبدیل ہو گئے ہیں۔ بمشاہرہ خود۔

م۔ ایم۔ آئی ربانی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس دوم، ڈی۔ آئی۔ ایس گوجرانوالہ۔ ڈی۔ آئی۔ ایس شیخوپورہ م فدا حسین کی جگہ جو تبدیل ہو گئے بمشاہرہ خود۔

م مشتاق احمد خان بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ڈی۔ آئی۔ ایس۔ گوجرانوالہ (رخصت پر) ڈی۔ آئی۔ ایس گوجرانوالہ اپنی رخصت کے اختتام پر۔ بمشاہرہ خود۔

ن/ض م ۳۷۹ — م۔ آئی۔ ایم علی اکبر۔ ایم۔ اے۔ ایس۔ اے۔ ڈی ر (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال (اٹک) م نذیر احمد قریشی۔ پی ای۔ ایس (دوم) کی جگہ جو ڈی۔ آئی۔ ایس مظفرگڑھ مقرر ہوئے۔

خواجہ محمد عبداللہ بی اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال ملک عبدالمجید بی اے۔ پی ای ایس کی جگہ ڈی۔ آئی۔ ایس کیمبل پور مقرر ہوئے (بمشاہرہ خود)

م۔ نذیر احمد طور (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ (گجرات) ایک خالی آسامی پر اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز راولپنڈی مقرر ہوئے (بمشاہرہ خود)

ن/م/۳۸۴۶ — ایس محمد یعقوب جعفری، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اکیڈمک ڈپ ان ایڈ (لندن) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول قصور، خواجہ محمد عبداللہ بی اے کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال (سیالکوٹ) مقرر ہوئے۔

م محمد صدیق ایم اے بی۔ ٹی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال۔ ایس یعقوب جعفری کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول قصور مقرر ہوئے (بمشاہرہ خود)

ایس بہادر علی شاہ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ م محمد صدیق کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال۔

م۔ امام بخش خاں بی اے ایس، اے، وی (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ ایک نئی آسامی پر، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رنگ پور (مظفرگڑھ)

چودھری غلام رسول بی اے، ایس اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس منٹگمری م امام بخش

کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ (اٹک)

ایس۔ ذوالفقار علی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ

م محمد نذیر حسین بی۔ ای۔ ایس (دوم) کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور (مظفر گڑھ) بمشاہرہ خود

م اللہ بخش۔ ایم۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں

(جہلم) ایس مصطفےٰ نقوی، بی۔ ای۔ ایس کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ۔ بمشاہرہ خود۔

م عبدالسلام انصاری (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مری۔ م اللہ بخش کی جگہ

ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں۔

ای/۶۵/۳۸۴ م۔ امیر الدین۔ بی۔ اے، بی، ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس کیمبل پور۔ ایک نئی آسامی

ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول فلہ۔ بمشاہرہ خود۔

م۔ الطاف علی خان۔ بی۔ اے۔ ایس، اے ڈی (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول

منڈھ ٹوانہ۔ م۔ نیاز احمد طور کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھالیہ (گجرات) بمشاہرہ خود۔

م۔ محمد اقبال۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے، ڈی۔ آئی۔ ایس شیخوپورہ۔ م۔ الطاف علی

جگہ۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول منڈھ ٹوانہ (شاہ پور)

چودھری محمد اقبال بی اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس۔ لائل پور۔ چودھری

علی اکبر ایم۔ اے کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال (اٹک)

ایس شمشیر علی شاہ، بی، اے، ایس، اے، وی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے، ڈی، آئی، ایس۔ لائل پور

ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول میاں والی۔ م محمد اسمٰعیل بی، ای، ایس کی جگہ جو ملازمت۔

سبکدوش ہو چکے ہیں (بمشاہرہ خود)

م رب نواز انصاری، بی، اے، ایس، اے، وی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے، ڈی، آئی۔ ایس۔ ملتان

ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ۔ م عبدالخالق کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے

(بمشاہرہ خود)

نمبر ۳۵۰۹۶ م۔ محمد مستقیم خان اسٹینو گرافر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور بمشاہرہ ۱۲۰ — ۸ — ۲۵۰ —

۱۵ نومبر ۱۹۵۲ء ۔ ۳۵۰ عارضی مستقل (۷ نومبر ۱۹۵۲ء) اسٹینو گرافر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور (دو سال آز

بمشاہرہ خود۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۵۲ء سے م۔ فتح محمد کی جگہ جو دفتر ڈی۔ پی۔ آئی پنجاب میں اسسٹنٹ

کے عہدے پر مستقل ہوئے۔ م محمد مستقیم ۷ نومبر ۱۹۵۲ء سے اپنے عہدے پر مستقل ہو۔

(م محمد مستقیم کا عارضی مستقل کا زمانہ آزمائشی زمانے میں شمار کیا جائے گا)

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

شمارہ ۱۱] لاهور [فروری ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

: بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ایم - اے - عزیز

تعلیمی ماہ نامہ
آموزش
لاہور
فروری ۱۹۵۳ء
سالانہ چندہ
جلد ـــــــــ ۵
شمارہ ـــــــــ ۱۱
پاکستان کے لئے ۶ روپے
غیر ممالک کے لئے ۸ روپے
قیمت فی پرچہ دس آنے
پبلشرز
یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور

تعلیمی مذاکرہ

۲۹ جنوری ۱۹۵۳ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور، یو۔ ایس۔ ایجوکیشن فاؤنڈیشن اور محکمۂ تعلیم پنجاب
کے زیرِ اہتمام سنٹرل ٹریننگ کالج میں سہ روزہ تعلیمی مذاکرہ شروع ہوا۔ موجودہ دور میں ایسے تعلیمی اجتماعات کی
ہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور پاکستان میں اس کی افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نظامِ تعلیم کی
ہیرِ نو اور تدریسی طریقوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے لئے اور تعلیم کو زندگی سے قریب تر لانے کے لئے ایسے
لیمی مذاکرے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں اور قوموں کے درمیان باہمی ربط اور تبادلۂ خیالات کا بہترین ذریعہ
ن سکتے ہیں۔

اس تعلیمی مذاکرے کا افتتاح عزت مآب سردار عبدالحمید دستی وزیر تعلیم پنجاب نے کیا، اپنی افتتاحی تقریر میں
پ نے فرمایا "عہدِ حاضر کے صنعتی، اقتصادی اور تجارتی فروغ نے انسان کی اخلاقی اقدار کو بالکل کچل ڈالا ہے آج
لیم کا سب سے اہم مقصد ایک ذہنی روحانی اور اخلاقی انقلاب لانا ہے، اگر تعلیم عام انسانی زندگی کے لئے مفید ثابت
ہوئی تو اس کی یہ ظاہری چمک دمک، ترقی پسندی کی شاہراہوں کو جگمگا نہیں سکے گی، اس وقت ہمارا سب سے
مقصد انہیں متضاد اور متنازع نظریات کو ہم آہنگ اور مربوط بنانا ہے، اس یکسانی اور مطابقت کے لئے
ج کل ان تعلیمی مذاکرات اور مباحثوں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے"۔

وزیر تعلیم نے ابتدائی تعلیم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اس وقت تک ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کی مہم
نہیں ہو سکی اور نہ ہمیں اس سلسلے میں کوئی خاص کامیابی حاصل ہوئی، مگر ہمیں امید ضرور ہے کہ آگے چل کر

ہم اپنی ان مشکلات پر بھی قابو پالیں گے، اس ملک میں تعلیم کو قومی استحکام اور قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ایک نمایاں حصہ لینا ہے تعلیم ہی لوگوں کو متمدن، مہذب اور فرض شناس بنا سکتی ہے، اور اس کا انحصار ان تین عوامل پر ہوگا ـــــ اخلاقی تعلیم جو انسان کے ذہنی اور اخلاقی افق کو وسیع کر سکے، وافر اور آزاد خیال تعلیم جو اس کی شخصیت کو متنوع بنا سکے، اور ایسی تعلیم جو اچھے راہ نما بننے کے لئے تکنیکی مہارت پیدا کر سکے ..... اگر بچوں کو اچھے مدرسین کے سپرد کر دیا جائے تو اس سے اچھے نتیجے کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب والدین بھی تعلیمی اداروں کے دوش بدوش بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیں"۔

اپنی تعارفی تقریر میں جناب ایس۔ ایم۔ شریف صاحب ناظم تعلیمات پنجاب نے فرمایا "مجھے بین الاقوامی تعلیمی ارتباط اور تعاون پر بہت بھروسا ہے اور یہی تعاون کار قوموں کی زندگی میں امن و آشتی اور ان کی عام فلاح کا علم بردار ہوگا، مجھے امید ہے کہ جو امریکی اساتذہ ہماری تعلیم گاہوں میں کام کر رہے ہیں۔ اپنے اس مختصر سے قیام کو کبھی نہیں بھولیں گے، اور یہاں سے رخصت ہونے کے بعد ہمارے خیرسگالی کے سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے، امریکہ اور پاکستان کے اس ثقافتی معاہدے کے نتائج نہایت خوش گوار ہوں گے، آج پاکستان کو ہر شعبۂ حیات میں چابک دست ماہروں کی ضرورت ہے، معدنی وسائل کو کام میں لانے کے لئے میکانکی زراعت کو فروغ دینے کے لئے پل اور نہریں بنانے کے لئے، اور یہ کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے، اس کے علاوہ تعلیم گاہوں اور سائنس کے تحقیقاتی اداروں میں بھی ایسے ماہرین کی ضرورت ہے جو نوجوانوں کو تربیت دے کر صبر آزما حالات میں بھی کام کرنے کا اہل بنا سکیں"

پروفیسر بشیر ہاشمی صاحب پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "ابتدائی اور ثانوی مدارس کے نصاب کو مرتب کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک جماعت ترتیب دی جائے جو اس کام میں مسلسل مشغول رہے۔ بچوں کی نفسیات اور تدریسی طریقوں کو بہتر بنانے کے لئے ایسے مراکز موجود نہیں ہیں، جہاں تعلیمی تحقیقات کا کام جاری کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں آپ نے اس کام کا تذکرہ بھی کیا جو سنٹرل ٹریننگ کالج اس سلسلے میں کر رہا ہے، آپ نے سنٹرل ٹریننگ کالج کو ایک ستر سالہ بوڑھے سے نہیں

بچے سے تشبیہ دی۔

آپ نے فرمایا کہ پرانی روایات کے لحاظ سے یہ کالج برصغیر کا دوسرا قدیم ادارہ ہے لیکن یہ ادارہ تعلیمی ترقی کے میدان میں ایسی خدمات انجام نہیں دے سکا جو اس کے شایانِ شان ہوتیں، اگرچہ حالات زیادہ سازگار نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ہم بارہ کے قریب کتابیں شائع کر چکے ہیں جن کی مجموعی ضخامت ۵ ہزار صفحات کے قریب ہوتی ہے، یہ کتابیں اپنے موضوع پر مستند کارنامے ہیں، آپ نے جناب وزیرِ تعلیم اور ناظم تعلیمات کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ اس کام کے لئے جو میرے شرکائے کار کر رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں۔ سنٹرل ٹریننگ کالج اور محکمۂ تعلیم پنجاب قوم کی تعلیمی تعمیر میں بڑا حصہ لے سکتے ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر گولڈ (DR. GOULD) پروفیسر تعلیمات سیراکیوز یونی ورسٹی (امریکہ) نے بھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، آپ کی رائے کے مطابق دورِ جدید میں تہذیب و انتشار دونوں میں تگ و دو جاری ہے۔ اس لئے دنیا کی ساری تعلیمی قوتوں کو "احترامِ آدمیت" کا احساس دلانے کے لئے مصروفِ کار ہو جانا چاہیئے۔"

اسی دن سہ پہر کی نشست میں حسبِ ذیل موضوع پر تعلیمی مباحثہ (SYMPOSIUM) ہوا۔ "تعلیم کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا"

پہلے موضوع کے سلسلے میں پروفیسر بشیر ہاشمی، پروفیسر انگلش (فل برائٹ اسکیم لکچرر) اور تعلیم و تعلم سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے حضرات نے حصہ لیا، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب اسپیکر مجلس قانون ساز پنجاب نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ پروفیسر ہاشمی نے پنجاب کی تعلیمی ضروریات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہماری سب سے اہم ضرورت پنجاب میں تعلیم کو فروغ دینا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہمیں مزید مدرسوں، عمارتوں، کتابوں اور دوسرے تعلیمی لوازمات کی ضرورت ہوگی، اگر ابتدائی مدارس میں اسکول جانے والے لڑکوں کی پوری تعداد داخل ہو جائے تو ۲۴ روپیہ فی کس اخراجات کے لحاظ سے سالانہ اخراجات کا تخمینہ ۳۲۰ و ۴۸ و ۱۴ و ۵ روپے ہوگا۔ اور اس وقت صرف ۲۰۹ و ۸۷ و ۱۷ و ۱ روپے خرچ کئے

تے ہیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۳ روپے فی کس تعلیمی سیس (CESS) لگایا جائے "

پروفیسر انگلش نے اپنی تقریر میں بچوں کی شخصیت اور ان کے کردار کی تعمیر و تشکیل پر زور دیا۔

ان دونوں حضرات کی تقریر کے بعد اعتراضات اور جوابی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں حاضرین نے نہایت دلچسپی لی، اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے فرمایا کہ تعلیمی سیس فی کس لگانا موزوں نہیں ہوگا بلکہ مال گذاری اور انکم ٹیکس کے پیش نظر فی روپیہ کچھ ٹیکس لگایا جائے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اب تک انگریزوں کے قائم کردہ نظام میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے، برطانوی عہد میں ہمارے نظام تعلیم نے استعماری حکومت کو چلانے کے لئے کل پرزے پیدا کئے، لیکن آج ہمارے لئے تعلیم کا مقصد کچھ اور ہے، یوں تو تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی آوازیں ہر طرف سے اُٹھ رہی ہیں، مگر اب تک کوئی ایسی تجویز مرتب نہیں کی گئی جو ملک کے موجودہ تقاضوں کو پورا کر سکتی ہو۔

دوسرے دن ۔۔۔۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۳ء کو دو اجتماعات (FORUMS) میں حسب ذیل موضوعات پر مباحثے ہوئے۔

"تعلیم میں عوام اور حکومت کا حصّہ"

"تعلیم میں گھر اور سماج کا پارٹ"

ان دونوں موضوعات پر تقریریں اور مباحثے ہوئے، ڈاکٹر ایوینگ (DR. EWING) پرنسپل، ایف، سی۔ کالج، لاہور نے اپنی تقریر میں کہا: "اس وقت ہمارے سامنے دو مختلف نظام تعلیم کے نمونے موجود ہیں جرمنی میں تعلیم کی براہ راست ذمہ دار حکومت ہوتی ہے اور اس کے برعکس انگلستان اور امریکہ میں حکومت کے دوش بدوش عوامی ادارے بھی تعلیم کی اشاعت میں حصّہ لے رہے ہیں، ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس ملک کے لئے اور فلاح کے لئے کون سا نظام مناسب اور قابل عمل ہے۔"

۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو موضوع بحث تھا ۔۔۔۔ "تعلیم کون دے اور کون لے" (EDUCATION BY WHOM AND FOR WHOM) ڈاکٹر آرتھر ٹرکرسٹ (DR. ARTHUR TERKEURST) سنٹرل مسوری اسٹیٹ کالج (امریکہ) کے شعبۂ تعلیم کے صدر نے جمہوری تعلیم کو عہد حاضر کے لئے اہم اور ضروری قرار دیا، ان کے

خیال میں پچھلی عالمگیر جنگ شروع ہونے سے پہلے جو طریق تعلیم جرمنی میں رائج تھا اور جس میں نسلی تفاخر اور رنگ و نسب کے امتیاز کی تعلیم دی جاتی تھی، فی الواقع دنیاوی امن کے قیام کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکا، اس طریق تعلیم سے بچنا عام انسانی فلاح کے لئے نہایت ضروری ہے۔"

ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین نے موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہا۔ "اساتذہ کی موجودہ سقیم حالت کی زیادہ ذمہ داری پرانے حکمرانوں پر عائد کی جا سکتی ہے، ان کے سامنے تعلیم کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ اساتذہ میں ذہنی اور اخلاقی بیداری پیدا نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ ان کی ذہنی اور اخلاقی بیداری پر ہی قوم کی بیداری کا انحصار ہے اور انھیں عوام کو بیدار کرنا مقصود نہیں تھا۔"

پروفیسر ہاشمی کی رائے میں "اگر حکومت کے دوسرے شعبوں میں تنخواہوں کے اسکیل اور مدرسین کی تنخواہوں کے اسکیل کا مقابلہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مدرسین کی تنخواہ اتنی کم نہیں ہے۔ انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو مفلوج اور کمتر تصور کر لیا ہے اور جب تک وہ خود ہی اس جذبہ کہتری کو ختم نہیں کریں گے انھیں سماج میں کوئی اونچا مقام حاصل نہیں ہو سکے گا۔"

ان مباحث میں ملک کے سرآوردہ ماہرین تعلیم، پروفیسروں، انسپکٹروں اور ہیڈ ماسٹروں نے حصہ لیا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں کام کرنے والے فل برائٹ لیکچررز کے علاوہ ڈاکٹر سنگ لیٹری DR. SINGLE-ATRY اور ڈاکٹر ڈکرسٹ جیسے امریکی ماہرین بھی ان مباحثوں میں شریک ہوئے، ہم انشاء اللہ آئندہ نمبروں میں ان تقریروں اور مقالوں کو شائع کرتے رہیں گے۔

درسی کُتب کا مَسئلہ

فضل احمد

درسی کتاب کو عمل تدریس کا ایک کارگر ذریعہ شمار کیا جاتا ہے، اور اس کی یہ حیثیت تاریخ کے ہر دو
قائم رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ درسی کتاب میں کوئی خاص جادو بھرا ہوتا ہے جو تمام مخالف اثر
کو مٹا کر طالب علم کے ذہن کو مطلوبہ سانچے میں ڈھال دیتا ہے تعلیم میں دوسرے طاقتور عوامل بھی
ہیں۔ مثلاً استاد کی شخصیت، معاشری ماحول اور ماخذی مواد ان تینوں سے ہر ایک اس قدر طاقت
سکتا ہے کہ درسی کتاب کو بے اثر بنا دے۔ مثلاً اگر ایک استاد پختہ مذہبی عقائد کا مالک ہے تو درسی کتا
میں خواہ لامذہبیت کا پرچار کیا گیا ہو وہ اس کے مخالف دلائل کو بھی اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید کے لئے استعم
لے گا، اسی طرح اگر درسی کتاب جمہوریت کی روح سے لبریز ہے، مگر طالب علم گردوپیش کی زندگی میں
نظام کی مٹی پلید ہوتے دیکھتا ہے تو قدرتی طور پر اسے درسی کتاب کی تعلیمات سے نفرت ہونے لگے گی
طرح اگر طلبہ اپنے طور پر کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ کتابیں ایسی ہیں جو درسی کتاب
سے ٹکراتی ہیں تو قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ درسی کتاب کی طرف سے بدظن ہونے لگیں گے۔

بایں ہمہ درسی کتاب کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں، ایسے استاد بہت کم ہیں جو درسی کتاب کو غیر
بنا دیں اور اسی طرح ایسے طلبہ بہت کم ہیں جو معاشری ماحول کا گہری نگاہ سے مطالعہ کریں۔ یا کتب
پوری طرح فائدہ اٹھالیں، عام حالات میں درسی کتاب استاد اور طلبہ ہر دو کا راستہ [illegible] کر دیتی ہے
مندرجات اور اس کا طریق بحث دونوں تعلیم پر بہت کچھ اثر انداز ہوتے ہیں، ایسی صورت میں د

کو اس کے حال پر چھوڑ دینا کسی طرح جائز نہیں، اس کی تدوین خاص احتیاط سے ہونی چاہیے، اور چونکہ انسانی علوم کوئی بالا شے نہیں اس لئے ہر ابھی سے ابھی درسی کتاب پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی بھی ہوتی رہنی چاہیے اگر اس دوسری احتیاط سے کام نہیں لیا جائے گا تو نتیجہ وہی ہوگا جو ہمارے درس نظامی کی کتابوں سے برآمد ہوا۔ ہمارے نام نہاد مولویوں میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو زمین کو ساکن اور سورج کو گھومتا ہوا مانتے ہیں اور جنہیں مطلق یہ خبر نہیں کہ بٹالمی کا یہ نظریہ مدتوں سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور اسلامی تعلیمات کو نہ اس قدیم یونانی نظریئے کے ساتھ کچھ واسطہ ہے اور نہ جدید نظریئے کے ساتھ کوئی ٹکراؤ، لیکن چوں کہ متقدمین میں سے بڑے بڑے عالم قدرتی طور پر قدیم نظریئے کے حامی تھے، اس لئے ان نام نہاد علماء کے نزدیک یہ نظریہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے خلاف ایک لفظ منہ سے نکالنا گمراہی ہے۔ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا گویا جہالت اور خود فریبی کو دعوت دینا ہے اور اس کے نتائج بدترین قومی ادبار کی صورت میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔

درسی کتاب جس طرح جہالت اور خود فریبی کا شکار ہو سکتی ہے، اس کی بدترین مثال خود ہماری قومی زندگی میں موجود ہے، ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمان اپنی درسی کتب کو تازہ ترین معلومات کا ذخیرہ بنانے کے لئے شرق و غرب کی حکمت کا ہر نکتہ ان میں شامل کرنے کے لئے بے قرار رہا کرتے تھے۔ یا ایک زمانہ وہ آیا کہ قوم نے یہ فرض کر لیا کہ علمی ترقی کی سب منزلیں ہمارے باپ دادا طے کر گئے، اب ہمارے لئے بس اسی قدر کافی ہے کہ ان کے نقش قدم سے چمٹے رہیں اور اس سے بال برابر اِدھر اُدھر ہونے کی ہر کوشش کو گمراہی سے تعبیر کریں۔ درسی کتابوں پر ظلم کرنے کی ایک اور صورت بھی ہے اور وہ ہے انہیں جان بوجھ کر ناپسندیدہ خیالات سے خالی رکھنا، اس دوسری صورت میں قوت متحرکہ جہالت نہیں بلکہ عیّاری ہوا کرتی ہے، نازی جرمنی میں بے شمار درسی کتابیں محض اس لئے جلادی گئی تھیں کہ وہ نازی نقطۂ نگاہ سے قابل اعتراض تھیں، ان کی جگہ ایسی درسی کتابوں نے لی جن میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا، یہی حال اٹلی اور جاپان کا تھا۔ جاپان میں امریکی قبضہ سے پہلے درسی کتابوں کی تیاری کا اجارہ حکومت کے ہاتھ میں تھا، پہلی صورت اگر عقل و خرد کو کند کر دینے والی ہے تو یہ دوسری صورت دیوانگی کو دعوت دینے والی، فسطائی ملکوں نے اپنی درسی کتابوں ہی کی مدد سے نئی پود کے رگ و ریشے میں ایک ایسا بھڑکتا ہوا جنون بھر دیا تھا جو بالآخر خود ان ملکوں کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ اور جس کی بدولت دنیا بھی طرح طرح کی

پریشانیوں اور تباہیوں کا شکار ہوئیں۔

غرض درسی کتاب کا حقیقی فرض یہ ہے کہ اپنے مخصوص علمی میدان میں تازہ ترین واقفیت کو بالکل بے لاگ رنگ میں پیش کردے، اگر وہ جہالت یا اندھے تعصب کی بنا پر نئے خیالات کو درخور اعتنا نہ سمجھے گی یا ایک مخصوص قسم کے خیالات کو نظرانداز کردے گی تو نتیجہ ہر حال میں افسوسناک ہوگا کیوں کہ پہلی صورت میں ایک ایسا ذہنی جمود پیدا ہو جائے گا جو ترقی کے تمام راستوں کو بند کردے گا۔ اور دوسری صورت میں خیالات کا محاسبہ بہت جلد انسانوں کی تعذیب کی شکل اختیار کرلے گا، اور صحت مند ذہنی فضا ختم ہو جائے گی۔

ایک نیا خطرہ

جمہوری نظام کی ایک بہت بڑی خوبی اس کی رواداری اور فراخ دلی ہے، وہ کسی کے منہ میں لگام دیکھ غیرپسندیدہ خیالات کا گلا نہیں گھونٹ دینا چاہتا، بلکہ اس کے ہاں مخالف و موافق ہر قسم کی آواز کے لئے جگہ موجود ہے، ماضی میں انگریزی جمہوری نظام نے ایک ضمن میں ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے، کارل مارکس اگرچہ ایک جرمنی یہودی تھا مگر نظام سرمایہ داری کے خلاف اس کی معرکتہ الآرا تصانیف برطانیہ میں ہی مرتب اور شائع ہوئیں لیکن آجکل جمہوریت کی یہ فراخدلی گھٹتی ہوئی نظر آتی ہے اور امریکہ میں یہ خطرہ خاص طور پر نمایاں ہے، امریکہ کی بعض ریاستوں میں آئے دن کئی کتابوں کے خلاف محض اس لئے ہنگامہ آرائی ہوتی ہے کہ وہ موجودہ معاشرتی نظام کو درہم برہم کردینے کا پرچار کرتی ہیں، چنانچہ کئی کتابیں محض اسی الزام کی بنا پر مردود قرار پا چکی ہیں لیکن جب اسی الزام کو اچھی طرح کرید کر دیکھا گیا تو عام طور پر یہی نظر آیا کہ کتاب میں بعض ایسے خیالات کی نمائندگی جو معترضین کے خیالات سے مختلف تھے، مثلاً انگریزی نظموں کی ایک کتاب پر محض اس لئے لے دے کی گئی کہ اس میں بعض اشتراکی شاعروں کا کلام موجود تھا، اس طرح تاریخ عالم کی ایک کتاب پر ناراضگی کا اظہار صرف اس لئے ہوا کہ اس میں مارکس لینن اور ٹراٹسکی کی تصویریں دی گئی تھیں، غرض معترضین کے اعتراض اکثر جذباتی قسم کے تھے، معاملے کا زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں نیویارک کی ریاست میں ایک کمیشن اس غرض سے قائم کیا گیا کہ درسی کتابوں کے متعلق اعتراضات کی چھان بین کرے، چنانچہ کمیشن نے اس امر کی اچھی طرح تشہیر کی کہ جس شہری کو کسی درسی کتاب کے خلاف کچھ کہنا ہو وہ اپنے دلائل لکھ کر کمیشن کے پاس بھیجے لیکن یہ امر بے حد حیرت انگیز ہے کہ چار ماہ گذر جانے تک کسی طرف سے کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔

جمہوری نظامِ زندگی فکری آزادی کا علمبردار ہے، لیکن محض نظری بنیادوں پر کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا، اُسے موثر صورت دینے کے لئے عملی اقدام بھی ضروری ہے، پس جمہوری ممالک محض اجتماعیت پسند ملکوں پر نکتہ چینی کرکے اپنا دامن پاک نہیں کر سکتے، اگر وہ بھی غیر پسندیدہ خیالات پر ایسی ہی کڑی نگرانی بٹھا دیں جیسے غیر جمہوری ممالک نے بٹھا رکھی ہے تو پھر صرف نام کے فرق سے دونوں نظاموں میں کچھ فرق باقی نہیں رہ جاتا، درسی کتابوں پر اعتراضات ہونے میں کچھ ہرج نہیں، لیکن ان اعتراضات کی چھان بین کا کام ماہرینِ تعلیم کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اگر اعتراضات فی الواقع تعلیمی نقطۂ نگاہ سے وزنی ہوں تو کتاب کی ترمیم و تجدید مناسب طور پر ہو جانی چاہیے ورنہ نہیں محض جذباتی ہنگامہ آرائی سے کسی آواز کو دبا دینا سراسر ایک غیر جمہوری فعل ہے جو تعلیم کی سچی روح کے سراسر منافی ہے

مختلف نقطہ ہائے نگاہ

دورِ حاضر میں مدرسہ کے ساتھ عوامی دلچسپی بہت کچھ بڑھ گئی ہے، اس کی کئی ایک وجوہ ہیں، جن کی تشریح میں جانے کی یہاں فرصت نہیں، تاہم یہ دلچسپی بذاتِ خود کوئی بُرا خیال نہیں، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جس طرح سیاسی امور میں عوام کے خیالات کو دیکھ سن کر ایک متوازی پالیسی مرتب کی جاتی ہے اور یہ کام عوامی جذبات کی گرمی سے نہیں بلکہ سیاسی تدبر کے ہاتھوں انجام پاتا ہے، اسی طرح درسی کتابوں کے بارے میں بھی ہر طبقہ کے خیالات معلوم ہو جانے چاہئیں۔ اور ان کے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کا کام ماہرینِ تعلیم کی ایک جماعت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ حال ہی میں امریکی رسالے "سیٹرڈے ریویو" نے اپنا ایک خاص نمبر مختلف طبقوں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے وقف کیا تھا، ذیل میں ان مختلف آراء کی ایک جھلک پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے مخصوص ملکی حالات پر بھی ایک نگاہ ڈالتے جائیں گے۔

۱۔ درسی کتب کے ناشر

امریکی ناشرانِ درسی کتب کی انجمن نے پہلے دن سے ہی یہ کُلیّہ تسلیم کر رکھا ہے کہ درسی کتابیں کبھی ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہو سکتیں، بازار میں کوئی ایسی درسی کتاب موجود نہیں جس پر اُستاد، تنقید نگار، افسرانِ تعلیم یا عوام میں سے کسی ایک کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سچ یہ ہے کہ ہم صحت مندانہ اور دیانتدارانہ تنقید کی بدولت ہی بہتر درسی کتابیں مہیا کرنے کی امید رکھتے ہیں مندرجہ بالا امید کوئی امیدِ موہوم نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں درسی کتابوں کا ناشر گاہک کو ہر لمحے

عوض کاغذ، طباعت اور تصاویر کی شکل میں جو مواد فراہم کرتا ہے اس کی مثال شاید دنیا بھر میں اور کسی جگہ نہ ملے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاروبار میں جس کڑی مسابقت کا دور دورہ ہے، وہ شاید کسی اور کاروبار میں نہیں، امریکہ میں کل کوئی پچاس کے قریب ناشر ایسے ہوں گے جو ملک بھر کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے لئے درسی کتابیں چھاپتے ہیں۔ سال بھر میں اس سارے کاروبار کی مجموعی مالیت دس کروڑ ڈالر سے کم ہی رہتی ہے، امریکہ جیسے ملک میں جہاں بڑے بڑے دیوہیکل تجارتی اداروں کی بھرمار ہے، اور جن میں سے بعض ایک ہفتہ میں اس سے زیادہ کا کاروبار کر لیتے ہیں، پچاس اداروں کا سال بھر اسی کاروبار میں سے مقدور بھر حصہ حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہنا ایک نہایت معنی خیز امر ہے، طباعت کے دوسرے شعبوں میں لوگ کئی گنا زیادہ کماتے ہیں اور مالی فائدہ کے ساتھ ہی ساتھ شہرت اور اثر و رسوخ بھی حاصل کرتے ہیں، لیکن درسی کتابوں کے ناشر نسبتاً قلیل معاوضہ پر ایک ایسی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں جو بے حد اہم ہے۔

ہر درسی کتابیں شائع کرنے والا ادارہ ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح درسی کتابوں کی افادیت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے، اس غرض کے لئے ان کے ہاں تحقیقی کام کرنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں جو کمرۂ جماعت کی جدید ترین ضرورتوں اور نئے تعلیمی نظریوں سے اچھی طرح باخبر رہتے ہیں پھر ان کے ایجنٹ جگہ جگہ گھوم کر حالات و کوائف کا جائزہ لیتے ہیں، ان تمام اطلاعات کی روشنی میں اچھے سے اچھے مصنفوں کو درسی کتابیں لکھنے کے لئے کہا جاتا ہے، اور اکثر اوقات طباعت سے پہلے صرف کتاب کی تدوین پر ۵ لاکھ ڈالر تک صرف ہو جاتے ہیں۔

درسی کتابیں لکھنے والے سنی سنائی باتوں یا دوسروں کی کتابوں پر بھروسہ کرنے کی بجائے ہر چیز خود اپنی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ جدید تقاضوں کے ساتھ اچھی طرح نباہ کیا جا سکے، اس کوشش میں طویل وقت اور ان تھک مساعی خرچ ہو جاتی ہیں، لیکن یہ سب کوششیں اکارت نہیں جاتیں، یہ درست ہے کہ بعض اوقات یہ لوگ غلطیاں بھی کر جاتے ہیں، اور یہ غلطیاں بعض دفعہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہوتی ہیں لیکن ان کی بنا ہمیشہ خلوص اور دیانتداری پر ہوتی ہے، یہ اسی چیز کا صدقہ ہے کہ آج امریکی درسی کتابوں کا معیار تیس برس پہلے سے بہت بلند ہے جس کی بدولت طلبہ نہ صرف حساب اور

دیگر مضامین کو جلد تر اخذ کر لیتے ہیں، بلکہ انہیں زیادہ دیر تک ذہن میں رکھ سکتے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں کیا کیفیت ہے؟ اوّل تو یہ کہ درسی کتابیں شائع کرنے والے کوئی مخصوص ناشر نہیں، ہر ناشر موقع ملنے پر ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی کتابیں چھاپنے لگتا ہے، یہاں تک کہ بعض ایسے ناشر جن کا مخصوص میدان مذہبی کتابیں شائع کرنا ہو وہ بھی بوقت ضرورت اس میدان میں آن دھمکتے ہیں، پنجاب میں مروجہ ضلع وار درسی کتابوں کے نظام نے بعض ایسے لوگوں کو بھی ناشروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، جو پہلے اس کام سے چنداں لگاؤ نہ رکھتے تھے، ان تمام باتوں کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہاں درسی کتب کا چھاپنا بجائے کم نفع بخش ہونے کے زیادہ نفع بخش تجارت ہے، اور ہر ناشر اس موقع کی تاک میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کوئی درسی کتاب ہاتھ لگ جائے۔ پنجاب کے مروجہ نظام نے اس خرابی کو اور ہوا دی ہے، کیوں کہ گو اس سے درسی کتاب کے مندرجات کے متعلق تو یہ یقین ہو سکتا ہے کہ وہ معیاری ہوں گے، لیکن اس کے کاغذ اور طباعت کا معاملہ کلی طور پر ناشر کے رحم پر رہ جاتا ہے، چونکہ معاملہ مفقود ہو جاتا ہے اس لئے کئی ناشر اپنی جیب کو زیادہ سے زیادہ بھرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، مثلاً کتابت۔ طباعت اور کاغذ وغیرہ پر کم از کم دام خرچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح اچھی تصاویر اور جلد بندی کے معاملے میں بھی کفایت کی انتہائی حدود مدِ نظر رہتی ہیں، گویا اچھی سے اچھی درسی کتاب کو عوام کے سامنے پیش کرنے میں جو پیشہ ورانہ فخر ہونا چاہیئے، اس کا احساس عام طور پر ناپید ہے اور ذاتی نفع اندوزی کے سوا اور کوئی شے پیش نظر نہیں

یہاں تک تو کتاب کے ظاہری محاسن کا ذکر تھا، لیکن اس کی معنوی خوبی کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی ثانوی کتب کے بارے میں جہاں ابھی تک محکمہ کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ناشران کتب سستے سے سستا مصنف تلاش کرتے ہیں، تقسیم ملک کے بعد یار لوگوں نے اکثر ہندو مصنفوں کی کتابوں کو مال غنیمت سمجھ کر۔ صرف نام کی تبدیلی کے ساتھ چھاپ لیا۔ اور اگر کہیں مصنف کی تلاش ہوئی بھی تو کسی ابتدائی یا ثانوی مدرسہ کے ضرورت مند مدرس سے کوڑیوں پر کوئی مسودہ تحریر لیا اور اس کا نام ظاہر کئے بغیر اپنی جانب سے شائع کر دیا، یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے

کہ ترقی یافتہ ممالک میں درسی کتاب مصنف کے نام پر بکتی ہے، کتاب کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بک جانے پر بھی بہت کم لوگ ناشر کے نام سے واقف ہوتے ہیں، ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اکثر کتابوں پر مصنف کا نام سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ اور جن پر ہو بھی وہاں بھی ناشر کا نام مصنف کے نام کی نسبت زیادہ نمایاں ہوگا

ان افسوسناک صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ درسی کتب کی طباعت عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کی بجائے ناشروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، اور جب تک یہ صورت حال باقی ہے اس وقت تک یہ امید کرنا عبث ہے کہ درسی کتابیں اس حقیقی تعلیمی مقصد کو پورا کریں گی جس کے لئے انہیں لکھا جاتا ہے، گویا ترقی یافتہ ملکوں میں جو خدمت نجی ہاتھ دے رہے ہیں، اس کے لئے ہمارے ہاں حکومت کو ہی اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ نقاد و مبصر پہلے یہ ذکر گذر چکا ہے کہ بعض امریکی رسالے یا نام نہاد تعلیمی ادارے بعض درسی کتابوں کے خلاف محض اس بنا پر مہم شروع کر دیتے ہیں کہ ان میں امریکی نظریۂ حیات کی مخالفت کی گئی ہے، امریکہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا حامی ہے، اس کی ساری قومی زندگی کی تعمیر نجی کوشش اور غیر محدود مسابقت کی بنیادوں پر ہوئی ہے، یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ معاشری زندگی کے ان اصولوں کو عوام میں مقبولیت حاصل ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہونا چاہئے کہ قوم کے نونہالوں کو دوسرے معاشری نظاموں سے بے خبر رکھا جائے، چنانچہ بعض فاضل امریکی پروفیسر اپنی کتابوں میں امریکی معاشری نظام کی خرابیاں اور اشتراکی نظام کی اچھائیاں بھی بیان کر دیتے ہیں، بعض تنگ نظر گروہ اس بات کی آڑ میں ان کتابوں کے خلاف عوام کو بھڑکا کر انہیں نصاب سے خارج کرانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر ان لوگوں کی رائے پر عمل کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جمہوریت کے علم بردار امریکہ میں بھی خیالات پر بالکل اسی طرح پابندی ہے جس طرح اشتراکی روس میں، چنانچہ اب اکثر امریکی ریاستوں میں درسی کتابوں کے متعلق شکایات کو سننے اور ان کی چھان بین کرنے کا کام ایک کمیشن کو سونپا جا چکا ہے جو ماہرین تعلیم پر مشتمل ہے، یہ کمیشن درسی کتابوں کی موزوں ترمیم و تجدید کے نگران ہیں۔

ہمارے ہاں درسی کتابوں پر نقد و تبصرہ کرنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام موجود نہیں، اول تو یہاں تعلیمی رسائل کا

بھی فقدان ہے اور جو چند ہیں بھی وہ بھی ان بے شمار درسی کتابوں پر تنقید کرنے کا اہتمام نہیں کر سکتے جو ہمارے مدارس
یں رائج ہیں، کسی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے نہ صرف فنی مہارت بلکہ موضوع کتاب کے علم سے پوری واقفیت بھی
ضروری ہوا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ ہمارے اخبارات و رسائل ان وسائل سے محروم ہیں، اس کمی کا ایک بڑا نقصان یہ
ہ درسی کتابیں بُری بھلی جیسی بھی رائج کر دی جائیں وہ جوں کی توں چلتی رہتی ہیں اور رائے عامہ کے لئے کوئی آ
پاس موجود نہیں جس کے راستے وہ ان کتابوں پر اثر انداز ہو سکے۔

۲- والدین حال میں ہی ایک امریکی مدرسے نے والدین، اساتذہ اور طلبہ کے نام ایک سوال نامہ جاری کیا تھا
جس میں ان سے مدرسی تعلیم کے مقاصد کی وضاحت طلب کی گئی تھی، جو جوابات موصول ہوئے ان
ں مقاصد تعلیم کو مندرجہ ذیل ترتیب سے جگہ دی گئی (۱) تعمیر کردار (۲) شہریت (۳) جمہوریت (۴) ضبط (۵) رفاقت
(۶) محنت کی عادت (۷) صحت اور حفاظت نفس (۸) قوت فیصلہ (۹) ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت (۱۰) درسی کتاب
علم (۱۱) قیادت کی صلاحیت (۱۲) صفائی ذہن۔

مندرجہ بالا ترتیب اکثریت کی پسند کی آئینہ دار ہے، یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کل ۳۸۶ والدین میں
، صرف چھ نے درسی کتاب کے علم کو پہلا درجہ دیا بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اسے مقاصد تعلیم میں شمار ہی نہیں
خود اساتذہ کا فتوٰی بھی والدین کے فیصلہ کا ہم نوا تھا یعنی انہوں نے درسی کتاب کی واقفیت کو کوئی بارھواں یا
سوال درجہ دیا۔ اس سوال نامے نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ امریکی والدین درسی کتاب کی بجائے بچے کو توجہ کا
بتلاتے ہیں، وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ بچے نے پسندیدہ اخلاق و اطوار کو کس حد تک اور کس کامیابی کے ساتھ اخذ
ہے، اگر وہ ان اخلاقی اور ذہنی اطوار سے عاری ہے تو درسی کتاب کا علم ان کے نزدیک بے معنی ہے، ایسا علم
دار کی نشوونما کرے کسی کام کا نہیں سمجھا جاتا، واقفیت ایک ضروری شے ہے، اس کے بغیر انسان دنیا میں کھویا
سوس کرے گا لیکن اس سے زیادہ ضروری وہ اوصاف ہیں جن کی بدولت یہ واقفیت مفید ثابت ہو سکتی ہے
اوصاف ناپید ہیں تو واقفیت محض ایک ذہنی بوجھ ہے جس سے حامل کو یا معاشرے کو کچھ فائدہ نہیں، پس اولیت
ں اوصاف کو حاصل ہے اور واقفیت کی حیثیت ثانوی ہے۔

ایک امریکی خاتون لکھتی ہیں کہ میں مقامی مدرسہ کی انجمن اساتذہ و والدین کی سرگرم کارکن ہوں، میرے دو بچے

تعلیم پاتے ہیں، میری سرگرمی کا نتیجہ یہ ہے کہ میں مدرسہ کی تعلیمی کارکردگی اس کے نصاب، اس کی درسی کتابوں غرضیکہ مدرسی زندگی کے ہر پہلو سے باخبر رہتی ہوں اور تعلیم کو بچوں کے لئے ایک از بس دلچسپ مشغلہ بنانے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی ہوں، وہ کہتی ہیں کہ آج سے کوئی پچیس سال پہلے جب میرا خاوند اس مدرسہ کا طالب علم تھا تو اس وقت حالات بالکل جداگانہ تھے، اس وقت درسی کتاب توجہ کا مرکز تھی، میرا شوہر بڑا ہوشیار اور ذہین طالب علم تھا مگر اس کے باوجود جب اسے یہ کہا گیا کہ گریجویٹ بننے کے لئے قدیم تاریخ کا مطالعہ لازمی ہے تو اس نے اس مطالعہ پر گریجویٹ نہ بننے کو ترجیح دی، حالانکہ اگر یہی شے اس کے سامنے انسان کی ارتقائی ترقی کی ایک منزل کے طور پر پیش کی جاتی تو وہ اسے بخوشی پڑھتا، کیوں کہ اس صورت میں یہ تاریخ اسے گردوپیش کی اشیا مثلاً طرز بود و باش، ذرائع آمدورفت طرز حکومت وغیرہ سے مربوط نظر آتی، آج امریکی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہی سنہرا اصول ہے، زندگی اصل مرکز ہے اور تمام علوم اس کے ساتھ مربوط ہیں۔ اساتذہ اور والدین کے تعاون نے اس مقصد کے حصول میں بڑی مدد دی ہے، یہ اسی چیز کا صدقہ ہے کہ آج میرے بچے پچیس برس پہلے کے طلبہ کی نسبت کہیں زیادہ ہوش مند چست و چوبند اور صاف ذہن ہیں۔

اس ضمن میں ہمارے ہاں جو کیفیت ہے اس کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے، والدین کی سب سے پہلی نگاہ مدرسہ کے نتائج کی طرف اٹھے گی اور پھر کسی دوسری شے کی طرف۔ آپ لاکھ سمجھائیں کہ اس مدرسے کی فضا اچھی نہیں، یہاں درسی کتابیں رٹوانے کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، مگر یہ دلیلیں سب بے کار ثابت ہوں گی، اگر والدین اچھے کھاتے پیتے ہیں تو وہ یونیورسٹی نتائج کے سوا کسی اور چیز کی طرف دھیان نہ دیں گے، اور اگر خدانخواستہ وہ غریب ہیں (جیسا کہ عام حالتوں میں ہوگا) تو ان کے لئے فیصلہ کن امر یہ ہے کہ فیس کا بوجھ سب سے ہلکا کس مدرسے میں ہے۔

جہاں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کی حالت یہ ہو وہاں یہ امید رکھنا عبث ہے کہ والدین بھی درسی کتابوں کی ترمیم میں کچھ ہاتھ بٹائیں گے، ہمارے ہاں والدین کی طرف سے درسی کتابوں کے متعلق اگر کبھی کوئی شکایت کی جائے گی تو یہ کہ وہ گراں ہیں، یا یہ کہ مدرسہ والوں نے ضروری درسی کتب کے علاوہ کچھ غیر ضروری امدادی کتابوں کا بوجھ بھی والدین پر لاد رکھا ہے، ترقی یافتہ ملکوں میں ایک ہی مضمون کے لئے دو دو تین تین درسی کتابیں

ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم بچے کی نگاہ میں کشادگی آئے اور وہ مطبوعہ لفظ کا غلام بن کر نہ رہ جائے، ہمارے ہاں یہ طریق ناممکن العمل ہے، جہاں والدین ایک کتاب کے خریدنے پر دوادیلا مچائیں وہاں کسی زائد کتاب کے لئے گنجائش کہاں؟

یہاں یہ سوال بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ کیا ہمارا افلاس فی الواقعہ اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ عام والدین سال بھر میں ایک بچے کو کوئی پندرہ بیس روپے کی کتابیں خرید کر نہیں دے سکتے، گو کوئی درست اعداد و شمار پیش نظر نہیں، لیکن یہ بات غالباً وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پرائمری درجہ تک کسی طالب علم کی کتابوں کا بچوں کا خرچ اوسطاً دو اڑھائی روپیہ ماہوار سے نہیں بڑھ سکتا، چوں کہ غریب والدین سے یہ توقع نہیں کہ سوائے بعض خاص حالتوں کے وہ بچوں کو پرائمری سے آگے تعلیم دیں گے، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا شاید غلط نہیں کہ جہاں تک عام تعلیمی اخراجات کا تعلق ہے ہماری ابتدائی تعلیم چنداں گراں نہیں۔ اس پر بھی اگر کچھ لوگ افلاس کا رونا روئیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ افلاس زیادہ تر ذہنی افلاس ہے، مادی افلاس نہیں، جو شہری والد اپنے بچے کو مہینے میں چند مرتبہ سینما گھر میں بھیجنے کا بوجھ اٹھا سکتا ہے یا جو دیہاتی والد کئی دن کے میلے ٹھیلوں میں بچے کو بھیج سکتا ہے، اس کے لئے تعلیم جیسی اہم مد پر ہر مہینے دو ایک روپے صرف کر دینا ہرگز شاق نہ گذرنا چاہیئے، لیکن چونکہ شاید تعلیم کو ضروری خیال ہی نہیں کیا جاتا، اس لئے اس پر ایک پیسہ خرچ کرنا بھی بہت سے لوگوں کو بوجھ معلوم ہوتا ہے۔

۴- اساتذہ ونیٹسکا کے سپرنٹنڈنٹ مدارس اپنے مشاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امریکی مدارس میں درسی کتابوں سے بالکل وہی خدمت لی جاتی ہے جو ایک کاریگر اپنے اوزاروں سے لیتا ہے، اوزار محض کاریگر کی سہولت کے لئے ہوتے ہیں۔ اور وہ انہیں مختلف حالات میں اپنے مخصوص ڈھب پر استعمال کرتا ہے، امریکی ناشروں نے تاریخ کے ہر دور میں تعلیمی دنیا کے جدید ترین مباحث پر کان لگائے رکھا ہے اور ان کی راہنمائی میں بہترین کتابیں پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی طبع شدہ کتابیں اپنے دور کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں، آجکل کے اکثر بالغ طبع شدہ لفظ کو بلا چون و چرا درست تسلیم کر لیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ناشروں کی

شائع کردہ درسی کتابیں ہی اخذ معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ تھیں لیکن جدید تعلیمی نظریہ یہ ہے کہ کم از کم ان علوم میں جن کا تعلق بعض ذہنی یا دستی مہارتوں سے ہو طلبہ کو اپنی رفتار پر چلنے کی اجازت ہونی چاہئے، مثلاً کوئی امر پسندیدہ ہے کہ استاد ایک ہی ساتھ تمام طلبہ کو حساب کا کوئی قاعدہ سکھا دے لیکن یہ شے نہ ہی ضروری ہے اور نہ ہی پسندیدہ کہ وہ سب کے سب یکساں رفتار سے اس میں عملی مہارت پیدا کرلیں بعض طلبہ یہ مہارت جلد حاصل کرلیں گے اور بعض کو اس غرض کے لئے خاصی لمبی مشق کی ضرورت پیش آئے گی بس ساری جماعت کو درسی کتاب کے ساتھ باندھ دینا گویا تیز رو اور سست رفتار جانوروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا ہے جو کہ تعلیمی طور پر یہ چیز سخت غیر پسندیدہ ہے اس لئے آجکل امریکی مدرسے صرف درسی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ہر مدرسہ کے اساتذہ اپنے طلبہ کے لئے مشقی کتابیں تیار کرتے ہیں جو درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ استعمال کرائی جاتی ہیں، ان کی مدد سے ہر طالب علم کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ درسی کتاب کی یکساں رفتار کی بجائے اپنی انفرادی رفتار پر گامزن رہے، حساب اور زبان دانی میں اس قسم کی مشقی کتابیں کئی سال سے استعمال ہو رہی ہیں۔

جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے اس طریق کار کی افادیت مسلم ہوتی جارہی ہے اور اس کا رواج بڑھ رہا ہے۔ ونیٹکا کے ۲۸ نفاجہائے مدرسہ کا سال میں جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ۱۲ انتظاموں میں درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ مشقی کتابیں بھی زیر استعمال ہیں اور درسی کتابوں کو عام طور پر امدادی اور حوالہ کی کتابوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

امریکہ کے اکثر ابتدائی مدارس اور بہت سے ادنیٰ ثانوی مدارس میں آجکل اکائی طریق تعلیم بہت مروج ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی جماعت کو بہت سے الگ الگ مضامین پڑھانے کی بجائے ان کی عام دلچسپی کو دیکھ کر زندگی میں سے کوئی ایک موضوع مطالعہ کے لئے چن لیا جاتا ہے، مثلاً پنجاب کے کسی مدرسہ میں ذریعہ آبپاشی کو بطور موضوع چن لیا جائے، اب اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ ہوگا اور اس مطالعہ میں جس قدر حساب، جغرافیہ، تاریخ اور زبان دانی کی ضرورت پیش آئے گی اس کا مطالعہ اسی کے ضمن میں کیا جائے گا، گویا یہ مضامین ایک عملی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پڑھے جائیں گے

نہیں خواہ مخواہ بچوں پر ٹھونسا نہیں جائے گا۔ اس طریق تعلیم کے نتائج بہت خوب برآمد ہوئے ہیں، لیکن
ں کے راستے میں بڑی رکاوٹ موزوں درسی کتابوں کی دست یابی ہے، موجودہ درسی کتابیں ایک مضمون
لیتی ہیں اور اس کے سارے پہلوؤں پر ایک منطقی تسلسل میں بحث کرتی ہیں، لیکن اکائی طریقۂ تعلیم میں اغلب
ہے کہ مضمون کے کسی خاص پہلو کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہی پیش آئے گی، ایسی صورت
ں سینکڑوں صفحوں پر مشتمل درسی کتابوں کا خریدنا غیر ضروری دکھائی دینے لگتا ہے، اس مشکل کے حل کرنے
ں ایک آسان عملی صورت یہ ہے کہ کتابیں جامع صورت میں لکھی جانے کی بجائے بہت سے چھوٹے چھوٹے حصول
ں لکھی جائیں اور ہر حصہ میں مضمون کے صرف ایک پہلو پر ہی بحث کی جائے، اگر ایسا ہو جائے تو درسی کتابیں
والے اور مدد کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

اکائی طریق تعلیم میں اساتذہ کی تیار کردہ مشقی کتابیں غیر ضروری نہیں ہو جاتیں، بلکہ ان کا مقام بدستور
اتی رہتا ہے، تاہم یہ مشقی کتابیں اسی صورت میں فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہیں کہ جو درسی کتابیں مدرسہ کے لئے
تخب کی جائیں ان کے انتخاب میں بھی استاد کی آواز کو کافی اثر حاصل ہو، اگرچہ صدر معلم، افسران تعلیم اور
الدین کے مشورہ کو بھی وزن دینا ضروری ہو گا، لیکن استاد کی رائے ہر حال میں زیادہ وزن رکھے گی، کیونکہ یہ اوزار
سی کو استعمال کرنا ہے۔

ہمارے اساتذہ درسی کتاب سے عموماً جس طرح کام لیتے ہیں اس کا حال کسی سے مخفی نہیں، کسی مدرسے
ں نکل جائیے: تاریخ، جغرافیہ، شہریت اور اس قسم کے دوسرے مضامین کی تدریس آپ کو کتاب خوانی کی شکل میں
ہوتی نظر آئے گی، افسوس یہ ہے جو استاد طریق بیان سے کام لیتے ہیں، ان کا ماخذ بھی اکثر حالتوں میں درسی کتاب
کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ایسے بے جان تدریسی طریقوں کی موجودگی میں "اکائی طریقۂ تعلیم" یا خود اساتذہ کی تیار کردہ مشقی کتابوں کا
سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، ہمارے ہاں اگر کوئی استاد صاحب بہت بڑا کمال کریں گے بھی تو یہ کہ اپنے مضمون
کا ایک خلاصہ ضبط تحریر میں لے آئیں گے جو سال بہ سال جماعت کو لکھا دیا جائے گا اور جو پاس ہونے کے لئے

ب شافی نسخہ بن جائے گا۔

جہاں خود استاد کی اپنی بددلی کا یہ حال ہو وہاں اگر کوئی اس کی آواز پر کان نہ دھرے تو اس میں کچھ تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہمارے ہاں درسی کتابوں کے انتخاب میں متعلقہ استاد کے مشورے کو ہمیشہ غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔ پرانے نظام کے ماتحت کتابوں کا انتخاب صدر معلم پر موقوف ہوتا تھا، جس ناشر یا کتب فروش نے اسے متاثر کر لیا اسی کی کتابیں لگ گئیں، اب مروجہ نظام میں مڈل جماعتوں تک کی کتابوں کا فیصلہ ہر ضلع کے لئے محکمہ کی طرف سے ہو جاتا ہے اور استاد سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہارے منہ میں بھی زبان ہے یا نہیں ؂

کس مپرسی پر ہماری کون روئے گا بھلا
حال اپنا آپ ہی ہم نے نہ جب پوچھا کبھی

قسط نمبر ۱

عراق میں لازمی تعلیم

محمد عبد العزیز

پس منظر

پہلی عالم گیر جنگ کے بعد خلافت آل عثمان کا خاتمہ ہوا اور عربوں کی افرنگ نوازی نے خود انھیں شام و عراق اور حجاز و فلسطین کی نئی جغرافیائی وحدتوں میں تقسیم کر دیا۔ بصرہ کی بندرگاہ اور نیل کے ...اثر سے انگریزوں کی دلچسپی کا آغاز ۱۹۱۴ء میں ہوا، دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ ۱۹۳۲ء تک براہ راست انگریزوں کے زیر اثر رہا، اسی کو عراق کہتے ہیں اس ملک کی وسعت ...۱۷۵ مربع میل ہے اس کے شمال میں پامیر کی سطح ...تع اور ترکی کردستان اور جنوب میں خلیج فارس واقع ہے، مغرب میں صحرائے عرب اور شام اور مشرق میں ایران۔

عراق کی موجودہ تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لئے اور لازمی تعلیم کے امکانات پر غور کرنے کے لئے اس کی پچھلی ...یخ کا حوالہ دینا اور اس کی موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کا تجزیہ کرنا ضروری ہے، اس ملک کے ساتھ ...ں کا شاندار ماضی وابستہ ہے، خلافت بنو عباس اور تاتاریوں کے عہد میں بغداد علم و فن، صنعت و حرفت اور ...ہذیب و تمدن کا مرکز تھا، سولھویں صدی مسیحی میں اس ملک میں ترکوں کا اثر و اقتدار بڑھتا رہا، یہاں کی ...شری زندگی میں اس کے نقوش آج بھی نمایاں ہیں، پہلی عالم گیر جنگ کے بعد سے یہاں برطانوی ...تعماریت نے براہ راست یا بالواسطہ اپنے قدم مضبوطی سے جمائے، کہنے کو تو عراق ۱۹۳۲ء سے آزاد ...لیا ہے لیکن اس کے تیل کے ذخائر اور بصرہ کی بندرگاہ اور اس کا ہوائی اڈہ آج بھی انگریزوں کے زیر اثر ...ایران سے انگریزوں کے انخلا کے بعد بعض سیاسی حلقوں کا یہ خیال تھا کہ عراق بھی غلامی کے طوق و ...اسل توڑنے میں کامیاب ہو جائے گا، موجودہ سیاسی بحران اور فوجی حکومت کا قیام، اندرونی بے چینی اور

سماجی انتشار کی نشان دہی ضرور کرتا ہے لیکن فی الحال اس سے کوئی نتیجہ مرتب ہوتا نظر نہیں آتا۔

کسی ملک کے تعلیمی نظام کو اس کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ عراق اس وقت تعمیر و ترقی کے دوراہے پر ہے۔ ایک طرف انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور دوسری طرف ملک کی سماجی اور تعلیمی زندگی کی تعمیر و استحکام کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے، عراق کا دستور نیم جمہوری ہے۔ بادشاہ کے اختیارات محدود ہیں۔ وزارت پارلیمان کو جواب دہ ہوتی ہے، موجودہ حکومت نے تعلیم پھیلانے کی بہت کوشش کی لیکن اس مساعی کے باوجود ابھی اکثریت جاہل ہے، جمہوری نظام کی کامیابی کے لیے عوام کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے، ورنہ ملک کی عنان اقتدار کا ایک مخصوص گروہ کے ہاتھوں میں چلا جانا یقینی ہوتا ہے اور جمہور حکومت اور اس کے نظم و نسق میں کوئی حصہ نہیں لے سکیں گے۔

عراق کی اقتصادی زندگی کا تمام تر انحصار زراعت پر ہے، اس ملک میں رہنے والوں کی زندگی، ان کے عادات و اطوار اور ان کی قومی زندگی میں ان کے اثرات نمایاں ہیں، اگرچہ ان دنوں تمباکو، صابن سازی سوت اور جوتوں کے کارخانے قائم ہو رہے ہیں، ان کارخانوں کی صنعتی ترقی اور جو مصنوعات ان میں تیار ہوتی ہیں، اس سے ملکی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، البتہ مٹی کے تیل کے کارخانے ضرور تیز رفتاری سے ترقی کر رہے ہیں تیل کی سالانہ پیداوار سے جو حق شاہی ملتا ہے اس سے ملک کی فوری اور اہم ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں، مگر پھر بھی ملک خالصتاً زراعتی ہے۔ اس لئے اس کے تعلیمی اور سماجی مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کی اس خصوصیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جب تک اس زرعی ماحول کو پیش نظر نہ رکھا جائے گا اس کے سماجی حالات کا اندازہ لگانا مشکل ہوگا، اس کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمان ہے، لیکن دوسرے مذاہب کے پیرو بھی یہاں کثیر تعداد میں موجود ہیں، ان میں سے ۹۳ فی صدی مسلمان ہیں ۳ فی صدی یہودی ۳ فی صدی نصرانی اور باقی مختلف عقائد و خیالات کے حامل، بظاہر علمائے فرنگ کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ عراق میں مختلف العقائد لوگ موجود ہیں جن کے نظریات اور طریق فکر و استدلال میں انتہائی مغائرت ہے لیکن اس کے باوجود عراق میں ایک مشترکہ تعلیمی نظام اور سماجی ہم آہنگی موجود ہے، یہ سب اسلامی اخوت اور مساوات کے کرشمے ہیں۔

ڈاکٹر کلارک ممبر یونیسکو لکھتا ہے۔

"باوجود شدید مذہبی اختلاف کے پبلک نظام تعلیم کا قیام، عراق کی مذہبی رواداری کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، مقامی آبادی کی فطری خوش اخلاقی، تواضع اور انکسار، محبت اور خلوص، کشادہ دلی اور مہمان نوازی سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ان کے ماحول اور کردار کے یہ نمایاں نقوش ایک ماہر تعلیم کے لئے سب سے زیادہ مفید مطلب ہوتے ہیں، ان سماجی خصوصیات کے علاوہ جو لوگ اونچی تعلیمی اقدار کے حامل ہیں ان میں غیر معمولی ذہنی چستی ترقی پا رہی ہے اور وہ تیزی سے منزل کی طرف قدم گذار ہو رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ سیاسی بصیرت رکھنے والے عراق کے مستقبل کے متعلق بہت بلند رائے رکھتے ہیں"

فی الحقیقت ذہنی اور سماجی لحاظ سے موجودہ عراق کو اپنی پچھلی ثقافت، کلچر اور علمی دولت کی ایک نہیں بیسیوں خصوصیات ورثے میں ملی ہیں، عباسیوں کے زریں عہد میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور علمی ترقی کے مرکز بننے کی سعادت عراق کے حصے میں آئی تھی اور صدیوں کے زوال کے باوجود ابھی ان میں ماضی کے جھلملاتے ہوئے نقوش کی جلوہ گری موجود ہے لیکن اس ثقافتی اور علمی ورثے کے باوجود آج عراق کی بیشتر آبادی جاہل ہے، وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی، امام ابوحنیفہ، امام غزالی اور سعدی جیسے مقتدر علماء کی تربیت گاہ آج خود محتاج تعلیم و تربیت ہے، اس کے صاف و شفاف چشمے، اس کے دریا، اس کی نہریں، مرغزاروں کی آبیاری سے تام معلوم ہوتی ہیں اور فطرت کے اس زرعی نظام کے باوجود، عراق کا معیار زندگی بہت پست ہے، اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کی کمی ہے، آبادی کے بیشتر حصہ کے لئے خوراک، تعلیم اور ذہنی بیداری کی ضرورت ہے، زرخیز زمین کی کثرت ہے مگر کاشت کے طریقے وہی پرانے ہیں، اس ملک کی ترقی کا انحصار بے کار زمین کو با کار بنانے اور زرعی سائنس کو زیر استعمال لانے میں ہے، اگر جدید ترقی یافتہ طریقوں کو بروئے کار لانے میں عجلت سے کام نہ لیا گیا تو اندیشہ ہے کہ ملک کی رفتار ترقی دھیمی ہو جائے گی۔

عراق کے تعلیمی منصوبے

ابتدائی تعلیم۔ عراق میں ابتدائی تعلیم کی اشاعت کا آغاز اتنا پرانا نہیں ہے صدیوں کا زوال اور روایاتی طریق زندگی، بالعموم قوموں میں اضمحلال تعطل اور جمود پیدا کر دیتا ہے، عراق کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، مدرسہ نظامیہ بغداد کا ماحول اور اس کی علمی قدریں

کچھ اور تھیں۔ اس دور میں تعلیم سماجی اور معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، مکتبوں میں وہی فرسودہ
نظامِ تعلیم جاری ہے، ان مکتبوں میں بچے نام نہاد مولویوں کی زیر نگرانی حروفِ تہجی سیکھتے ہیں اور پھر
کلامِ پاک کی مختلف آیات کو رٹتے رہتے ہیں اور یک سری آواز میں چھوٹے چھوٹے جملوں کو باربار دوہراتے
رہتے ہیں تعلیم و تدریس کی یہ نشانیاں اس ملک میں اب بھی پائی جاتی ہیں، یہاں جدید تعلیمی طریقوں سے کام
نہیں لیا جاتا، بچوں کی نفسیاتی تحلیل اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
عثمانی عہد میں ابتدائی تعلیم کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی گئی، اور ابتدائی تعلیم کا ایک مرکزی نظام انھیں کی سیا
میں قائم ہوا ۱۹۱۳ء میں ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد ۶۰۰ تھی، پہلی عالم گیر جنگ
انگریزوں کا اقتدار بڑھا اور عراق دولتِ عثمانیہ سے نکل کر برطانیہ کے زیرِ نگیں آگیا۔ انگریزوں کی اس عسکری
کامیابی سے جدید و قدیم کی ٹکر ہوئی، پرانی اور نئی تہذیب کے میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں نئی تعلیمی اور سما
سرگرمی شروع ہوگئی، ترکی زبان کی بجائے عربی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ یہ ایک خوش گوار تبدیلی تھی، اس
ایک فائدہ یہ ہوا کہ بچے اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق زبان کو جلد سیکھنے میں کامیاب ہونے لگے، عر
بولنے والوں کو ترکی زبان میں وہ مہارت جلد حاصل نہیں ہوسکتی تھی، اپنی زبان میں کہی ہوئی باتیں براہ
دل و دماغ پر اثر کرتی ہیں اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ابتدائی مدارس کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کی گئ
اس طرح ۱۹۲۱ء میں ۱۵۰۰۰ بچے پبلک ابتدائی مدرسوں میں پڑھنے جانے لگے، انگریز ایشیا
تعلیم کو فروغ دینے یا انھیں متمدن بنانے کے لئے نہیں آیا تھا، ہوس ملک گیری اور اپنے سیاسی اور اقتص
استحکام کے لئے آیا تھا جس طرح ہمارے یہاں وہ اسلامی تہذیب و تمدن اور علمی ثقافت کی تباہی کا موج
عراق بھی اس دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا، یہی وجہ ہے کہ جو تعلیمی نظام اس ملک میں رائج ہوا ا
مقصد تعلیم کی اشاعت نہیں تھا، انھیں تو محض خانہ پری کرنی تھی وہ کر دی گئی، ۱۹۲۵ء میں پہلی عراقی پارلیما
انعقاد ہوا، اور دراصل یہیں سے عراق میں ابتدائی تعلیم کو پھیلنے کا موقع ملا، ۱۹۳۱ء میں پبلک ابتدا
مدارس کی تعداد ۳۱۶ تھی اور ان میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ۲۵۰۰۰ کے لگ بھگ تھی، حتی کہ
میں عراق کی تعلیمی حالت بہت کافی سدھر چکی تھی وقت کے رجحان اور قومی ضروریات کے پیشِ نظر اس

مدارس کی تعداد ایک ہزار تھی اور ان مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد ۱۷۵۰۰۰ تھی۔ یہ ترقی فی الواقع قابل قدر ہے، اس سے عراق کے ملی شعور اور تحصیل علم کے جوش کا پتہ چلتا ہے۔

تعلیمی قانون مجریہ سنہ ۱۹۴۰ء کی رو سے عراق میں ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کہ مدرسوں میں داخل ہونے والے طلبہ کی عمر کم سے کم چھ سال ہوگی، یہ لازمی اور مفت تعلیم ان اضلاع میں جاری کی جائے گی جنھیں وزارت معارف منتخب کرے گی، لیکن اس تحریک کے اجرا کا دارومدار تعلیمی لوازمات کی فراہمی پر منحصر ہوگا، اس قانون کی رو سے جو والدین اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے میں مزاحمت کریں ان پر ۳ دینار جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں عراقی نظام تعلیم کسی حد تک منظم اور مضبوط ہو چکا تھا، اس کی ترتیب و تنظیم، طریق تدریس، نصاب اور مدارس کا نظم و نسق غیر منظم نہیں تھا، یہ نظام تعلیم براہ راست وزیر معارف کے زیر اہتمام ہوتا ہے اور نصاب تعلیم، آمدنی اور خرچ کا وہ خود ہی نگران ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم کی نگرانی کے لیے ایک ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور ہر صوبے میں علیحدہ علیحدہ صوبائی ناظمین ہوتے ہیں اور یہ صوبائی ناظم دراصل وزارت معارف کے نمائندہ ہوتے ہیں، مقامی حکومتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، یہ براہ راست مرکزی حکومت کے تابع ہوتے ہیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عراق کا نظام تعلیم مرکزی ہے اور ایسا مرکزی جس میں علاقائی اور صوبائی حکومتوں کو مداخلت کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ وزارت معارف کا صدر دفتر بغداد میں ہے۔

لازمی تعلیم کی موجودہ حالت | عراق میں لازمی اور مفت تعلیم کا قانون سنہ ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا لیکن، لازمی اور مفت تعلیم کا اب تک کوئی اہتمام نہیں ہو سکا اس میں اس ملک کی پس ماندگی اور اقتصادی مشکلات کو بھی دخل ہے، اس وقت ابتدائی مدارس میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد کا تخمینہ ۷۵۰۰۰۰ ہے لیکن ان میں سے صرف ۱۷۵۰۰۰ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، تعلیمی قانون مجریہ سنہ ۱۹۴۰ء کے فوراً بعد ہی لازمی اور مفت تعلیم کے منصوبے کو کامیاب بنانے کی کوشش کی گئی، مگر یہ منصوبہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکامیاب رہا، اس ناکامی کے کچھ وجوہ ہیں، اول یہ کہ والدین کی کثیر تعداد مفلس اور نادار ہے چھ سات سال کے بچے خاندان کے

استحکام میں بڑوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اس تھوڑے سے فائدے کے پیش نظر بچوں کو اسکول بھیجنے
بجائے کھیتوں اور گلوں میں کام کرانا زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے، دوم یہ کہ بیشتر خاندان نیم بدویانہ حالت
میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں، سوم یہ کہ ان علاقوں میں اساتذہ
کی رہائش کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، اس لئے بالعموم اساتذہ یہاں رہنا پسند نہیں کرتے، ان
سماجی اور اقتصادی اسباب سے قطع نظر مقامی عدالتیں بھی کسی قانون شکن کے خلاف اقدام کرنے سے
گریزاں رہیں، مقامی زمینداروں نے اس تحریک کو اپنے مفاد کے منافی سمجھا چناں چہ انھوں نے اس کی
مخالفت ہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر مقاطعہ بھی کیا۔

ان ناکامیوں کے باوجود روشن دماغ اور بالغ نظر عراقی اپنی اس کشت ویراں سے بالکل مایوس
نہیں ہوئے، انھیں معلوم ہے کہ مٹی زرخیز ہے صرف سازگار آب وہوا کی ضرورت ہے، تعلیمی ترقی کی راہ میں
جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں یہ وقتی ہیں، اگرچہ لازمی اور مفت تعلیم کے پھیلانے میں ملک کے موجودہ سیاسی
مالی اور اقتصادی عوامل بھی مانع ہیں، ایک منظم تعلیمی نظام کے لئے وقت، روپیہ اور موزوں حالات کی سب سے
زیادہ ضرورت ہوتی ہے، صرف قوانین کے نفاذ سے قوموں کی حالت میں تغیر پیدا نہیں ہوتا، تغیر قانون پر عمل
کرنے سے ہو سکتا ہے، اور عمل احساس کے بغیر ناممکن ہوتا ہے، بعض عراقی ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ایک
قلیل عرصے میں لازمی ابتدائی تعلیم کے نفاذ میں کامیابی ہو جائے گی، حالاں کہ اس احساس کے حاملین کی تعداد
بہت مختصر ہے، توقع کی جاتی ہے کہ قومی مقتضیات اور ملکی ضروریات، ان کے لئے ایک سازگار ماحول
پیدا کر سکیں گی، کیوں کہ تعلیم کی توسیع واشاعت ہی ملک کی فلاح وبہبود کی ضامن ہو سکتی ہے، اگر تعلیم کی
اشاعت میں بے توجہی کا یہی عالم رہا تو کسی معقول نتیجے کی امید نہیں کی جا سکتی، عراق دوسرے کم ترقی یافتہ
ممالک کی طرح جذبات واحساسات سے سرشار زندگی کی شاہ راہ پر گامزن منزل کی طرف برابر بڑھ رہا ہے، مالی
اور اقتصادی اعتبار سے بے مایہ سہی، لیکن افکار وخیالات میں جو انقلاب آرہا ہے، اسے ایک نئے نظام کے
قیام کا پیش خیمہ تصور کیا جا سکتا ہے، اس وقت قدیم اور جدید کی ٹکر اور زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے، عراق
مغربی ومشرقی رجحانات فکر کے اس دوراہے پر کھڑا ہے۔ ملک کی عام فلاح کس میں ہے؟ اور کس قسم کا تغیر

اس ملک میں بسنے والوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو اس کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں
خیالات کے اس بہتے ہوئے دھارے کو دیکھ کر ایک عراقی ماہر تعلیم نے کہا ہے تعلیمی جدوجہد کے آغاز کے لئے
موجودہ دور سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے"۔

لیکن تعلیمی جدوجہد کا جائزہ لینے سے پہلے اس کی تعلیمی ضروریات کا تجزیہ ضروری ہے موجودہ تعلیمی حالت
کیسی ہے اور موجودہ نظام ان ضروریات کو پورا کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ ان کامیابیوں اور ناکامیوں
کو معلوم کرنے کے بعد ہی ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کے پیش نظر لازمی اور مفت تعلیم کا صحیح
مقام متعین کیا جا سکتا ہے، ہمارے ملک کی تعلیمی حالت عراق سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے
کہ اخبار اور تعلیمی خرابیوں کے متعلق الٹے سیدھے بیانات سے اس درد کا مداوا کرنے کی کوشش کی جاتی
ہے لیکن حق یہ ہے کہ اس تعلیمی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے کے باوجود ہمارے ارباب حل و عقد
نے بھی کوئی مناسب قدم نہیں اٹھایا، عراق کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ دونوں ممالک کے
بنیادی مسائل کسی حد تک ایک ہیں، اختلاف ہے تو ماحول اور طریق بود و ماند کا۔

تعلیمی ضروریات

عراقی بچوں کو تعلیم کی ضرورت ہے اور ایسی تعلیم کی جو انہیں ان کی اپنی زبان، تاریخ
جغرافیہ اور حساب وغیرہ سے روشناس کرا سکے۔ لیکن صرف حروف شناسی اور
لکھنا پڑھنا ہی مفید نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں میں امعان نظر پیدا ہو سکے
اور ان کے کردار کی صحیح تربیت شخصیتوں کی تشکیل کے لئے اچھی تعلیم گاہوں کی ضرورت ہوتی ہے، عراق اپنی
اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے حسب مقدور بہت کچھ کر رہا ہے، عراق کی
موجودہ تعلیمی ضروریات یہ ہیں۔

(۱) شخصیتوں کی تربیت اور یہ احساس و شعور پیدا کرنا کہ تعلیم کا مقصد محض سرکاری ملازمتوں کا حصول نہیں ہے
بلکہ زندگی کی صحیح قدروں کو بروئے کار لانا ہے۔

(۲) جانوروں کے رکھ رکھاؤ کا قرینہ جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں اور کھیتوں میں کام کرتے ہیں، ان کے لئے جانو
کے رکھ رکھاؤ کا علم اور اس پر عمل کرنے کا سلیقہ ضروری ہے۔

(۳) صنعتی اداروں میں کام کرنے کے لئے تکنیکی مہارت۔
(۴) قومی استحکام کے لئے اچھے شہریوں کی تربیت۔

ان میں سے بعض خصوصیات تو اعلیٰ تعلیم کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں لیکن ابتدائی مدارس میں ذہنی اور بنیادی طور پر طلبہ کو وقت کے تقاضوں سے روشناس کرنا ہوگا۔ ان بنیادی تعلیمی ضروریات کے علاوہ عراق کی تمدنی، معاشرتی، سماجی اور اقتصادی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لئے کچھ ضروریات اور بھی ہیں، ان سے آنکھیں موند کر ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ ان میں سے پہلی ضرورت گاؤں میں تعلیم کی حقیقی اور عملی توسیع واشاعت ہے، اور ایک ایسے ملک میں جس کے مستقبل کا انحصار اس کی زرعی ترقی پر ہے، دیہاتی تعلیم کو معقولیت اور حقیقت سے قریب تر لانے میں ہی اس کے استحکام و بقا کا راز مضمر ہے ۱۹۳۲ء میں منرو کمیشن رپورٹ شائع ہوئی، اس میں زراعت کی سقیم حالت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ عراق اپنے فطری وسائل کو اب تک کام میں نہیں لا سکا، زراعت بحیثیت سائنس ایک جدید چیز ہے، یہاں اس سائنس سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، زراعت کے طریقے پرانے اور فرسودہ ہیں جو لوگ گاؤں میں رہتے ہیں اور ان کا سرمایۂ حیات یہی زراعت ہے، ہزاروں برس پرانے زرعی طریقوں پر قانع ہیں۔ اگر ان پرانے اور دور از کار طریقوں کی جگہ زرعی مشینوں سے کام لیا جائے تو ملک کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو جائے، لوگوں کا معیار زندگی بھی بلند ہو جائے اور دوسری سماجی اور اخلاقی بیماریاں بھی دور ہو جائیں لیکن ۱۹۳۲ء اور ۱۹۵۳ء میں کچھ اتنا فرق نہیں ہے، گاؤں میں تعلیم کی توسیع واشاعت کے پہلو بہ پہلو قبائلی علاقوں میں بھی تعلیم کی اتنی ہی ضرورت ہے جس ملک کی ۲۸ فی صدی آبادی نیم بدویانہ زندگی بسر کرتی ہے، ان کی تعلیمی ضروریات کو پورا کئے بغیر اس کے تعلیمی افق کو وسعت نہیں دی جا سکتی۔ منرو کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ان کی تعلیم و اصلاح کے متعلق بہت سے طریقے اور انھیں مستقل زرعی زندگی سے قریب لانے کے وسائل بیان کئے ہیں، دراصل ان کی تعلیم و اصلاح کے لئے ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے، جو تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کا بھی جذبہ رکھتے ہوں۔ رفتہ رفتہ مدرسوں کا قیام عمل میں آرہا ہے، یہی مدارس سماجی رجحانات اور تعلیم بالغان کے مراکز کا بھی کام دیں گے، جہاں سے علم کی روشنی

بن چھن کر تاریک اور غیر متمدن گوشوں کو بھی منور کر دے گی۔

تعلیمی نظام کی کامیابی تعلیمی اور سماجی ضروریات کی تشریح کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عراق کے موجودہ نظامِ تعلیم کو اپنے مقاصد کے حصول میں کس حد تک کامیابی ہوئی اس کے لئے عراق کے شہری اور دیہاتی اسکولوں کے نظامِ تعلیم اور طریقِ تدریس کا جائزہ لینا ہوگا۔

شہری ابتدائی اسکول:۔

ہر صوبے کے صدر مقام میں کثیر تعداد میں اسکول موجود ہیں۔ ہر اسکول میں ۳۰۰ سے لے کر ۵۰۰ بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، لڑکے اور لڑکیوں کے مدارس علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں، مذہبی اور سماجی لحاظ سے مخلوط تعلیم اچھی نہیں سمجھی جاتی، جماعتوں میں ۳۰ سے لے کر ۶۰ طلبہ ہوتے ہیں، سب سے کم تعداد چھٹی جماعت میں ہوتی ہے، عراق کے ان اسکولوں میں اب تک اچھی عمارتوں اور اچھے فرنیچر کی کمی ہے، روشنی کا انتظام بھی معقول نہیں ہوتا، اور اس کے گرد و پیش کا ماحول صاف ستھرا اور معیاری نہیں ہوتا بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بچوں کی ابتدائی جماعتوں میں ستر ستر بچے ہوتے ہیں اور ایک ڈیسک پر دو بچے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان ڈیسکوں کی ساخت بھی جدید تعلیمی معیار کے مطابق نہیں ہوتی۔

ابتدائی مدارس میں جماعتوں کے چھ مدارج ہوتے ہیں، بچے ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی پاتے رہتے ہیں، ان مدارس کے اہتمام کی ذمہ دار مرکزی حکومت ہوتی ہے کیوں کہ عراق میں اب تک تعلیمی تقسیم کا فقدان ہے، سال کے آخر میں امتحان ہوتا ہے اور اگر بچہ مقررہ معیار پر پورا اترتا ہے تو اسے اگلے درجے میں ترقی مل جاتی ہے، جو بچے امتحان میں ناکامیاب ہو جاتے ہیں انھیں مزید ایک سال اسی درجے میں رہنا پڑتا ہے، یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان مدارس کے اساتذہ بہت زیادہ محنت کرتے ہیں۔ بالعموم جماعت کے درمیان میں مدرس کھڑا ہو کر تقریری انداز میں یا سوال و جواب کی صورت میں بچوں کو درس دیتا ہے، اس طریقِ تدریس میں ایک خامی یہ ہے کہ اس میں بچوں کو بولنے کا کم موقع ملتا ہے اور جب بچوں کو سوچنے کا موقع نہ دیا جائے گا تو وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اگر عراقی اسکولوں کی اس خامی کا ہم اپنے مدارس کی تدریسی خامیوں سے مقابلہ کریں تو یہ

واضح ہو جائے گا کہ اگر اس سلسلے میں عراق پس ماندہ ہے تو ہم کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ تھوڑے سوالات و جوابات بچوں کو زندہ دل اور روشن دماغ نہیں بنا سکتے۔ انہیں تو ہر کام میں حصّہ لینا چاہئے۔ بچوں میں اپنے مسائل کو آپ حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا مدرسین کا اہم فرض ہے۔ صنعتی دست یا آرٹ کی تعلیم کا کوئی اہتمام نہیں، البتہ جسمانی تربیت کے سلسلے میں جو نصاب مقرر ہے وہ اپنی اسپرٹ میں دورِ جدید سے زیادہ قریب ہے۔

دیہاتی اسکول

دیہاتوں میں مدرسوں کی عمارتیں اور زیادہ خراب و خستہ حالت میں ہوتی ہیں، بالعموم ان مدرسوں میں تین کمرے ہوتے ہیں اور ہر کمرے میں ۲۰ سے لے کر ۔۔ طلبہ بیٹھتے ہیں اور جہاں تک روشنی اور صفائی کا تعلق ہے ان مدرسوں کی حالت شہری مدرسوں سے بھی گئی گذری ہے۔ شمالی صوبوں میں کچھ مدرسے پتھر کے بنائے گئے ہیں لیکن زیادہ تر کچی اینٹوں کی عمارتیں دیکھنے میں آتی ہیں اور جنوبی علاقے میں تو بالعموم چھوٹے چھوٹے جھونپڑے ہوتے ہیں جن میں بچے تعلیم و تربیت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ شہری اور دیہاتی اسکولوں کا نصاب تعلیم ایک ہی ہوتا ہے مگر اس میں خود حرکی طریق کا استعمال بالکل معدوم ہے۔ بچے بالعموم ڈیسکوں پر بیٹھے بیٹھے اپنا پورا وقت صرف کر دیتے ہیں بعض دیہاتی مدرسوں میں بچے اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکتے۔ پڑھنے والوں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ وزارت معارف اس علاقے میں کوئی اسکول نہیں کھول سکتی، ان اسکولوں میں مدرسے کا کوئی اپنا باغ نہیں ہوتا، نہ خوش نما پھولوں کی کیاریاں ہوتی ہیں اور نہ دل خوش کن روشنیں۔

لازمی تعلیم کی عدم موجودگی اور مدرسوں میں دیر سے داخلے کی وجہ سے بچوں کی عمروں میں بہت تفاوت ہوتا ہے، ایک ہی جماعت میں مختلف عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور اس میں شہری اور دیہاتی اسکول دونوں برابر کے شریک ہیں، مدرسین یہ کوشش ضرور کرتے رہتے ہیں کہ بڑے چھوٹے سبھی تعلیم سے بہرہ ور ہو سکیں، یہی وجہ ہے کہ چھوٹے اور بڑے بچے سبھی ہنسی خوشی ایک خاندان کی صورت میں کام کرتے نظر آتے ہیں، دوسری نمایاں خصوصیت ان مدارس کی یہ ہے کہ عراق میں سماجی امتیازات کا نام و نشان تک

یر دغریب مفلس و نادار سبھی ایک جگہ بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے کی تمیز کا سوال ہی
یدا نہیں ہوتا، اور یہ اسلامی اخوت و مساوات کی تعلیم ہے، وہ ذہنی طور پر اس امتیاز کا تصور بھی
ہیں کر سکتے۔

اس طرح عراق کی بہت سی تعلیمی اور سماجی ضروریات بقدر استطاعت پوری ہو رہی ہیں، ان میں سے
یہ ضروریات ایسی بھی ہیں جن پر ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی گئی لیکن عراق کا یہ کچھ کم شان دار کارنامہ
ہیں ہے کہ خس و خاشاک سے شروع کر کے اپنے وسائل و ذرائع کے مطابق ایک نظام تعلیم کے قیام میں
امیاب ہو گیا، حسب ذیل خاکے سے اس کی تعلیمی ضروریات اور ان کی تکمیل کا صحیح تصور مل جاتا ہے۔

عراق میں پبلک اور نجی مدارس

	مدرسوں کی تعداد		طلبہ کی تعداد				مدرسین کی تعداد	
	سرکاری	نجی	سرکاری		نجی		سرکاری	نجی
			لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں		
۱۹۱	۸۸	—	—	—	—	—	۴۸۵	—
۱۹	۳۱۶	—	۲۷۴۶۷	۷۰۴۶	—	—	۱۳۲۵	—
۱۹۱	۷۲۹	—	۶۹۵۰۵	۲۷۱۱۵	—	—	۳۱۴۹	—
۱۹	۷۱۳	۷۳	۶۴۲۴۰	۲۵۲۴۲	۱۳۸۷۲	۶۰۸۳	۳۳۰۴	۵۷۷
۱۹	۷۳۵	۷۶	۶۴۱۱۲	۲۶۶۸۲	۱۳۳۸۶	۶۱۶۱	۳۵۲۵	۶۰۸
۱۹	۷۶۱	۷۷	۶۳۴۴۱	۲۶۴۲۳	۱۲۸۲۳	۶۲۹۹	۳۷۵۲	۵۹۱
۱۹	۷۸۸	۷۷	۶۱۶۹۷	۲۵۷۴۸	۱۰۹۹۷	۷۰۰۸	۳۹۷۹	۵۳۲
۱۹	۸۶۱	۸۰	۶۷۲۹۷	۲۲۲۶۱	۱۲۲۵۶	۴۶۴۲	۴۳۴۴	۶۰۷
۱۹	۹۰۲	۸۱	۷۶۹۶۰	۲۴۰۱۷	۱۲۸۲۸	۷۰۵۹	۴۴۹۱	۶۰۷
۱۹	۹۴۴	۸۳	۹۰۴۱۹	۲۸۰۶۸	۱۳۶۹۳	۷۹۷۷	۴۷۷۹	۶۵۰

۱۹۴۶،۴۷	۹۴۷	۹۰	۹۸۵۴۰	۳۰۲۲۵	۱۴۱۳۶	۷۷۱۸	۴۹۷۰	۶۵۷
۱۹۴۷،۴۸	۱۰۱۶	۹۰	۱۰۶۹۰۴	۳۲۳۵۰	۱۵۳۱۸	۷۸۰۸	۵۴۱۷	۶۷۹
۱۹۴۸،۴۹	۱۰۴۴	۱۰۶	۱۱۴۶۶۹	۳۵۱۴۵	۱۶۹۹۸	۸۰۶۲	۵۷۳۳	۶۷۶

۱۹۴۹ء کے اختتام تک ابتدائی اسکولوں میں طلبہ کی تعداد ۰۰۰ ۱۷۵ تھی، اور ابتدائی جماعتوں میں پڑھنے والے بچوں کا تخمینہ کم سے کم ۰۰۰ ۷۵ ہے، جب باقی ۰۰۰ ۵۷۵ بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے تو لازمی ابتدائی تعلیم کے امکانات قوی ہو سکتے ہیں، ان اعداد و شمار سے یہ نہیں معلوم ہو سکے گا کہ ابتدائی مدرسوں میں پڑھنے والے بہت سے ایسے طلبہ بھی ہوتے ہیں جو اپنی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محض دو یا تین سال کی تعلیم کے بعد اپنے مدرسوں سے رخصت ہوتے ہیں، ۱۹۴۲ء میں عراق کے ایک ماہر تعلیم نے حکومت اور عوام کی توجہ اس قومی حادثے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔

«اپنی تعلیمی تگ و دو میں ابھی عراق اس منزل پر نہیں پہونچا کہ یہاں لازمی تعلیم کا قانون عملی صورت اختیار کر سکے، اس قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جو والدین کو مخصوص عمر کے بچوں کو اسکول بھیجنے کے لئے مجبور کر سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے بچے ابتدائی مدارس میں داخل ہی نہیں ہوتے اور جو داخل ہوتے ہیں ان میں سے بہت چھوٹی سی تعداد اپنی تعلیم مکمل کرتی ہے، زیادہ تر بچے درجہ اول سے لے کر درجہ ششم تک تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس سے وقت، محنت اور روپیہ دونوں برباد ہوتے ہیں»

ایک دوسرے عراقی ماہر تعلیم نے طلبہ کے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں وہ زیادہ واضح اور صحیح ہیں، ۱۹۳۰ء میں ۰۰۰ ۴۲ طلبہ ابتدائی مدرسوں میں داخل ہوئے، ان میں سے ۰۰۰ ۱۶ دوسری جماعت اور ۰۰۰ ۴ تیسری جماعت تک پہونچ سکے، تعداد یوں ہی گھٹتی رہی، یہاں تک کہ چھٹی جماعت میں صرف ۰۰۰ ۱ لڑکے داخل ہوئے، ۱۹۳۷ء میں ان ۰۰۰ ۱ لڑکوں میں سے آدھے سے کم ابتدائی تعلیم پوری کر سکے۔

تعداد میں اس کمی کی سب سے بڑی وجہ تعلیم کا نصابی اور غیر عملی ہونا ہے، کتابی تعلیم طلبہ کے لئے ان کی آئندہ زندگی میں اتنی مفید نہیں ہوتی اور اس تعلیم پر طلبہ کی آئندہ زندگی کا انحصار ہوتا ہے، اگر انھیں کچھ ایسی چیز

مہارت حاصل نہ ہوسکی کہ حصول تعلیم کے بعد وہ اپنی روزی بھی کما سکیں تو تعلیم کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے، تعلاکت اخلاق کو بھی پست کردیتی ہے، اس میں شک نہیں کہ عراق میں طلبہ کی تعداد اور مدرسوں کی تعداد میں روز روز اضافہ ہورہا ہے لیکن بچوں کی غیر مکمل تعلیم اس نظام کی ترقی میں مانع آتی ہے، اس ملک کی خوش قسمتی ہے کہ اب عوام بھی تعلیم کی ضرورت کو زیادہ سے زیادہ محسوس کررہے ہیں، بغداد اور دوسرے بڑے شہروں میں بہت سے ابتدائی مدرسوں کی عمارتیں چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ زیر استعمال آتی ہیں، اس سے تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، صوبائی ناظمین کی رپورٹ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ عمارت اور جگہ کی قلت کی وجہ سے بہت سے طلبہ داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں، جہاں تک قبائلی تعلیم کا تعلق ہے حالات کم وبیش وہی ہیں جو ۱۹۳۲ء میں منروکمیشن نے بیان کئے تھے مثلاً قبیلہ شمر کی آبادی تقریباً ساٹھ ہزار ہے لیکن ان کے یہاں کوئی مدرسہ موجود نہیں ہے۔

نصاب تعلیم اور طریق تدریس کے مطالعہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ابتدائی مدرسوں کا نصاب طلبہ کی استعداد سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے تعلیم کا انحصار زیادہ تر کتابوں پر ہوتا ہے، یا مکالمے کی صورت میں سوالاً جواباً تدریس ہوتی ہے، حسب ذیل پروگرام سے اس کا ایک واضح تصور سامنے آسکتا ہے۔

مضامین	درجہ اول	درجہ دوم	درجہ سوم	درجہ چہارم	درجہ پنجم	درجہ ششم
	ہفتہ وار اوقات					
مذہب اور قرآن کریم	۴	۲	۳	۳	۲	۲
عربی	۱۱	۱۲	۱۰	۱۰	۶	۶
انگریزی	-	-	-	-	۶	۶
حساب	۶	۶	۶	۶	۵	۵
خارجی اسباق اور حفظان صحت	۲	۲	۲	۲	۲	۲
جغرافیہ اور تاریخ	-	-	۲	۲	۴	۴
اخلاقیات اور شہریت	-	-	-	۱	۱	۱
ڈرائنگ اور دستکاری	۳	۳	۲	۴	۴	۴
موسیقی	۴	۳	۳	۲	۲	۲

یہ پروگرام بظاہر بہت ہی عمدہ اور اپنی ترتیب و تنظیم میں فاضلانہ اقدار کا حامل معلوم ہوتا ہے لیکن فی الواقع بچوں کے لئے مفید نہیں ہے، اگر اس کی تفصیلات کا پورا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں بچوں کے نئے "تعلم بالعمل" کا کوئی اہتمام نہیں اور ان کی روزمرہ کی ضروریات سے بھی آنکھیں بند کرلی گئی ہیں پڑھانے کا طریقہ رٹانا اور لکچر دینا ہے، بچوں کو خود سیکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تو ان میں خود اعتمادی اور عزت نفس کیسے پیدا ہوسکتی ہے، بعض مدرسوں میں انگریزی کی تدریس میں "ڈائرکٹ میتھڈ" استعمال کیا جاتا ہے لیکن دوسرے مضامین کی تدریس میں جدید تدریسی طریقوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی جاتی، اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ یہ مدارس خامیوں کا مجموعہ ہیں، ابتدائی مدرسوں میں کچھ اچھائیاں بھی ہیں، مدرسین میں بھی جوش و ولولہ اور کام کرنے کا جذبہ ہے، لیکن پھر بھی یہ مدرسے ابھی اس مقام پر نہیں پہونچے کہ کسی مہذب یا ترقی یافتہ ملک کے مدرسوں سے آنکھیں ملاسکیں، ابتدائی تعلیم کی ترقی میں وزارت معارف نے جو سب سے زیادہ نمایاں کام کیا ہے وہ کم سے کم وقت میں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی ہے۔ تربیتی اداروں سے جو مدرسین تربیت حاصل کرکے باہر نکلتے ہیں ان کی سالانہ تعداد ۵۷ ہوتی ہے، اس تعداد میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، مگر ان مدرسین کے تعلیمی پس منظر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کم سے کم آدھے ایسے ہیں جنہیں عمدہ ثانوی تعلیم بھی میسر نہیں آسکی ہے جو اپنی ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد تربیتی اداروں میں داخل ہوتے ہیں، وہ ایک سال تک کسی ثانوی اسکول سے متعلق تربیتی ادارے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، گاؤں کے اساتذہ کی تعلیم کے لئے علیحدہ کالج ہوتے ہیں؛

گذارشِ احوالِ واقعی

منظور احسن عباسی

میں کالا کلوٹا بھی تھا اور دُبلا پتلا بھی۔ اس ظاہری بے وجاہتی کے علاوہ مجھے اپنی کہتری کا احساس بھی تھا۔ کیونکہ میں نے بہت اعلیٰ تعلیم نہ پائی تھی اور نہ مجھ پہ ہنوز یہ روشن ہوا تھا کہ میں عام فراست سے بہرہ نہیں ہوں۔ میری عمر ابھی ۲۰ سال کی تھی کہ ایک ہائی اسکول میں بطور ہیڈ مولوی مامور ہوا۔ یہ میری پہلی ملازمت تھی اور یہی آخری بھی کیوں کہ یہ اسکول جو متحدہ پنجاب کے معیاری ہائی اسکولوں میں سے ایک تھا۔ بالآخر کالج بن گیا، مجھے اُس کالج میں معلّم فارسی کے طور پر منتخب کیا گیا، اور وہیں سے مُدّت ملازمت ختم کرنے کے بعد پنشن پہ ریٹائر ہو گیا تھا۔

مجھے ندامت اور مایوسی کا نہایت تکلیف دہ احساس سب سے پہلے اُس وقت ہُوا جب میں نے اپنی آغاز ملازمت کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنے بعض شاگردوں کو باہم یہ سرگوشی کرتے ہوئے سُنا۔

— "یہ جو لڑکا سا مولوی آیا ہے یہ ماسٹر...... کا مقابلہ کیا کر سکتا ہے"

— دوسرے نے کہا۔ "وہ تو پہلے ہی کہتے تھے کہ میرے بعد فارسی ختم سمجھو"

— تیسرا بولا۔ "اُس کو تو کچھ بھی نہیں آتا، میں تو کبھی اس کو سلام نہیں کرتا۔ اور نہ اس کے لئے کھڑا ہوتا ہوں"۔

یہ تیسرا لڑکا ایک طویل القامت نوجوان مسلمان تھا، میں اُس کے ان الفاظ سے نہایت محزون ہوا ہوں کہ اُس نے پہلی ملاقات میں محرم جو شانہ تپاک سے کام لیا تھا اور میرے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کا

اظہار بھی کیا تھا، لیکن اب وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟ میں اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن مجھے اس اندیشہ سے ایک مخفی اذیت محسوس ہو رہی تھی کہ میں شاید ایک لائق استاد نہیں ہوں، ورنہ لڑکے مجھے ایسا نہ کہتے، آخر وہ میرے دشمن تو نہیں ہیں؟ میں اُس معیارِ قابلیت کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا جو پیش رو اساتذہ نے ان کے سامنے پیش کیا۔ بہرحال ان حالات کا ذمہ دار لڑکوں کی بجائے خود اپنے تئیں سمجھتا رہا، یہاں تک کہ اس روز تمام رات میں اپنے نقائص کی جستجو میں ہی لگا رہا۔

اگلے روز میں نے اس تیسرے لڑکے کو جسے اُس کے ساتھیوں کی طرح یہ معلوم نہ تھا کہ میں نے ان کی گفت گو سن لی ہے، جماعت کے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا دیکھا اور اچانک اندر چلا گیا اور اُس کو سلام کرنے میں میں نے پہل کی پھر خیریت پوچھی، اُس نے غیر متوقع نیاز مندی سے جواب دیا، اور میں چلا آیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ تیسرے روز جب میں جماعت کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دانستہ اُس طرف نظر نہ کی تھی، لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہمہ تن میرے التفات کا منتظر تھا، میں نے دیکھا کہ جونہی میری نظر اُس پر پڑی وہ غیر شعوری طور پر کھڑا ہو گیا۔ اور جھک کر سلام بجا لایا، میں نے عام اُستادوں کی طرح جواب دیا، اُس دن کے سالہا سال بعد بھی جب وہ ہائی اسکول کالج بنا، اور میں اُس میں بطور پروفیسر تعلیم دیتا رہا وہ نوجوان مجھ سے والہانہ عقیدت رکھنے والے طلباء کی ٹولی میں شامل رہا، اسی پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت بھی جب وہ اپنے شہر کا میونسپل کمشنر، آنریری مجسٹریٹ، ایک بڑی جائداد کا مالک اور قوم کا لیڈر بنا کسی موقع پر بھی اُس نے مجھے سلام میں سبقت کا موقع ہی نہ دیا۔

ہر چند کہ میرا یہ طرزِ عمل — جس کی قدر و قیمت کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا — اُس لڑکے کی ناز پروری کے لئے ایک نقطۂ مراجعت ثابت ہوا، لیکن اس قسم کے اخلاقی مظاہروں کو خاص اغراض کے آلۂ کار بنانا جیسا میں نے کیا تھا ہر حال میں درست نہیں ہے، بلکہ صحیح دستور العمل یہ ہے کہ مدرس تحمل، بردباری اور دانش مندی کو اپنی فطرتِ ثانیہ بنا لے تب ہی کامیاب ہو سکتا ہے، ورنہ ایسی تدابیر خواہ کتنی ہی شاندار نتائج کی حامل ہوں ریاکاری میں شامل ہیں۔

میرا شمار بجا طور پر پرانے اور گھاگ معلموں میں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ میری تمام عمر درس و تدریس

شغل میں بسر ہوئی ہیں ایک غیر تربیت یافتہ اُستاد کی حیثیت سے ملازمت میں آیا اور بالآخر فنی تربیت پانے والے اساتذہ کی جماعت کا معلّم بھی رہا۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ اس سلسلہ میں جو نتائج میں نے اخذ کئے ہیں وہ یقینی یا وقیع بھی ہوں۔

میں نے فن تعلیم و تربیت کی بابت جو کچھ سیکھا یا جو کچھ سکھایا اس کی افادی حیثیت میرے نزدیک بیشتر مبہم رہی، البتہ میرے تمام تجارب کا لُبِّ لباب صرف ضبط و نظم کے باب میں "اعلیٰ اخلاق" اور تعلیم و تدریس کے لئے اعلیٰ قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی استاد میں یہ دونوں باتیں ہوں تو شاید ان ذرائع کو کام میں لانے کی بہت کم ضرورت پڑے جنہیں علم التعلیم کی فنی تربیت گاہوں میں سکھایا جاتا ہے، اور جن کا مقصد ایک مدرس میں انہیں دو خصوصیات کی تربیت ہے، علم التعلیم کے ادارے اس لحاظ سے بھی مفید ہیں کہ ان کی بدولت بعض فنی دشواریوں کو حل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مدرس کی ذاتی صلاحیت کو تعلیم کی اصل غرض و غایت کے حصول میں جس قدر دخل ہے کسی اور چیز کو نہیں ہے۔ میں نے بسا اوقات غیر مستند الفطرت اساتذہ کو علم التعلیم کا مستند ہونے کے باوجود بھی غیر تربیت یافتہ مدرسین سے کسی پہلو سے ممتاز نہیں پایا۔

نئی تربیت کے تمام شعبے مدرسین کی فحش کلامی، زدوکوب، طلباء کے ذہن پر غیر ضروری دباؤ ڈالنے یا ایسی حرکات کے ارتکاب سے جو اُن کی غیرتِ نفس کے خلاف ہوں سخت بیزار ہیں، لیکن خود میرے اسکول کے تربیت یافتہ عملہ میں ایسے متعدد بزرگ تھے جو اونچی جماعت کے طلباء کے سامنے بھی گندی گالیاں بکنے اور لاٹھیوں اور لات مکوں سے پیٹنے کے عادی تھے، کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ صورتِ حال اسکول کے عام ضبط کے نقائص کا نتیجہ ہو، لیکن یہ بجائے خود اس بات کا ایک دوسرا ثبوت ہے کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا تربیت یافتہ ہونا بیکار تھا۔

میں نے خود اگرچہ بدخُلقی کا اتنا شدید مظاہرہ کبھی نہیں کیا، تاہم کبھی کبھی طلباء کو سخت سست کہا ہے سزائیں دی ہیں جرمانے کئے ہیں اور پیٹا بھی ہے، مگر مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی حرکتوں سے بجز انتقامی جذبہ کی تسکین کے اور کوئی فائدہ کبھی نہیں ہوا، میں نے اکثر اپنے متشددانہ اقدامات کا محاسبہ کیا

لیکن مجھے ایک نظیر بھی ایسی نہ ملی جس میں طلباء سے زیادہ میں قصور وارانہ ثابت ہوا ہوں۔
ایک لڑکے نے میرے استفسارِ معنے پر غالب کے شعر

موت کا ایک دن معیّن ہے ۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کا وہ مطلب بتایا جو نصابِ اُردو کی شرح میں درج تھا، یعنی "موت کے ڈر سے نیند نہیں آتی"۔ مجھے اس جواب پر سخت غصہ آیا، کیوں کہ میں نے ایک روز پہلے ہی بڑے انہماک سے اس نظم کو پڑھایا تھا، لیکن جب غور کیا تو روشن ہوا کہ میں نے درحقیقت پڑھانے کے وقت تشریح مطالب پر اتنا زور نہ دیا تھا جتنا کہ اس کی اہمیت پر کہ یہ شعر ضروری ہے، امتحان میں آئے گا، لوگ غلط سلط مطالب بتاتے ہیں، تم سے پوچھوں گا، غلط بتایا تو سزا پاؤ گے وغیرہ۔ اس موقع پر بھی میرے مزاج کی برہمی کا سبب طالبِ علم کا غلط جواب نہ تھا۔ بلکہ درحقیقت اس غلط جواب کا وہ پہلو تھا جس کا تعلق براہِ راست میرے جذبۂ خود پسندی کی تحقیر و توہین سے ہے اس بات کا افسوس نہ تھا کہ اُس نے غلط جواب دیا بلکہ اس بات پر عتاب تھا کہ اُس نے میری تہدیدی ہدایات کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے اکثر بد اخلاق اساتذہ کے عتاب و خطاب میں یہی جذبہ کارفرما دیکھا ہے، اس مرض میں مدارسِ تحتانیہ کے مدرسین سے لے کر کالج کے اعلیٰ معلمین تک مبتلا پائے جاتے ہیں، تشخیص جرمانہ کی رپورٹوں کو دیکھیے اُن میں بیشتر یہی لکھا ہوا ملے گا کہ ان طلبہ نے دو بار مضمون نہیں لکھا، یا گھر کا کام پورا نہیں کیا، یا میرے کہنے کے باوجود جماعت سے غیر حاضر رہا ہے۔ یا فلاں حکم نہیں مانا ہے وغیرہ لیکن اساتذہ نے اس بات پر غور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ ان طلبا کی معذوری کے واقعی اسباب کیا تھے۔ مجھے بسا اوقات اُن طلباء پر سخت غصہ آتا تھا جو انگریزی کے مضامین تو مقررہ عنوانات پر لکھ کر لے آتے تھے مگر فارسی ترجمہ کی کاپی لانی بھی بھول جاتے تھے۔ لیکن اس غصہ کے حقیقی اسباب میں علاوہ جذبۂ خود پسندی کے ایک غیر شعوری شائبہ رشک و حسد بھی تھا، حالاں کہ ان پست جذبات کو درس و تدریس کے مشاغل عالیہ سے کوئی نسبت نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مدرس کو بعض اوقات ایسے طلبہ سے سابقہ پڑتا ہے جن میں فطری بلادت یا دنائت کے باعث یا کثیف ماحول اور بنیادی سوءِ تربیت کی وجہ سے رشد و ہدایت اور استفادہ کی صلاحیت

مفقود یا مضمحل ہو جاتی ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے عناصر خود درس گاہوں کی صحت مند اجسام میں جراثیم مرض کا سا اثر رکھتے ہیں، لیکن ان کا علاج بھی تلخ اور جراثیم کش دوائیوں سے نہیں بلکہ دل پسند اخلاق اور دھیان خصوصی کے تریاق سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک طالب علم خواہ کتنا ہی ذہین کار کیوں نہ ہو اُس کا رابطہ اُستاد کی نسبت جماعت کے دوسرے طلبہ کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے، جوان سال لڑکے عام انسانی فطرت کے زیر اثر بیشتر سفاد کی جانب راغب اور درس نتائج سے بے تعلق رہتے ہیں اس لئے کبھی بھی "اُستاد" کو "ہم پیشہ" پر ترجیح دینا پسند نہیں کرتے۔ کسی ایک طالب علم پر اگر اُستاد جبر و تشدد یا تادیب و تعزیر کے طریقے استعمال کرتا ہے تو گویا چند دوسرے طلبا کو اُس کا ہم درد بنا دیتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کش مکش خواہ وہ تادیبی سلسلہ میں ہو جب اُستاد اور شاگرد کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے تو بالآخر متعلقہ ادارے کے تمام انتظامی عناصر۔ عملہ۔ اور تمام طالب علموں میں پھیل کر ناقابل حل مشکلات کا باعث بن جاتی ہے۔ لہذا ایسے مواقع میں اساتذہ کو نہایت اغنیا اور پیش بینی سے کام لینا چاہئے۔ ایسی خطاؤں پر جن کا اثر دوسرے طلبا پر بُرا پڑتا ہو سزا دینا میرے خیال میں اکثر کامیاب ثابت ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں استاد کے خلاف متحدہ محاذ بنانے میں بھی طلبا ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ مجھے کچھ عرصہ مڈل کی جماعتوں کو پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹی جماعت کے لڑکوں میں چغلی اور شکایت کی عادت ہوتی ہے۔ میں نے اس عادت کی اصلاح کے لئے بزعم خود یہ لاجواب ترکیب سوچی کہ ان لڑکوں سے باز پرس کرنا ہی چھوڑ دیا جن کے خلاف شکایت کی جاتی۔ لیکن یہ طریق کار بالآخر نہایت غلط ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس ڈھیل سے بعض لڑکوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ بعض کو مایوسی ہوئی، اور کچھ ایسے بھی تھے جو مجھ سے متنفر ہو گئے۔ اور چند ایسی صورتیں بھی پیش آئیں جن میں خود مجھے اپنے طریق کار کی مخالفت کرنی پڑی۔ برعکس اس کے جب کبھی میں نے شکایتوں کی تصدیق کے بعد مناسب سزا تجویز کی تو اس کا بہت اچھا اثر پڑا، لڑکوں کو خود اپنے ہم جولیوں کی شہادت پر اپنی غلط کاریوں کا احساس ہوا، اور جماعت کی رائے عامہ ہمیشہ میرے طریق کار کے حق میں رہی جس سے تعلیمی مقاصد میں طلبا کا

خاص تعاون حاصل ہوتا رہا اور نہایت ہی عجیب بات یہ ہوئی کہ چغل خوری کی قبیح عادت کا سدّ باب بھی اسی طرح ہوا کیوں کہ کچھ عرصہ بعد چغلی اور شکایت کے عادی طلبا کے ساتھ دوسروں نے پہلے تو خود ہی باہمی کچھ تصفیہ کر لیا اور پھر محتاط ہوتے چلے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے دوسرے انتظامی شعبوں کے حکام کی طرح تعلیمی اداروں کے اساتذہ کی زندگی بھی عجیب و غریب تجارب سے پُر ہوتی ہے۔ استاد کو مختلف ذہنیتوں اور لیا اوقات متضاد طبائع سے بیک وقت دوچار ہونا پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ طلبا کی ذہنی اور فطری استعداد ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ملکات باطنی کی فعلی و انفعالی قوتیں بھی ظروف و احوال کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، لہٰذا بعض مخصوص حالات کی پیش آمد سے جو نتیجے اخذ کئے جاتے ہیں وہ ہر حال میں صحیح نہیں قرار دیے جا سکتے، اس لئے جب تک کسی خیال کی مسلسل اور متواتر تجربوں سے تصدیق و توثیق نہ ہو سکے وہ خیال چنداں معتبر نہیں ہے۔

میری ابتدائی تعلیم کسی "کنڈر گارٹن" اسکول میں نہیں ہوئی تھی، مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے قاعدہ بغدادی کس سے اور قرآن حکیم کب اور کیوں کر ختم کیا، غالباً یہ سب کچھ گھر میں ہوا، لیکن ملازمت کے وقت بھی مجھے اَلْحَمْدُ کے ہجے الف لام زبر اَل حے میم زبر حَم دال پیش دُ "اَلحمدُ" یاد تھی

اتفاق سے ملازمت کے پہلے ہی سال میں مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ابتدائی جماعتوں کے امتحان کا انچارج بنا دیا، میں نے پہلی جماعت کے ایک لڑکے سے ہجے کرنے کو کہا اُس نے جواب دیا الف زبر بے اَب جیم زبر الف جا۔ اَب جا، یہ جواب میرے اپنے نقطۂ نظر سے صریحاً غلط معلوم ہوا لیکن میں نے جلد ہی دانش مندی سے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس مدرسہ کا طریق تعلیم کچھ ایسا ہی ہے، ایک پرانے تربیت یافتہ مدرس سے اس باب میں گفتگو ہوئی، انہوں نے کہا بھلا الف بے زبر اب کہنا کیوں کر صحیح ہے جب کہ زبر حرف الف پر ہے، میں نے کہا اگر زبر حرف الف پر ہے اور بے الگ تھلگ ہے تو اَب کو اَبے کیوں نہیں کہتے؟ اگرچہ میرا جواب چنداں معقول نہ تھا لیکن مدرس صاحب مرعوب ہو کر خاموش ہو گئے، یہ امر بعد میں منکشف ہوا کہ سررشتۂ تعلیم نے جدید طریق تعلیم کی بنا پر ہجے کے

یقے کو بند کر کے جدید طریقے کو جاری کیا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ اب مدارس میں کیا طریق رائج ہے لیکن
ف زبر بے اَب مجھے اب بھی غلط ہی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ حرکت نہ صرف ایک حرف کو آواز میں ل
تی ہے بلکہ اُسے حرفِ مابعد سے مربوط بھی کر دیتی ہے، اس لئے الف بے زبر اَب کے معنی یہ ہیں کہ
ف کو بے کے ساتھ بواسطۂ حرکتِ زبر ملایا گیا ہے، اور اس طرح "ا" اور "ب" جو دو مختلف حروف
تھے ایک مخلوط آواز اَب میں منتقل ہو گئے، گویا زبر سے نہ صرف الف متاثر ہے بلکہ بے بھی بالواسطہ
تاثر ہے اور الف بے زبر اَب کہنا ہی صحیح ہے، لیکن جہاں ہجے کا وجود ہی "دیکھو اور بولو" کے جدید طریق
ہم کے ماتحت سرے سے مٹا دیا گیا ہو وہاں یہ بحث بے معنی ہے۔

مسجد کے مکاتب میں یا کسی میاں جی کے زیرِ تعلیم جماعت میں الف بے کی تقطیع دو اقساط میں
ھائی جاتی تھی، پہلے بچے الف سے ی تک حروف تہجی کو زبانی یا کسی قدر پہچان کے ساتھ رٹ لیتے
ے، پھر الف خالی ب کے نیچے ایک نقطہ ت کے اوپر دو نقطے وغیرہ آخر تک رٹوایا جاتا تھا لیکن
ب اس طرح رٹوانے کی بجائے مختلف طریقوں سے حروف تہجی کو ذہن نشین کرنے کی نت نئی ترکیبیں
باد ہو رہی ہیں چنانچہ بچوں کی آسانی اور دل چسپی کے لئے مٹی کے مختلف نمونوں، کارڈوں اور تصویروں
ے کام لیا جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں حروف کے نام سے قطع نظر صرف آوازوں پر اکتفا کیا گیا ہے
ں کہیں یہ بھی ہوا ہے کہ حروف تہجی کی تعلیم کو ہی ضروری نہیں سمجھا گیا، درحقیقت یہ سب تجارب تھے
سررشتۂ تعلیم نے اس باب میں مخلصانہ کوششوں سے بھی کام لیا ہے، میں نے خود بھی انھیں طریقوں
ستعمال کرنا اپنے زیرِ تربیت اساتذہ کو سکھایا اور اساتذہ کو سیکھنے میں نہایت جاں فشانی کرتے ہوئے
ی دیکھا، لیکن بیشتر ان طریقوں کے استعمال کو صرف افسران سررشتۂ تعلیم کے معائنوں کے لئے محفوظ
ا جاتا تھا، مدارس کی داخلی زندگی میں اس کا سراغ بہت کم ملتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ پرانی روش کے
نوں اور موجودہ عہد کے معیاری اسکولوں کے ابجد خواں طلباء کی سطحِ استعداد میں کوئی تفاوت نظر نہیں آیا
، مجھے ایک بار سخت تعجب ہوا جب ایک معمولی لفظ کے ہجے میری فورتھ ایئر کلاس کا کوئی طالب علم نہ کر سکا
علم کی زندگی میں یہ واقعہ ایسا ہی حیران کن ہے جیسا مسلمانوں کا کلمۂ طیبہ سے ناواقف ہونا، پچھلے تو

ایک دریچین کے قریب جہاں میں اکثر گریجویٹ تھے بس کے انتظار میں کھڑے تھے، یا ہمی طور پر وقت گزاری کے لئے کلمہ طیبہ سے واقفیت کا امتحان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اتنے اشخاص میں صرف دو ایک ہی ایسے تھے جنہوں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کا ٹھیک تلفظ کیا، ورنہ کسی نے مُحَمَّدٌ کہا تو رسولِ اللّٰہ غلط کہدیا، کسی نے رسولُ اللّٰہ کہا تو محمدً غلط کہدیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارے موجودہ معاشرہ میں کلمہ طیبہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی طرح چونکہ دفتری کاروبار میں سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے کام چلا جا رہا ہے اور غالباً اسی لئے جدید تعلیم کے اصلاحی رجحانات میں سمجھنے کو اہمیت نہیں دی جاتی یعنی اگر کسی عبارت کو فرفر صحیح پڑھنا آتا ہے لیکن سمجھنے نہیں آتی تو فی الواقع اصل مقصد کو نقصان نہیں پہونچتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "پڑھنا" سیکھنے کے لئے طریق ہجا کے ترک و اختیار میں سے کون سا بہتر ہے۔ منطقی دلائل یقیناً طریق جدید کی حمایت کرتے ہیں لیکن مشاہدہ اس کے برعکس ہے۔ استاد کی قابلیت، شفقت اور توجہ صرف ہی تین طریقے تعلیم کے تمام طریقوں میں مقدم ہیں۔ الف خالی ب کے نیچے ایک نقطہ رٹانے والے اساتذہ اگر شفقت اور توجہ سے اسی طریق تعلیم کو چپٹے رہیں تو اس سے بھی وہی نتیجہ برآمد ہوگا اور ہوتا رہا ہے جو کنڈر گارٹن کے ذریعہ تعلیم سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ پرانے طریقے میں حروف کی شکل اور ساخت کو بچوں کے ذہن پر مرتسم کرنے کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ جس وقت بچہ جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ کہتا ہے تو اس کے ذہن پر ج کی شکل کا پورا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے جیم کا تصور دلانے کے لئے خاکوں اور تصاویر سے کام لینے کی زحمت کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہے کہ مثلاً حرف جیم کی مرکزی حیثیت خاکوں اور تصاویر کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ لڑکے یہ تو جان جاتے ہیں کہ ج سے جہاز بن جاتا ہے۔ لیکن جہاز بذات خود کیا چیز ہے اور جیم سے کیوں کر بنتا ہے۔ اس کا سمجھنا ایک طرف استاد کو ناقابل عبور مشکلات میں ڈالتا ہے، اور دوسری طرف طلبا کے ذہنی انتشار کا باعث بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے پرانے طریق تفہیم میں جیم کی شکل لڑکوں کے پیش نظر ہے۔ اس کا پیٹ بھی سامنے ہے اور اس کے بیچ میں نقطہ بھی نظر آتا ہے، اس سے جہاں جیم کی پیٹ دار شکل ذہن میں آتی ہے۔ وہاں نقطہ کی حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ نقطہ کا ایک یا دو یا تین ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔ اپھر یہ بھی کہ حرف کی مرکزی حیثیت ذہن سے جدا نہیں ہونے پاتی۔ لڑکے کی زبان ان الفاظ کے دہرانے سے زیادہ ٹوٹتی ہے۔ تلفظ صحیح ہوتا جاتا ہے اور اُس کا ذہن تصویر سے زیادہ حرف جیم پر ہی مرکوز رہتا ہے، شاید یہی سبب ہے کہ بعض دقیانوسی خیال کے لوگ نئے طریقِ تعلیم کے زیادہ مداح نہیں ہیں۔

لکھنے اور خوش خطی کے باب میں بھی جدید کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ کسی معیاری مدرسے میں پڑھنے والے طالب علموں کا خط اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اساتذہ کی پیہم کوششوں کے باوجود چار خطی" سرمشقوں کی نقل سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بچے بھی کوشش کرتے ہیں کہ جو گوشۂ لفظ جس لکیر سے شروع ہوا ہے وہیں سے وہ بھی شروع کریں، لیکن کبھی کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ سادہ کاغذ پر بسا اوقات چار لکیروں سے اچھا لکھ لیتے ہیں، اس کا سبب بھی یقیناً ذہنی انتشار ہے کہ بچے الفاظ کی نوک پلک کو ٹھیک رکھنے کے لئے اپنا ذہن مختلف نقاطِ خطوط پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ کام بچوں کے فطری تلون کے باعث سخت مشکل ہے بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ خود باوجود خوش خط ہونے کے جب چار خطوط کی پابندی کرنا چاہتا ہوں تو بدخط ہو جاتا ہوں، نہیں معلوم سررشتۂ تعلیم نے چار خطی سرمشق کے استعمال کی اجازت کیوں دی ہے؟

اس کی بجائے میرے مسلسل تجربوں سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ——————

صرف ایک لکیر پر بچوں کو اس طرح لکھنے کی ہدایت کی جائے کہ ہر لفظ نیچے کی جانب سے لکیر کے ساتھ ملتا رہے، البتہ صرف میم ایک حرف ایسا ہے کہ وہ لکیر کو کاٹ دیتا ہے، میم کے علاوہ تمام الفاظ اس طرح لکھے جائیں جیسا کہ ان سطور میں ایک نمونہ دیا گیا ہے۔

یہ طریقہ اگرچہ خوش نویسی کے متداول اصول سے کسی قدر مختلف ہے لیکن صفائی و فصاحت اور خوش نمائی کے لحاظ سے نہایت ہی کامیاب ثابت ہوا ہے۔ کسی جماعت میں اگر صرف ایک ہفتہ بھی اس طریق کی پابندی کی جائے تو مجموعی طور پر خط کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ پیہم تجربوں سے میرے

سررشتۂ تعلیم کے افسران اس جدید اور آسان طریق نوشت سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ اس کے عمل درآمد کے لیے گشتی احکامات تمام مدارس میں نافذ کر دیئے گئے اور غالباً اُس علاقہ میں اب تک نافذ ہیں، میں نے کالج کے بدخط طلبا، کو بھی یہی ہدایت کی اور اگرچہ ان کی اصلاح نہایت مشکل تھی لیکن تحریر کی خوش نمائی میں جلد نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اس طریق میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ کو پیچ کرنے اور راردو اُوپر نیچے لکھنے کی جو مکروہ عادت ہے وہ چھوٹ جاتی ہے۔ اور تحریر بدخط ہونے کے باوجود خوش نما معلوم ہوتی ہے۔

امید ہے کہ مدارس تحتانیہ کے اساتذہ اس تجربہ کو کام میں لاکر محکمہ کو اس کے نتائج سے مطلع فرمائیں گے۔

ہمارے مدارس اور علم ہندسہ کی تدریس

محمد مظفر الدین

اسکول کے مضامین میں سے ریاضی کے عام مقاصد سب سے زیادہ علم ہندسہ سے حاصل ہوتے ہیں مدارس میں اس کی تعلیم کی غرض و غایت بچوں کی دماغی اور ذہنی تربیت ان کی قوت استدلال کی نشو و نما ان میں سوچ بچار کی صلاحیت، زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کی اہلیت اور انہیں حل کرنے کی استعداد پیدا کرنا ہے۔

لیکن جس طریقہ سے یہ ہمارے مدارس میں پڑھائی جا رہی ہے اس سے اسے پڑھانے کی غرض و غایت پوری نہیں ہو رہی، چناں چہ اس کی تعلیم میں اہم نقائص جو اسکولوں میں دیکھنے میں آئے ہیں حسب ذیل ہیں

(۱) طبقہ مڈل میں اس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔

(۲) ابتدائی تصورات صحیح اور پختہ طور پر نہیں دئے جاتے مختلف مفرون اشیاء لے کر تصورات دینے کی بجائے شروع میں ہی لڑکوں کو اصطلاحات کی تعریفیں لکھا کر رٹا دی جاتی ہیں، جن سے ان کے ذہن میں اشکال کا صحیح اندازہ اور تصور نہیں ہوتا۔

(۳) اصطلاحات کا مطلب طلبہ پر واضح نہیں کیا جا رہا مثلاً متساوی الساقین تکون کے معنی لڑکوں کو نہیں بتائے جاتے اور اغلب ہے کہ بہت سے مدرسین بھی اس سے ناآشنا ہوں، اسی طرح متوازی الاضلاع مخمس، مسدس، مسبع، مثمن وغیرہ کے مفہوم سے لڑکے نابلد رہتے ہیں اور ان کی تعریفیں جلد ہی بھول جاتے ہیں۔

(۴) مسائل کے حل کو عمل کی وجہ بتائے بغیر طوطے کی طرح رٹا دیا جاتا ہے اور اس کا کوئی درجہ اگر طالب علم کو

بھول جائے تو وہ اسے سوچ نہیں سکتا اور اس کا پورا سوال غلط ہو جاتا ہے۔

(۵) جو کچھ لڑکوں کو پڑھایا جاتا ہے اس کو مشقیہ سوالات حل کرا کے ذہن نشین نہیں کیا جاتا اور نہ استعمال میں ہی لایا جاتا ہے جس کی وجہ سے لڑکے اسے بے فائدہ، خشک اور مشکل خیال کرنے لگتے ہیں۔ اور جلد بھول جاتے ہیں۔

(۶) لڑکوں کو مسئلے کے ساتھ ساتھ مشقی سوالات نہیں کرائے جا رہے، انہیں یا تو نویں جماعت تک کرایا ہی نہیں جاتا یا اسے اخیر سال کے لئے ملتوی رکھا جاتا ہے، اور پھر بھی تھوڑے سے چیدہ چیدہ نمونے حل کر کے یاد کرا دیئے جاتے ہیں، جن سے چنداں فائدہ نہیں ہوتا، اور طلبہ آسان سے آسان مشقی سوالات بھی حل نہیں کر سکتے۔

(۷) سارا نصاب جماعت میں ختم نہیں کیا جاتا، صرف چند ایسے مشہور قاعدے پڑھا دیئے جاتے ہیں جن کے متعلق استاد کا خیال ہوتا ہے کہ امتحان میں پوچھے جائیں گے۔

(۸) تحریری کام کی درستی نہیں کی جاتی، اگر کی جاتی ہے تو بھی گاہے گاہے محض دستخط کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، باقاعدگی اور احتیاط سے کاپیوں کو درست نہیں کیا جاتا، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا نقصان ہوتا ہے۔

(۹) اشکال کی صحت کا مناسب خیال نہیں کیا جاتا، غلط اشکال کو طلبہ سے دوبارہ نہیں کھچوایا جاتا، اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا کہ لڑکے نے کون سے خطوط شوخ، کون سے نقطہ دار یا باریک اور کون سے موٹے کھینچے ہیں۔

(۱۰) عملی کام کی طرف تھوڑی توجہ دی جاتی ہے۔

(۱۱) باوجود اس بات کے کہ لڑکے ہندسہ سال بھر پڑھتے رہتے ہیں، ان میں سے بہت سے طلبہ یہ نہیں بتا سکتے کہ مسئلہ میں دیا ہوا کیا ہے اور ثابت کیا کرنا ہے یا بنانا کیا ہے، اگر لڑکوں کو مسئلہ کا موضوع اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور پڑھاتے وقت یہ باتیں ان سے پوچھی جائیں تو وہ یہ بتا سکیں گے اور اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

تحلیلی طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا، مدرسوں میں عام طور پر لڑکوں کو ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ثبوت یاد کرا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کو بہت سی باتیں یاد رکھنی پڑتی ہیں اور وہ صرف حافظہ سے ہی کام لیتے ہیں اور سوچ بچار نہیں کر سکتے، یہ ترکیبی طریقہ ہے جس کی وجہ سے طلبہ ہر عمل کی غرض نہیں سمجھتے، ان کو ہر مسئلہ کا عمل یاد رکھنا پڑتا ہے جس کا دماغ پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر کوئی لڑکا ایک بات بھی بھول جائے تو اس کا سارا حل غلط ہو جاتا ہے اور وہ سوچ کر اسے خود معلوم نہیں کر سکتا۔ ذہنی تربیت بھی نہیں ہوتی اور دماغ پر ناحق کا خواہ مخواہ بوجھ پڑتا ہے۔

۱) تجرباتی طریقہ (LABORATORY METHOD) استعمال نہیں کیا جاتا، اگر یہ استعمال کیا جائے تو طلبہ بعض باتیں مثلاً π کی قیمت عملی طور پر استعمال کر سکیں گے اکثر فارمولے انہیں ایسے یاد ہو جائیں گے کہ وہ انہیں عمر بھر نہیں بھولیں گے۔ ان کے تصورات مکمل ہو سکیں گے۔

۱) جماعت میں تختہ سیاہ پر اشکال کھینچنے کے لئے اساتذہ کے پاس یا تو سامان ہوتا ہی نہیں یا وہ اسے استعمال میں نہیں لاتے۔

مذکورہ بالا نقائص حسب ذیل طریقے اختیار کرنے سے رفع ہو سکتے ہیں۔

۱) مڈل کی جماعتوں میں علم ہندسہ کی طرف مناسب توجہ دی جائے۔ ریاضی کے نمبروں کے تناسب سے پیریڈ دیئے جائیں، ریاضی کے اس کے نمبروں میں سے نمبر مڈل اسکول کے امتحان میں ہوتے ہیں، اس لئے اس کے پیریڈوں میں سے اس کو دینے چاہئیں۔

۱) شروع میں لڑکوں کو اصطلاحات مثلاً خط مستقیم نقطہ سطح وغیرہ کی تعریفیں نہ بتائی جائیں بلکہ کچھ مختلف مثالیں لے کر ان کا تصور ان کو دلایا جائے، کیوں کہ اس منزل پر تعریفیں مشکل ہوتی ہیں اور ان کو یاد کرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ بچوں کے ذہن میں نہیں آتیں۔ سطح کا تصور اینٹوں کی سطحوں سے دلایا جا سکتا ہے۔ ایک اینٹ کے ساتھ اور اینٹیں رکھنے سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ سطح کو چاروں طرف گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہے، اسی سے خط مستقیم اور نقطے کا تصور بھی ان کے کناروں اور کونوں سے علی الترتیب دلایا جا سکتا ہے۔

(۳) اصطلاحات پڑھاتے وقت لڑکوں کو ان کے معانی بھی بتائے سمجھائے اور یاد کرائے جائیں۔ مثلاً متساوی الساقین تکون پڑھاتے وقت بتایا جائے کہ متساوی معنی برابر اور ساقین ساق کا تثنیہ ہے ساق کے معنی پنڈلی ہے لہٰذا متساوی الساقین تکون وہ تکون ہے جس کی دو پنڈلیاں یعنی دو ضلعے برابر ہوتے ہیں، اسی طرح متوازی الاضلاع مخمس، مسدس، مسبع، مثمن وغیرہ کے معانی بھی بتائے جائیں۔

(۴) مشقیں کرانا نہایت ضروری ہے۔ اثباتی ہندسہ میں مشقی سوالات کو حل کرنے سے ہی ریاضی پڑھانے کا مقصد حاصل ہوتا ہے، ان کو حل کرتے وقت سوچ بچار کرنا ہوتا ہے، اس لئے مشقی سوالات کو آخر سال پر یا آخری جماعت میں کرانے کے لئے ملتوی نہ کیا جائے بلکہ شروع سے ہی ہر مسئلہ کے ساتھ ساتھ اس کے متعلقہ سوالات کرائے جائیں، اس طرح کرنے سے مسئلہ بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اور مضمون بھی طلبہ کو دلچسپ معلوم ہونے لگتا ہے، اس کے ساتھ ان کے دلوں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ ایک ریاضی دان نے کہا ہے کہ "جیومیٹری میں طالب علم کی قابلیت اور ترقی کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مشقی سوالات جو اس کے لئے نئے ہوں کس حد تک حل کر سکتا ہے"،

(۵) تحریری کام کی اصلاح ویسی ہی ضروری ہے جیسے انگریزی یا اردو میں انشاء پردازی کی اصلاح اہم ہوتی ہے، اگر کسی وجہ سے ہر سوال کو درست کرنے کے لئے وقت نہ ہو تو ۵ سوالات میں سے کم از کم ۲ کی تو اصلاح کی جائے یا ہفتہ میں ایک دو دفعہ تو کر دی جائے، ورنہ یہ غلطیاں طلبہ کے دلوں میں راسخ ہو جائیں گی اور انہیں غلط عادت پڑ جائے گی، جسے چھڑانا نئی عادت ڈالنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے، نیز ان کو جواب صحیح طور پر لکھنا آ جائے گا۔

(۶) بچوں کو سوال غور سے پڑھنے کو کہا جائے اور پھر ہر مسئلہ کرتے وقت ان سے پوچھا جائے کہ انہیں کیا ثابت کرنا ہے اور دیا ہوا کیا ہے، اگر یہ باتیں اچھی طرح ذہن نشین کی جائیں تو پھر مسئلہ کا عکس بھی طلبہ کے بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے اور ان کی ذہنی تربیت بھی ہوتی ہے۔

(۷) تشکیلات میں عملی کام کرانا ضروری ہے . . . . اس کی مشق خاص طور پر احتیاط سے کرائی جائے، اثباتی ہندسہ پڑھانے کا اصل مدعا یہ ہے کہ لڑکے

بت شدہ اصول کو استعمال میں لاسکیں، امتحان میں اگرچہ ان کا ثبوت طلب نہیں کیا جاتا لیکن نہیں ایسا
ھاتے وقت استاد کو ثبوت بھی اخذ کرانا یا بتانا چاہئے، اس سے بناوٹ اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتی ہے
(الف) اشکال صاف اور صحیح ہونی چاہئیں، دیئے ہوئے خطوط یا شکل کو شوخ بنوایا جائے بناوٹ
کے خطوط (CONSTRUCTION LINES) کو نقطہ دار یا باریک رکھوایا جائے اور مطلوبہ شکل کو موٹے خطوط میں
اہر کیا جائے تاکہ ان میں تمیز ہوسکے۔
(ب) اگرچہ اثباتی ہندسہ میں بالکل ٹھیک پیمانہ کے مطابق اشکال نہ بنوائی جائیں تو بھی عموماً ثبوت
ینے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن پھر بھی بہتر ہے کہ لڑکے یہ آلات کی مدد سے صحیح بنائیں
گر یہ بہت غلط قسم کی ہوئیں تو یہ بات طلبہ کے لئے مفید نہیں ہوگی۔
۸) تحلیلی طریقہ (ANALYTICAL METHOD) اختیار کیا جائے کیوں کہ تحلیل سے ہی پتہ چلتا ہے کہ
ہندسہ کے حقائق کس طرح معلوم کئے گئے ہیں، مسئلہ کو پڑھانے سے پہلے ان کی تحلیل (   )
کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے کون کون سا عمل ضروری ہے، کون کون سا
کرنا چاہیئے اور کیوں، اس سے حل صاف ہوجاتا ہے اور اس کے اجزا یا درجے واضح ہوجاتے ہیں
اور شکل مسئلہ کو آسان مسئلہ میں تبدیل کرلیا جاتا ہے، اگر کوئی لڑکا کسی وقت کوئی عمل بھول بھی جائے
تو اس کی مدد سے وہ اسے خود سوچ سکے گا، تحلیل سے مسائل بہتر طریق پر ذہن نشین ہوجاتے ہیں
اور نہ کئے ہوئے سوالات بھی لڑکا کرسکتا ہے، اس سے لڑکوں کے دماغ وحافظہ پر بوجھ نہیں
پڑتا بلکہ ان کو خود سوچنا آتا ہے جس سے ان کی عقل تیز اور ریاضی کی تعلیم صحیح ہوتی ہے۔
کتابوں میں ترکیبی طریقہ (SYNTHETIC METHOD) دیا ہوتا ہے اور اس کی مدد سے مسائل حل
شدہ ہوتے ہیں۔ اس سے دماغ وحافظہ پر بہت بوجھ پڑتا ہے، اور ساری باتوں کو یاد رکھنا پڑتا ہے
جو رٹنے کے مترادف ہے، اس سے ریاضی کی تعلیم کا مقصد فوت ہوجاتا ہے، ہمارے اسکولوں میں بھی اسی
ترکیبی طریقہ سے اثباتی ہندسہ پڑھایا جاتا ہے، جو لڑکوں میں ریاضی کا حقیقی ذوق پیدا ہونے میں مانع ہے،
تحلیل کے بعد ترکیبی طریقہ سے ثبوت لکھایا جائے جو لڑکے خود لکھ سکیں گے اس کو معرض عمل میں

لانے کے لئے طلبہ کو حسب ذیل حقائق سے بھی آگاہ کیا جائے اور یہ گاہے گاہے ان سے پوچھے بھی جائیں

(ا) خطوط اور زاویوں کو برابر ثابت کرنا ہو تو عام طور پر دو تکون جن میں وہ دیئے ہوئے ہوں منطبق ثابت کی جاتی ہیں، اگر وہ خطوط یا زاویے دو تکونوں میں مقابل کے ہوں تو وہ تکونیں لی جاتی ہیں، اور اگر نہ ہوں تو کوئی خط وغیرہ کھینچ کر ان کو بنایا جاتا ہے، جن میں وہ مقابل کے ضلعے یا زاویے ہیں طلبہ کو بتایا جائے کہ وہ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ تکونیں تین چار حالتوں میں برابر ہوا کرتی ہیں۔

(ا) جب دو ضلعے اور درمیانی زاویے برابر ہوں۔

(ب) تینوں ضلعے ترتیب وار برابر ہوں۔

(ج) دو زاویئے اور ایک ضلع برابر ہوں۔

(د) تکون میں زاویہ قائمہ ہو تو ایک ضلع اور وتر برابر ہوں۔

(ب) خطوط کے متوازی ہونے کے لئے ان کے متبادلہ یا متناظرہ زاویے برابر ہوں، یا دونوں اندرونی زاویوں کا مجموعہ قائموں کے برابر ہو۔

(ج) کسی زاویہ کو قائمہ ثابت کرنا ہو تو اسے اس کے متعلقہ سپلیمنٹری زاویہ کے برابر ثابت کیا جائے۔

(د) تکون کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو قائموں کے برابر ثابت کرنے کے لئے وتر کو بڑھا کر اس میں تینوں زاویے بنائے جاتے ہیں۔

(ہ) خطوط کو متناسب ثابت کرنا ہو تو تکونوں کو متناسب ثابت کیا جاتا ہے۔

(و) دائرہ میں وتروں کو برابر ثابت کرنے کے لئے مرکز سے ان کے فاصلہ کو یا قوسوں کو برابر ثابت کیا جاتا ہے۔ قوسوں کو برابر ثابت کرنے کے لئے مرکز پر بننے والے زاویوں کو برابر ثابت کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح مزید حقائق اکٹھے کئے جا سکتے ہیں۔

پھر تحلیل میں مشق یا مسئلہ کراتے وقت طلبہ سے پوچھا جائے کہ بات ثابت کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے، نامعلوم کو معلوم اصول یا بات کے ساتھ تعلق دینا، مسائل کو بغیر امداد استاد اور ان کی غور کو تحلیل کرنا کو سکھایا جائے، مثلاً (ا) ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ متوازی اضلاع میں مقابل کے ضلع اور زاویئے برا
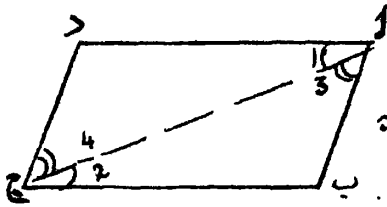
ہوتے ہیں شکل بنانے کے بعد دیکھیں گے کہ اس میں ہیں ثابت کرنا ہے کہ ا ب = د ج ، ا د = ب ج اور زاویہ
ب = د ا = ج

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ، ان کو برابر ثابت کرنے کے لئے ہمیں تکونیں برابر ثابت کرنی پڑیں گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسی تکونیں اس میں ہیں یا نہیں ، اگر نہیں ہیں تو بن سکتی ہیں یا نہیں جن میں یہ خطوط اور زاویئے آجائیں ۔

بظاہر کوئی تکون نہیں ہے ۔ لیکن اگر ا ج کو ملا دیا جائے تو ایسی دو تکونیں بن جاتی ہیں ، یہ اگر منطبق کر دی جائیں تو ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو زاویئے اور ایک ضلع برابر والا مسئلہ لگ سکے گا اور مطلوبہ ضلع اور زاویئے برابر ثابت ہو جائیں گے ۔

(ب) اسی طرح اگر یہ سوال ہو کہ ایک تکون کے تینوں اضلاع کا مجموعہ اور قاعدہ کے دو زاویئے دیئے ہوئے ہیں اس تکون کو بناؤ تو یہ تحلیلی طریقہ سے بڑی آسانی سے حل ہو سکتا ہے ، یہاں د س تکون کے تینوں اضلاع کا مجموعہ م اور ن دیئے ہوئے زاویئے ہیں ۔
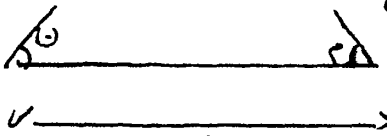
تحلیلی طریقہ میں فرض کر لیا اب ج مطلوبہ تکون ہے ، اب تینوں اضلاع کا مجموعہ بنانے کے لئے ب ج کو ایک طرف س تک اور دوسری طرف ب ج کو ص تک اس طرح بڑھایا کہ ب س = ا ب اور ج ص = ا ج ہو ۔ ا س اور ا ص ملانے سے Δ ا ب س Δ ا ج ص ہر دو متساوی الساقین ہوں گی اور ان کے بیرونی خارجہ زاویئے ا ب ج اور ا ج ب اپنے بالمقابل اندرونی زاویوں کے مجموعوں کے برابر ہوں گے ، اس صورت میں ا س ب ا ص ج ان کے یعنی دیئے ہوئے زاویوں کے نصف ہوں گے ۔ اس تحلیل کے بعد ترکیبی طریقہ استعمال کیا جائے گا اور وہ حسب ذیل ہوگا ۔

دیئے ہوئے خط د س کے برابر ایک خط س ص لیا ، اس کے کونوں س اور ص پر دیئے ہوئے زاویئے دیئے

اور ان زاویوں کی تنصیف کی، ان کے خطوط تنصیف کو بڑھایا جس نقطہ (ا) پر وہ ملے وہاں سے دو خطوط اب
اور ا ج س ش اور س ص کے بیرونی بازوؤں کے متوازی کھینچے حتیٰ کہ وہ س ص کو نقاط ب اور ج پر ملیں تو
ا ب ج مطلوبہ تکون ہے۔

(۹) تجرباتی طریقہ بھی طلبہ کی دلچسپی کا باعث ہوا کرتا ہے، شروع شروع میں اسے استعمال کیا جائے
مثلاً تکونیں منطبق ثابت کرنے کے لئے طلبہ خود اپنے ہاتھ سے ایک تکون کاٹ کر دوسری تکون پر رکھیں
اسی طرح محیط اور قطر کی نسبت π عملی طور پر ان کی پیمائش کرکے نکالیں۔
اسی طرح دائرہ کا رقبہ، مستطیل، سلنڈر اور مخروط (CONE) کی سطح کا رقبہ، رقبہ چار دیواری
حجم وغیرہ عملی طور پر تجرباتی طریقہ سے معلوم کرائے جائیں تو دلچسپی اور پختگی کا موجب ہوں گے۔

(۱۰) جیومیٹری کے مسئلے ایسے طریقہ سے پڑھائے جائیں کہ پہلا پڑھا ہوا مسئلہ نیا مسئلہ ثابت کرنے میں مدد
ثابت ہو۔ مثلاً۔ وہ زاویہ جو دائرہ کا قوس اس کے مرکز پر بنائے اس زاویہ سے دوچند ہوتا ہے جو بقیہ قوس
باقی محیط کے کسی نقطہ پر بنائے اس کی مدد سے بڑی آسانی سے حسب ذیل مسائل حل اور ذہن نشین کئے جا سکتے

(ا) نصف دائرہ کا ہر زاویہ قائمہ ہوتا ہے۔
(ب) اس قطعہ دائرہ کا زاویہ جو نصف دائرہ سے بڑا ہو زاویہ قائمہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔
(ج) اس قطعہ دائرہ کا زاویہ جو نصف دائرہ سے چھوٹا ہو زاویہ قائمہ سے بڑا ہوتا ہے۔
(د) ایک ہی قطعہ دائرہ میں جتنے زاویے ہوں وہ سب آپس میں برابر ہوتے ہیں۔
(ہ) ایک مستقیم المحیط چوکور کے متقابل کے زاویے سپلیمنٹری ہوتے ہیں۔

(۱۱) مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی خاص نقطہ ہوا کرتا ہے وہ طلبہ کو اچھی طرح بتا کر انہیں
خوب دل نشین کرا دیا جائے اور کہا جائے کہ مسئلہ مذکور کو ثابت کرنے کے لئے وہ اس نقطہ کو خاص
طور پر اپنے ذہن میں رکھیں۔

ایمیل یا رُوسو کی تعلیم

توقیر مرزا لرزقی

مسلسل نمبر ۱۸

ایک اُستاد کو کیا کیا جاننا چاہیئے

یہ سب طریقے اس لئے دشوار نظر آتے ہیں کہ یہ سب ہمارے لئے بالکل نئے اور جدید ہیں لیکن حقیقتاً یہ مشکل نہ ہونے چاہئیں، مجھے یہ فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ جو کام آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کو انجام دینے کے لئے آپ کے پاس مطلوبہ علم موجود ہے، اور یہ کہ آپ انسانی خیالات کی نشو و نما کے عام نصاب یا دَور سے واقف ہیں اور بنی نوع انسان اور آدمی کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور یہ کہ آپ قبل از وقت یہ جانتے ہیں کہ جو مختلف اشیا بہ لحاظ نمو آپ اپنے شاگرد کے سامنے لے جاتے ہیں اُن کا اس پر کیا اثر ہو گا، آپ کے پاس اوزار بھی ہیں اور ان کے استعمال کا فن بھی کیا اب بھی آپ اپنی تجارت کے ماہر کامل نہیں ہیں ؟

بچے کی خام خیالی وغیرہ دُور کرنے کی مثالیں

بچپن کی سنک اور خام خیالی کے متعلق آپ بڑے غلط تصورات میں مبتلا ہیں، بچوں کی خام خیالی جبلّی نہیں ہوتی بلکہ ناقص تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے، بچے غلام ہوتے ہیں یا آقا اور میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ان کو دونوں میں سے ایک بھی نہ ہونا چاہیئے آپکے شاگرد میں وہی خام خیالی ہو گی جو آپ نے اس کو سکھائی ہو گی، لیکن کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے ؟ آپ کی ذاتی مستقل مزاجی اور عمدہ روش کے ذریعے درستی اب بھی ممکن ہے ہیتد

ہفتوں کے لئے میں نے ایک بچے کی ذمہ داری لے لی تھی، اس کو یہ عادت تھی کہ وہ نہ صرف اپنی ہی کرنی کرتا تھا بلکہ دوسرے بچوں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور کرتا تھا، لہٰذا وہ متشکی بن گیا تھا۔ اس نے مجھے پہلے ہی دن آدھی رات کو جبکہ میں بے خبر سو رہا تھا، امتحاناً اٹھانا چاہا، وہ بستر کے باہر کودا اور ڈریسنگ گاون پہن کر میرے پاس آکھڑا ہوا اور مجھے جگا دیا، میں اٹھا اور خاموشی سے موم بتی جلا دی، بس یہی اس کی خواہش تھی، پورن گھنٹے کے بعد اس کو نیند آگئی، اپنے پہلے ہی تجربے سے مطمئن ہوکر وہ اپنے بستر پر واپس جا لیٹا، دو دن بعد پھر اس نے اسی کامیابی کے ساتھ اس تجربے کو دوہرایا لیکن مجھ میں اس کو بے صبری کی کوئی علامت نہ معلوم ہوئی، جب لیٹتے وقت اس نے مجھے بوسہ دیا تو میں نے نہایت متانت کے ساتھ اس سے کہا، "میرے پیارے ننھے یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اب دوبارہ اس کی سعی نہ کرنا" اس جملے سے اس کا تجسس بڑھ گیا اور دوسرے ہی دن ٹھیک اسی وقت وہ پھر اٹھا اور مجھے یہ آزمانے کے لئے جگایا کہ میں اس کی نافرمانی کی جراءت رکھتا ہوں یا نہیں، میں نے اس سے پوچھا، "کیا چاہتے ہو"۔ تو اس نے جواب دیا "پسند نہیں آتی ہے"۔ میں نے کہا۔ "یہ تو پھر تمہارے لئے بہت ہی برا ہے"۔ اور خاموش لیٹا رہا، اس طرز گفتگو سے وہ حیران و پریشان ہونے لگا، اور اُٹھ کر ٹٹولتا ٹٹولتا چقماق اور فولاد کے پاس پہونچا کہ خود موم بتی روشن کرنے کی کوشش کرے، میں نے جب اس کو چقماق اپنی انگلیوں پر مارتے اور رگڑتے ہوئے دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی، آخر کار یہ یقین کرنے کے بعد کہ چقماق پر وہ قابو حاصل نہیں کر سکتا ہے، اس کو میرے پاس لایا تو میں نے یہ کہہ کر کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی اس کی طرف سے پیٹھ موڑ لی، پھر کیا تھا، کمرے کے اندر ہی اس نے۔ گانا۔ چلانا، شور و غل مچانا اور وحشی جانوروں کی طرح کرسیوں سے ٹکراتے بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا، لیکن بہرحال اس بات کا خیال رکھا کہ خود کو کوئی چوٹ نہ لگائے، مگر مجھے چڑانے کے لئے بلبلا کر چلاتا رہا، ان تمام باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، لیکن میں نے یہ اندازہ لگایا کہ برا بھلا سننے اور میری خفگی کے لئے تو وہ ضرور تیار تھا، لیکن اس بے اعتنائی اور لاپرائی کا اس کو خیال بھی نہ تھا۔

میرے صبر کو اپنی ضد اور ہٹ کے ذریعہ مغلوب کرنے کی بہرحال وہ ٹھان ہی چکا تھا، اور اس نے اپنا

دغل اس کامیابی کے ساتھ جاری رکھا کہ بالآخر مجھے بھی غصہ آ ہی گیا، یہ میں نے پہلے ہی اندازہ لگالیا
باطنی غصہ کے اظہار سے سارا کیا دھرا خاک میں مل جائے گا، لہٰذا میں نے بالکل مخالف رُخ کی
لی میں خاموشی سے اٹھا، دیا سلائی کے بکس کے پاس گیا، وہ نہ ملا تو میں نے اس بچے سے مانگا جس نے
کامیابی کی خوشی میں فوراً ہی مجھے دے دیا، میں نے دیا سلائی سلگا کر موم بتی روشن کی اور اپنے کم عمر
ست کا ہاتھ پکڑ کر برابر کے ڈریسنگ روم میں لے گیا جس کی کھڑکیاں وغیرہ مضبوطی کے ساتھ بند تھیں
جس کی کسی چیز کو وہ توڑ بھی نہ سکتا تھا۔ اس کمرہ کے اندر اندھیرے میں اس کو چھوڑ کر میں نے باہر
بقفل کر دیا، اور خاموشی کے ساتھ اپنے بستر پر آن کر لیٹ گیا، کیا شور و غل مچایا ہے معاذ اللہ! مجھے اسی کی
قع بھی تھی، اس لئے میں نے اس کا کوئی خیال بھی نہ کیا، بالآخر شور و غل بند ہو گیا، اور میں نے اس کے
ٹھنے کی آواز سنی تو مجھے اطمینان ہو گیا، علی الصبح ہی میں اس کمرہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ننھا سا باغی
نے پر لیٹا ہوا اس تکان کے بعد کی اشد ضروری اور گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

معاملہ یہاں ختم نہ ہوا۔ اس کی ماں کو پتہ چلا کہ بچہ تقریباً رات بھر اپنے بستر کے باہر پڑا رہا ہے۔
ں اس سے سارا بنا بنایا کام بگڑ گیا، اُس کا بچہ مُردے کی مانند بن گیا اور انتقام کا بہتر موقع پا کر اس نے
ار بن جانے کا بہانہ کر دیا، اور یہ خیال نہ کیا کہ اس بہانے سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا، اس کے
لدین نے ڈاکٹر کو بلوایا، ماں کی بدقسمتی سے ڈاکٹر بھی عملی طور پر بڑا ہی مسخرہ تھا، اس نے ماں کی سراسیمگی کا
لطف اٹھانے کے لئے اس کی دہشت میں مزید اضافہ کرنے کی بڑی کوشش کی، بہر حال اس نے میرے
ان میں یہ کہہ دیا "آپ مجھ پر بھروسا رکھیں میں اس بچے کے بیمار پڑنے کے شوق کا کم از کم کچھ عرصہ تک
کے لئے علاج کر دینے کا پورا وعدہ کرتا ہوں"۔ فی الواقع اس ظالم نے بچے کو بستر پر پڑا رہنے اور غذا کی
احتیاط کرنے کی ہدایت دے کر علاج کے سپرد کر دیا، یہ دیکھ کر کہ بچے کی ماں کو بجز میرے ہر شخص دھوکا
دے رہا تھا مجھے بے حد افسوس ہوا، لیکن مجھ سے ہی وہ متنفر تھی، اس لئے کہ میں اسے دھوکا نہ دیتا تھا۔

ماں نے کافی برا بھلا کہنے کے بعد مجھے بتایا کہ اس کا بچہ ناز و نعم کا پروردہ اور تمام خاندان کا تنہا وہی
ایک وارث تھا، اور یہ کہ بہر قیمت اس بچے کی جان محفوظ رکھنی بڑی ضروری تھی اور یہ کہ کسی معاملہ میں بھی

وہ اِس بچے کی مخالفت پسند نہ کر سکتی تھی، اس معاملہ میں مجھے بھی اُس حد تک اس سے اتفاق تھا۔
مخالفت کے جو معنی وہ لیتی تھی اِس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ ہر بات میں بچے ہی کی اطاعت کی
میں نے دیکھا کہ مجھے ماں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرنا ہو گا جیسا کہ بچے کے ساتھ کیا گیا۔ پس میں
نہایت سرد مہری کے ساتھ اسے جواب دیا ور بیگم صاحبہ میں اس سے ناواقف ہوں کہ کسی جاگیر کے دا
کو کیوں کر تعلیم دی جاتی ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ میں اس فن کا مطالعہ کرنا بھی نہیں چاہتا، پس آپ
یہ فیصلہ قطعی خیال فرمائیں۔" چند دن میری اور ضرورت تھی اور باپ نے بھی معاملات ہموار کر دیئے
ماں نے اتالیق کو جلد واپس آنے کے لئے لکھا اور بچے نے یہ دیکھ کر کہ میرے آرام میں خلل ڈال
اور بیمار تک پڑ جانے سے اُسے کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا، بالآخر تندرست ہو جانے اور آرام سے
کا فیصلہ کر لیا۔

اس قبیل کی جن جن خود سریوں اور ہٹ دھرمیوں کی یہ ننّھا سا حاکم اپنے بدبخت اتالیق سے تعمیل
کراتا رہتا تھا، آپ ان کی تعداد کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ہیں، اس لئے کہ اس بچے کی تعلیم اس
ماں کے زیر نگرانی تھی اور وہ اپنے فرزند ارجمند اور وارث صلبی کی کسی خواہش کی عدم تکمیل کسی حال
نہ کر سکتی تھی، جب کبھی وہ باہر جانا چاہتے اسے بھی لے جاتے اور اس کے ہمراہ جانے کے لئے اتالیق
کو تیار رہنا لازمی تھا، اور اس کے لئے بچہ ہمیشہ ایسے وقت کا منتظر رہتا تھا جبکہ اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اتالیق کسی خاص کام میں بے حد مصروف ہے، میرے رات کے سکون کا انتقام دن میں لینے کے لئے
مجھ پر اس نے یہی داؤ چلانا چاہا، میں نے اسے بخوشی منظور کر لیا، اور اندیشہ بیّن طور پر یہ واضح کر کے کہ
خوش کرنے میں مجھے کس قدر لطف حاصل ہوتا تھا، پھر مابعد جب اس کے ان توہمات کے علاج
سوال پیدا ہوا تو میں نے ایک بالکل مختلف طریقہ اختیار کر لیا۔

اوّلاً اسے یہ جتا دینا ضروری تھا کہ وہ غلطی پر تھا، پس یہ کوئی مشکل بات نہ تھی، یہ جانتے ہوئے
بچہ محض موجودات ہی کی فکر میں رہتا ہے، میں نے دور اندیشی سے آسانی فائدہ اٹھایا، میں
اس کے لئے چند نہایت مرغوب خانگی مشاغل مہیا کر دیئے، پس ایک روز عین جبکہ وہ ان میں با

میں اس کے پاس گیا اور چہل قدمی کی خواہش ظاہر کی، اس نے انکار کیا میں نے اصرار بھی کیا پر بھی وہ متوجہ نہ ہوا تو میں خاموش ہوگیا، اس خاموشی کو اس نے دل ہی دل میں یاد رکھا۔
دوسرے دن میری باری آگئی حسب توقع جب وہ اپنے مشاغل سے تھک گیا تو میں نے دانستہ ل ہو جانے کا بہانہ کیا جو معاملہ کے تصفیہ کے لئے کافی تھا پس وہ میرے پاس آیا اور میرا کام بند ے مجھ سے چہل قدمی کے لئے چلنے کو کہنے لگا، میں نے انکار کیا تو وہ مُصِر ہوا۔ بالآخر اس سے کہدیا ب اب تک جیسا تم کہتے تھے ویسا ہی میں کرتا تھا۔ اب تم نے خود بتا دیا کہ میں کیا راستہ اختیار ں، اب اس وقت تو میں ہرگز باہر نہیں جاؤں گا۔ اس بچے نے جواب دیا۔ ''اچھا تو میں خود ہی جاتا ہوں''۔ میں نے کہا'' تمہاری خوشی''۔ اور پھر میں اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔
جب بچے نے دیکھا کہ میں نے اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کردیا تو اس نے ذرا بد دلی سی ، ساتھ اپنے کپڑے پہنے اور تیار ہو کر پھر میرے پاس آیا اور جھک کر ایک سلام کیا، میں نے بھی ا کر ہی جواب دیا، پھر اس نے مجھے مرعوب کرنے کے لئے مجوزہ معمول کی داستان سنائی۔ اگر آپ نتے تو خیال کرتے کہ شاید وہ دنیا کے دوسرے کنارے کے سفر کے لئے جا رہا ہے، میں نے ایت ہی خاموشی اور متانت کے ساتھ اسے خدا حافظ کہہ دیا میرے اس فعل سے وہ اور بھی زیادہ حیران ہوگیا لمن پھر بھی اس نے دل کو سنبھالے رکھا اور جب باہر جانے لگا تو ایک خدمت گار سے ساتھ چلنے کے لئے ہا۔ خدمت گار پہلے ہی سکھا پڑھا دیا گیا تھا اس نے جواب دیا کہ اُسے فرصت نہ تھی اس لئے کہ وہ میرے ام میں مشغول تھا اور نیز یہ کہ اس پر پہلے میرے حکم کی تعمیل فرض تھی، تھوڑی دیر کے لئے اچانک وہ بچہ ر کھلا سا گیا۔ بھلا اسے یہ کیسے خیال گذر سکتا تھا کہ اسے تنہا باہر جانے دیا جائے گا خصوصاً جب کہ بزعم باطل وہ اپنے آپ کو دنیا کی ایک اہم ترین ہستی خیال کرتا تھا اور اس تصور میں رہتا تھا کہ زمین اور آسمان کی ہر چیز اسی کی بہی خواہی کے لئے پیدا کی گئی تھی؟ بہر حال اس وقت اس نے اپنی کمزوری کو محسوس کرنا شروع کردیا، وہ یہ جان چکا تھا کہ اب وہ اجنبی لوگوں میں اپنے آپ کو تنہا پائے گا۔ اس نے پیش آنے والے خطرات کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا، لیکن محض ہٹ دھرمی اور خود سری ہی نے اسے ثابت قدم رکھا، بہت ہی

آہستہ آہستہ بہ جبر وہ زینے سے نیچے اترا اور بالآخر سڑک پر پہونچ گیا اور اپنے دل کو یہ اطمینان دلاتا رہا کہ
بہت اگر اسے ضرر پہونچ ہی جائے گا تو اس کی ذمہ داری کلیتہً مجھ پر ہی رہے گی۔

یہ جو کچھ ہوا بالکل میری توقع کے مطابق ہی ہوا۔ ہر چیز کا میں پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا، اور چونکہ
اس میں ایک قسم کے مظاہرہ عام کا سوال تھا، اس لئے میں نے اس کے باپ کی اجازت بھی حاصل کر
لی تھی، وہ بچہ بمشکل چند ہی قدم گیا ہوگا کہ ادھر اُدھر سے پھبتیوں کی آوازیں اس کے کان میں آنے لگیں
کوئی بولا بھیا یہ ننھا سا بھلامانس کیا حسین ہے؟ اکیلا کہاں جا رہا ہے؟ کہیں کھو یا نہ جائے میں ا
اپنے گھر بلا لاتا ہوں"۔ دوسرا بولا۔ خبردار دیکھو ایسا مت کرنا تم کیا یہ نہیں دیکھتے کہ یہ چھوٹا سا ایک ا
شریر بچہ ہے جسے گھر والوں تک نے نکال دیا ہے اس لئے کہ وہ کسی کام کا ہی نہیں ہے۔ بس
شریر بچے کو بھائی نہیں ہرگز نہ روکنا چاہیئے اُس کا جہاں جی چاہے چلا جانے دو"۔ پہلے نے جواب دیا۔
خیر خدا مہربان اس بچے کی حفاظت فرمائے، اگر اسے کوئی تکلیف پہونچی تو مجھے بے حد رنج ہوگا"۔ اس
بچہ تھوڑی ہی دور اور آگے بڑھا ہوگا کہ اسے ہم عمر چند شریر بچوں کی ٹولی مل گئی، ان بچوں نے اسے
چھیڑا اور اس کا مذاق اڑایا۔ الغرض یہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا اسے اتنی ہی زیادہ مشکلات سے دو
ہونا پڑتا تھا، بے یار و مددگار، تنہا ہونے کی وجہ سے وہ ہر کس و ناکس کے رحم و کرم کا محتاج ہ
اور اسے سب سے زیادہ تعجب تو اس واقعہ پر ہوا کہ اس کے شانے کی گرہ اور زریں فیتے تک کا بھی کس
احترام نہ کیا۔

بہر حال اس کی نگرانی میں نے اپنے ایک ایسے دوست کے سپرد کر دی تھی جسے وہ نہ جانتا تھا
پوشیدہ طور پر سایہ کے مانند اس بچے کے پیچھے پیچھے ہی لگا رہا اور مقررہ وقت گذر جانے کے بعد اس نے
گفتگو شروع کر دی پورشیونیک (POURCOVGNCE) کے ڈرامہ میں سبریگانی (SBRIGANI) کے
کے لئے ایک نہایت ہوشیار اداکار کی ضرورت ہوتی ہے، میرے دوست نے اس موقع پر اس پارٹ کو اس
ساتھ ادا کیا کہ بچے کو ڈرائے اور بزدل بنائے بغیر اس قدر خوفزدہ کر دیا کہ وہ بچہ اپنی مہم کی حماقت
ہو کر آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر میرے دوست کے ساتھ اس قدر شرمندہ اور لاچار ہو کر گھر لوٹ آیا کہ

ہوئے بھی ڈرتا تھا۔
کی اس ہزیمت اور شکست کی تکمیل کے لئے عین جبکہ وہ مکان میں داخل ہو رہا تھا اس کا باپ کہیں
نے کے لئے زینے سے اترتا ہوا مل گیا بچے کو یہ بتانا لازم تھا کہ وہ کہاں گیا تھا اور میں اس کے ساتھ
وجود نہ تھا۔ اس موقع پر اگر زمین پھٹ جاتی تو بے چارہ بچہ اس میں بخوشی سما جاتا، بہرحال اس کے
نے زیادہ ملامت کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ میری توقع کے خلاف بچے سے نہایت سخت لب ولہجہ
ں نے کہا۔ تم جب چاہو اکیلے باہر جا سکتے ہو لیکن ایک باغی اور سرکش کو میں اپنے گھر میں نہیں رکھ
پس آئندہ اگر تم اس طرح جاؤ تو یہ ذہن نشین کر کے جانا کہ پھر واپس نہ آؤ گے"
خود میں نے بلا کوئی الزام لگائے یا اس کا مذاق اڑائے ذرا متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا
یال کیا، اور اس خوف کے تحت کہ کہیں وہ ہماری اس اسکیم کو بھانپ نہ جائے میں نے اس روز ٹہلنے
سے بھی انکار کر دیا۔ دوسرے روز میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ میرے ہمراہ یہ بچہ ان لوگوں کے
نے سے نہایت فاتحانہ شان کے ساتھ گذرا جنہوں نے ایک روز قبل اکیلا پا کر اس کا اس قدر مذاق
تھا، اب آپ کو یقین کر لینا چاہئے کہ اس کے بعد سے مجھے ساتھ لئے بغیر باہر جانے کی پھر کبھی اس نے
انہ دی۔

اس طرز عمل اور اسی کے مانند دیگر ذرائع کے استعمال سے چند ہی دن کے اندر جن میں کہ مجھے
کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اس بچے کو لایعنی سیغوں سے پریشان کئے بغیر میں اپنی مرضی کے مطابق
سے کام کرانے اور پند و نصائح بغیر نامناسب کاموں سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گیا، پس جب میں اس سے
ں کرتا تھا تو وہ خوش ہوتا تھا اور جب خاموش ہو جاتا تھا تو وہ ڈرنے لگتا تھا، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ کچھ نہ
دال میں کالا ہے، اور اس سے سبق حاصل کر کے وہ سنبھل جاتا تھا، اب آئیے ہم اپنے اصل مضمون کی

ایسے موقع پر ایک بچے سے یہ کہتے ہیں کہ وہ سچ سچ بتا دے کوئی قباحت نہیں ہے، کیوں کہ یہ خوب
تا ہے کہ ایسا معاملہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس لئے اگر وہ جھوٹ بولنے کی کوشش کرے گا
فوراً پکڑا جائے گا۔

طرف پھر رجوع ہوں۔

اس قسم کی ورزش سے جسم خود قدرت ہی کی نگرانی میں طاقتور ہو جاتا ہے اور ذہن کو نقصان پہونچا
درکنار اس ورزش سے محض اسی قسم کی عقل پرداخت ہوتی ہے جس کا نو عمر بچہ اہل ہوتا ہے یعنی وہ عقل
اور سمجھ جو ہر عمر والے کے لئے بے حد ضروری ہوتی ہے ، یہ عقل ہم کو ہماری قوت کا استعمال ہماری ذات ہمارے
آس پاس کے دیگر اجسام کے تعلقات میں تمیز اور ان قدرتی اوزاروں کا استعمال سکھاتی ہے جو ہمارے
قابو میں ہوں اور ہمارے حواس سے مطابقت رکھتے ہوں ، کیا اس بچے سے زیادہ حماقت انگیز کسی ا
سے بھی ہو سکتی ہے جس نے اپنی ماں کے سائے میں مکان کے اندر پرورش پائی ہو اور جو وزن اور مدا
سے انجان ہونے کی وجہ سے ایک بلند درخت کو اکھاڑنے یا ایک چٹان کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہو پہلی
جب میں جنیوا کی آبادی کے باہر نکلا تو میں نے ایک سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کو پکڑنے کی کوشش
اور میں نے سالیوا پہاڑ (MONT SULIOE) پر جو مجھ سے دو میل کے فاصلہ پر تھا پتھر پھینکے ، سارے گاؤں
والوں کے لئے میں ایک مذاق بن گیا ، اور مجھے ایک اچھا خاصہ بے وقوف خیال کر لیا گیا ، قدرتی فلسفے کے
سبق میں ہمیں لیور (LEVER) کا استعمال اٹھارہ سال کی عمر میں سکھایا جاتا ہے ، حالاں کہ دیہات کا
بارہ سال کا بچہ اس کا استعمال کالج کے ہوشیار ترین میکانک سے زیادہ بہتر جانتا ہے ، کھیل کے میدان
جو بچے ایک دوسرے سے سبق حاصل کرتے ہیں وہ ان سبقوں سے صدہا درجہ قابل قدر ہوتے ہیں جو
کے کمروں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

ذرا بلی کی طرف غور فرمایئے جب وہ کسی کمرے میں گھستی ہے تو کونا کونا پھر کر سونگھتی اور وہاں کی ہر
کو جانچتی ہے ، الغرض دم بھر کے لئے نچلی نہیں بیٹھتی اور جب تک جانچ پڑتال کر کے اطمینان نہ کر لے ہر
چوکنی رہتی ہے پس جب بچہ چلنا پھرنا شروع کرتا ہے اور بقول شخصے اپنی ماحولی دنیا کے کمروں میں دا
ہوتا ہے تو اس کی بھی حالت ہوتی ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ آنکھیں تو دونوں استعمال کرتے
لیکن بچہ اپنا ہاتھ بھی استعمال کرتا ہے اور بلی قدرت کی عطا کردہ اپنی تیز ناک ۔ وہ یہی ذاتی فطرت ہے
جو صحیح یا غلط تربیت کے باعث بچے کو ذہین یا غبی ، ہوشیار یا سست اور عقلمند یا بے وقوف بنا دیتی

کیوں کہ انسان کا ابتدائی طبعی میلان ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کا اپنے ماحول سے مقابلہ کرے اور جانچے اور ہر چیز جس کا اس سے تعلق ہو جب اس کے سامنے آئے تو اس کے معقول خواص معلوم کرے، اس لئے حفاظت خود اختیاری کے لحاظ سے اس کا پہلا مطالعہ ایک قسم کی عملی طبعیات کا ہوتا ہے، اس سے محروم کر کے اس سے قبل کہ وہ دنیا میں اپنی مناسب جگہ حاصل کر سکے، بچے کو ذہنی مطالعوں میں مشغول کر دیا جاتا ہے، ہم دیگر اشیا کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات سے اسی زمانے میں واقف ہو سکتے ہیں جب کہ بچے کے نازک اور لچک دار اعضا ان اجسام کے ساتھ موافقت کر سکتے ہیں جن کے ساتھ کام کرنے کے لئے وہ بنے ہیں اور جس وقت کہ اس کے حواس قوی اور ہنوز تذبذب سے پاک ہوتے ہیں۔ کیوں کہ انسانی ذہن میں ہر شئے حواس ہی کے ذریعہ داخل ہوتی ہے، اس لئے پہلا ادراک آدمی کو اس کے حواس کے تجربات ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور یہی ذہنی ادراک کی بنیاد ہوتا ہے، قدرتی فلسفے کے ابتدائی استاد ہمارے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں ہی ہوتے ہیں، ان کی بجائے کتابیں پڑھنے سے ہمیں کسی قسم کی عقل نہیں آتی ہے، کتابیں ذاتی عقل بخشنے کی بجائے ہمیں دوسروں کی عقل کا استعمال یعنی بے علم کم اور تقلید زیادہ سکھاتی ہیں۔

کسی ہنر کی مشق کرنے کے قبل آپ کو پہلے اوزار حاصل کرنے چاہئیں، اور اگر آپ ان اوزاروں سے اچھی طرح کام لینا چاہتے ہیں تو وہ کافی مضبوط اور پائدار ساخت کے ہونے چاہئیں، کسی معاملہ پر غور و فکر کرنا سیکھنے کے لئے ہمیں اپنے اعضا یعنی حواس اور جسمانی آلوں کو جو ذہن کے اوزار ہیں استعمال کرنا چاہیئے اور ان اوزاروں سے بہترین کام لینے کے لئے وہ جسم جو ہمیں یہ اوزار عطا کرتا ہے بہت مضبوط اور صحت ور ہونا چاہیئے، یہ خیال کرنا کہ اصلی عقل جسم سے علیحدہ پرورش پاتی ہے نہ صرف بالکل غلط ہی ہے بلکہ حقیقتاً ورزشی اجسام ہی ذہنی عمل کو آسان اور صحیح بناتے ہیں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

شعبہ ــــ اسکول

زیڈ/۲۸۳۰ ۲۶ جنوری ۱۹۵۳ء • مرزا فدا حسین بی اے بی ٹی ۔ پی ۔ ای ۔ ایس (دوئم) ڈی ۔ آئی ۔ ایس منٹگمری ۔ شاہ لال دین سیٹھی کی جگہ بہ حیثیت ڈی ۔ آئی ۔ ایس سیالکوٹ تبدیل ہوئے ۔

• قاضی محمد نجیب اللہ ایم ، اے ۔ پی ۔ ای ۔ ایس (دوئم) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ ۔ قاضی کریم بخش پی ای ، ایس (دوئم) ، کی جگہ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز حلقہ ملتان مقرر ہوئے ۔

• ایم نذیر احمد قریشی پی ، ای ، ایس (دوئم) ڈی ، آئی ، ایس مظفر گڑھ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء سے چودھری علی محمد پی ای ، ایس کی جگہ ڈی ۔ آئی ، ایس ملتان مقرر ہوئے ۔

• ملک عبدالحمید لکچرر گورنمنٹ کالج لاہور ۔ محمد بشیر حسین ضیائی پی ، ای ، ایس کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گھکڑ مقرر ہوئے ۔

• م ۔ محمد مختار ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب ۔ قاضی محمد نجیب اللہ پی ۔ ای ایس کی جگہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

• م مستنصر باللہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان پی ۔ ای ، ایس (دوم) کی ایک خالی آسامی پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان مقرر ہوئے (۱۰ ، نومبر ۱۹۵۲ء سے)

• م ۔ محمد صادق ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور ۔ ایس عبدالرؤف کی جگہ ا ۔ ڈی ۔ آئی ۔ ایس ۔ سیالکوٹ مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

• م۔ غفور عالم۔ ڈپ۔ ان۔ ایجوکیشن (لندن) معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

• م۔ عبدالغنی قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس برائے تربیت جسمانی (لائل پور) م۔ خیر محمد کی جگہ قائم مقام اے ڈی۔ آئی۔ ایس برائے تربیت جسمانی ڈیرہ غازی خان مقرر ہوئے۔

• م۔ سعید اللہ خان قائم مقام معلم برائے تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری۔ م۔ عبدالغنی شیدا کی جگہ قائم مقام اے، ڈی، آئی، ایس برائے تربیت جسمانی لائل پور مقرر ہوئے

• م۔ نورالدین بی اے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ۔ م۔ عبدالمجید کی جگہ قائم مقام اے، ڈی، آئی، ایس، شاہ پور مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

• م۔ فیروزالدین ایک عیسائی امیدوار م۔ محمد رمضان کی جگہ (جن کا انتقال ہو گیا ہے) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال مقرر ہوئے۔

• م۔ سجاد حسین جعفری ایک امیدوار۔ م کرم داد کی جگہ ۵ نومبر ۱۹۵۲ء سے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ مقرر ہوئے۔

ای/۱۳۱ ۲۹ • م۔ محمد حنیف بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار م۔ محمد اکرام کی جگہ (جو تبدیل ہو گئے ہیں) معلم ۲۴ جنوری ۱۹۵۳ء انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال (سیالکوٹ) بمشاہرہ (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) مقرر ہوئے۔

(تاریخ حاضری سے)

ای/۲۹۲۹ • م۔ محمد بشیر بی۔ ایس، اسی (زراعت) ایک امیدوار ایک خالی آسامی پر معلم زراعت گورنمنٹ ۲۶ جنوری ۱۹۵۳ء نارمل اسکول کمالیہ بمشاہرہ (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) ایک سال کے لئے عارضی مقرر ہوئے۔

• م۔ حبیب اللہ ایس۔ وی (زراعت میں تربیت یافتہ) معلم گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ احمد یار بسمل کی جگہ گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ میں ورناکیولر ٹیچر مقرر ہوئے۔

• م۔ احمد یار بسمل ورناکیولر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ م۔ غلام محمد کی جگہ معلم گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ۔

ای/۱۴۸۵ ۱۰ م۔ محمد نثار احمد ایک امیدوار م بشیر الدین بی اے ، بی ۔ ٹی کی جگہ (جن کا تبادلہ سنٹرل ماڈل ۱۵ جنوری ۱۹۵۳ء ہائی اسکول میں ہوگیا ہے) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول قصور ۱۵ جنوری ۱۹۵۳ء یا تاریخ حاضری سے۔

ای/۱۴۵۰۷ م۔ محمد رشید ایف ۔ ایس ، سی ، بی اے ۔ بی ، ٹی ۔ ایک امیدوار جن کے تقرری کے احکام ۸ جنوری ۱۹۵۳ء گورنمنٹ ہائی اسکول ظفر وال کے لئے صادر ہو چکے تھے ، چودھری رشید احمد ایم اے ۔ بی ، ٹی کی جگہ سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ مقرر ہوئے۔

• م۔ محمد مصطفےٰ نارخاں ۔ بی ، ایس ، سی ۔ بی ، ٹی ۔ ایک امیدوار م محمد افضل کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ کے لئے ہوگیا ہے ۔ قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ظفر وال مقرر ہوئے۔

شعبہ ——— کالج

ای/۷۷۱۴۰ م۔ نور محمد ایم ، ایس سی (اول) عارضی لکچرر طبیعیات ڈی مانٹ مورنسی کالج سرگودھا ۔ ایک ۴ فروری ۱۹۵۳ء خالی آسامی پر اسی کالج میں قائم مقام لکچرر طبیعیات مقرر ہوئے۔

ای/۷۲۳۳۰ م۔ اکرام الحق ایم ، ایس سی ، لکچرر طبیعیات گورنمنٹ کالج راولپنڈی (آزمائشی بمشاہرہ (۲۲۵ - ۱۵ - - ۴۵) ۹ اپریل ۱۹۵۲ء سے اپنے عہدے پر مستقل ہوئے۔

زیڈ/۷۹۳ ۰ م۔ احسن الٰہی بی ، اے عارضی اسسٹنٹ ماسٹر سینئر اسکول ۔ لارنس کالج ۔ گھوڑا گلی ۔ ایک ۷ جنوری ۱۹۵۳ء خالی آسامی پر بطور آزمائشی ایک سال کے لئے اسسٹنٹ ماسٹر سینئر اسکول ۔ لارنس کالج گھوڑا گلی (راولپنڈی) مقرر ہوئے۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

، شمارہ ۱۲] لاهور [مارچ ۱۵۳

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدا
ایم

تعلیمی ماہ نامہ

مارچ ۱۹۵۳ء

جلد ۵

شمارہ ۱۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ائنس کانفرنس

۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں پاکستان کی پانچویں سائنس کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا
ن فرنس مسلسل چھ دن تک جاری رہی، غیر منقسم ہندوستان میں سائنس کے میدان میں پچھلے پچاس
میں جو ترقی ہوئی اور سائنس کی ترویج کے لئے جو ادارے قائم ہوئے وہ سب کے سب ہندوستان میں
گئے، اپنی جغرافیائی ساخت کی وجہ سے پاکستان کو اس میں سے کچھ حصہ نہ مل سکا، سائنٹفک
ینوں اور کتب خانوں کا بھی یہی حال رہا، اس لئے اس ملک میں سائنس کی تعمیر نو کے لئے
ائنس دانوں کو سینکڑوں دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا، لیکن اپنی اس بے مائگی کے باوجود انھوں نے
ی کوششوں کو جاری رکھا اور سائنس کو فروغ دینے کے لئے دسمبر ۱۹۴۷ء ہی میں ایک ایسوسی ایشن
بنیاد ڈالی گئی۔

اس کانفرنس میں ملکی اور غیر ملکی مندوبین کی تعداد کم و بیش تین سو تھی جن میں برطانیہ امریکہ
ر، ترکی، یونیسکو اور دوسرے ممالک کے نمائندے بھی شامل تھے۔ ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء کو
ناب اسمعیل ابراہیم چندریگر صاحب۔ گورنر پنجاب نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا اپنی افتتاحی
ریر میں آپ نے فرمایا۔ "اسلام سائنس کی ترقی میں کبھی مانع نہیں آیا، بلکہ اس نے توجہ اشاعت حیات
تحصیل علم پر سب سے زیادہ زور دیا، اور اب یہ مسلم سائنس دانوں کا کام ہے کہ سائنس کی ترقی میں نمایاں
ہ لے کر دنیا کے سامنے اپنی ذہنی بلندی کا ثبوت پیش کریں۔ ...... سائنس دانوں نے ایک طرف تو
ں علم کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے اور دوسری طرف انسانوں کو ہلاک کرنے کے لئے خطرناک اور تباہ کن

ہتھیار تیار کر لئے ہیں، مجھے امید ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو انسانی تباہ کاری کے لئے استعمال نہیں کریں گے، بلکہ عام انسانی فلاح و بہبود ہی ان کی زندگی کا مقصد ہو گا"

اس اجلاس کا سب سے زیادہ نمایاں اور لائق ستائش کارنامہ" پاکستان سائنس اکادمی کا قیام ہے عزت مآب خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان نے اس اکادمی کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس اکادمی کا قیام ملک کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی کی بہت بڑی ضمانت ہے۔ آج اس کانفرنس میں مختلف ممالک کے سائنس دان موجود ہیں، ان کی شرکت سے مجھے اور بھی زیادہ مسرت ہوتی ہے کہ علم و حق آگہی کی تلاش جغرافیائی حدود کی پابند نہیں ہوتی ...... آپ کو معلوم ہے کہ قیام پاکستان سے ماقبل و مابعد بھی ہمیں دشوار گذار مرحلوں سے گذرنا پڑا، ہماری ان پریشانیوں کا ایک سبب اچھے سائنس دانوں اور ماہرین فن کی کمی بھی ہے .... ہمیں ہر کام کو از سر نو شروع کرنا ہے اور نئے جوش و ولولہ اور عزم و ہمت کے ساتھ پاکستان کی ترقی و تعمیر کے غیر محدود امکانات کو دیکھ کر ہمیں یہ بجا طور پر محسوس ہوتا ہے کہ جو کام ہم نے شروع کیا ہے اس کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے اور مجھے انتہائی خوشی ہے کہ پاکستان کو ایک ترقی یافتہ مملکت بنانے میں ہمارے سائنس دان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے"۔

تحصیل و تحقیق علم کا حوالہ دیتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا "اسلامی نظریۂ حیات کی سب سے بڑی خدمت زندگی کے مادی اور روحانی پہلو کو ہم وار اور متوازن رکھنا ہے، ہمارے یہاں سائنس اور مذہب میں ایسے متبائن، تنازع اور بے جوڑ رجحانات کا اندیشہ نہیں ہو سکتا جس نے مغرب میں ناخوشگوار صورت حال پیدا کر دی ..... آج ہر سائنس دان، فلسفی، اور سیاست دان کی زبان سے ہم یہی سنتے ہیں کہ سائنس اور دوسرے علوم میں تو انسان نے کمال حاصل کر لیا ہے، لیکن اس مادی ترقی کی نسبت ابھی ہم میں اتنی اخلاقی بلندی نہیں پیدا ہو سکی، لوگ اس حقیقت کو بیان تو کرتے ہیں، مگر اب تک کسی نے اس مرض کا کوئی علاج تجویز نہیں کیا، یورپ میں مذہب اور سائنس میں جو جنگ جاری رہی، اسے میں انسانی زندگی کا بہت بڑا سانحہ سمجھتا ہوں، اس تگ و دو میں، باوجود اپنی مساعی

اور جدوجہد کے مذہب کو رفتہ رفتہ میدان سے ہٹ جانا پڑا، چوں کہ ایسے ادارے انسانی زندگی کے لئے موثر عوامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ کی اکادمی اس اسلامی پس منظر کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لئے سرگرم عمل رہے۔"

ان افتتاحی جلسوں کے بعد کانفرنس مختلف شعبوں میں تقسیم ہو گئی، کانفرنس کے احاطۂ کار اور ہر شعبے کے کام کی نوعیت کا جائزہ لینے کے لئے اس کے مختلف شعبوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا ضروری ہے، ان شعبوں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) شعبۂ کیمیا (۲) شعبۂ حیاتیات (۳) شعبۂ طبیعات (۴) شعبۂ زراعت

(۵) شعبۂ ارضیات وجغرافیہ (۶) انجینئرنگ کا شعبہ (۷) شعبۂ طب (۸) شعبۂ تعلیمات

دوسرے دن سائنس کانفرنس کے مختلف شعبوں کے اجلاس علیحدہ علیحدہ منعقد ہوئے اور ہر شعبے میں مختلف سائنٹفک موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔ ان مقالات کی روشنی میں جو مذاکرے ہوئے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں تھے۔

اس کانفرنس کا شعبۂ تعلیمات، عمرانیات اور نفسیات پروفیسر بشیر ہاشمی صاحب پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی زیرِ صدارت اور ان کی نگرانی میں مصروف کار رہا، اپنے خطبۂ صدارت میں موجودہ سیاسی اور سماجی رجحانات کا مجمل ساخاکہ پیش کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "صحیح جمہوری نظام کا قیام ہنگامی نہیں ارتقائی ہوتا ہے، لوگوں کی زندگی میں اس کا اثر رفتہ رفتہ ہوتا ہے اور کسی قوم کی اخلاقی تعمیر کے لئے طویل مدت درکار ہوتی ہے، عبوری دور میں لوگ بالعموم ایمان داری کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں لیکن عملاً ایمان داری سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا، زبان پر ملک و ملت کی خدمت کے بلند بانگ دعوے ہوتے ہیں، لیکن مقصد ذاتی منفعت ہوتا ہے ..... بہرصورت جمہوری تقاضے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں جمہوری قدریں واضح اور متعین ہو جاتی ہیں، میں اس موضوع پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا، میرا مقصد تو محض یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں پچھلے وقتوں سے کہیں زیادہ ہنگامہ پرور ہے

س لئے خواہ ہمارا نظام کار جمہوری ہو یا غیر جمہوری، نظریاتی اختلافات کا ہونا ناگزیر ہے، ان اختلافات
دور کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں لیکن بحیثیت معلم، ہم تو زندگی کے اس شعبے کا جائزہ لیں گے
س کا تعلق تعلیم سے ہے، مجھے یقین ہے کہ تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے جو کسی جمہوری نظام کو
رنق احسن چلانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔"

عالمگیر امن کے قیام کے سلسلے میں پاکستان جو کام انجام دے سکتا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے
پ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا۔ "دنیا کے موجودہ حالات کے مطالعہ سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے
اس وقت بین الاقوامی افق پر "جنگ" یا "امن" کے بادل چھا رہے ہیں، ہر ملک میں دفاع اور اسلحہ
بشیر رقوم خرچ کی جا رہی ہے۔ لیکن ہر ملک جنگ سے خائف ہے، اگر تیسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی
یہ اقدام فی الواقع انسانی تباہی کا موجب ہوگا، بحیثیت پاکستانی اور ادارۂ اقوام متحدہ کے رکن کی
یثیت سے ہمیں بھی ان مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں
سروں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"قیام پاکستان کے لئے جو جذبہ کام کر رہا تھا، وہ دراصل اسلامی نظریۂ حیات ہے اور اسے میں جملہ
ظریات میں سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ مسلمان ممالک کے معیار زندگی کو دیکھ کر مجھے اپنے دعوے کے کھوکھلے پن کا
حساس ہوتا ہے، جہل، تعلیمی پستی، بیماری، افلاس یہی تو ان قوموں کے نصیب میں ہے، جو اپنے آپ
و مسلمان کہتی ہیں جس عدل و انصاف، احترام آدمیت، آزادی گفتگو اور آزادیٔ کار کا معیار رسول برحق
نے قائم کیا تھا، آج وہ ناپید ہے کہ ہم خود دوسروں کے سامنے خجل اور شرمندہ ہیں، لیکن پاکستان ایک
سلامی مملکت ہے، بانیٔ پاکستان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس خطۂ زمین میں لوگ اسلامی شعائر اور اسلامی نظریات کے
طابق زندگی بسر کریں گے، اس برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے قیام کے لئے جو جدوجہد کی اس کا مقصد
ہی تھا کہ ہم دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیں کہ اسلامی نظریۂ حیات سب سے اعلیٰ و ارفع ہے، قیام پاکستان کے
بعد کیا اسلامی نظریات کی قوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟"

مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور اخلاقی زندگی پر بحث کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ "مذہب اور اسلامیات

تدریس کا مقصد اگر محض معلومات بہم پہونچانا ہی ہے تو اس سے ہمیں کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں کرنی چاہیئے، اور مغرب کے معاشی اور سیاسی نظام کی تقلید بھی ہمیں منزل کے قریب نہیں لا سکتی، اس کے حصول کے لئے تو

(۱) ہمیں سنن نبوی کا مطالعہ کرنا ہوگا اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ رسول پاکؐ ارشادات الٰہیہ کو کس طرح اپنے صحابہؓ تک پہونچاتے تھے، کس طرح وہ ان الہامی حقائق کو اپنے پیروؤں کی روزمرہ زندگی سے ہم آہنگ کرتے تھے اور کس طرح انھوں نے ایک ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی جس کا ایک ایک فرد ہر شعبۂ زندگی میں قیادت کا بار سنبھال سکتا تھا، خواہ وہ مذہبی ہو یا فوجی، سیاسی ہو یا معاشی۔

(۲) ہمیں پاکستان میں سماجی علوم (سوشل سائنس) کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنا ہوگا، جہاں سماجی تعلقات، اجتماعی قوت محرکہ، ثقافتی روابط، قیادت، انفرادی تعلقات وغیرہ کے مطالعہ کا اہتمام جدید ترین مغربی تکنیک کی روشنی میں کیا جا سکے۔"

ہم انشاء اللہ اس پورے خطبے کو آموزش کی اگلی اشاعت میں شائع کریں گے۔

نوجوانوں کی رُوحانی تربیت

فضل احمد

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں جب مرحوم صدر روزویلٹ نے اپنے جنگی مقاصد کی وضاحت کی تو سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا تھا کہ وہ دنیا میں ایسے دور کا آغاز چاہتے ہیں جس میں نوع انسان احتیاج اور خوف سے آزاد ہو کر زندگی بسر کر سکے۔ اتحادیوں نے جنگ تو جیت لی لیکن کیا آج دنیا ان دونوں قابوسوں کے پنجے سے آزاد ہے؟ احتیاج سے آزادی کا حال تو اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن کی رپورٹیں آئے دن بیان کرتی رہتی ہیں جن کے مطابق عامۃ البشریت کو بیسویں صدی کی* بدنی اور ذہنی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے*۔ باقی رہی خوف سے آزادی تو اس بارے میں چپ ہی بھلی ہے، پہلے تو صرف چھوٹی چھوٹی اور پسماندہ قومیں ہی بیم زندگی میں مبتلا رہا کرتی تھیں دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے بڑی سے بڑی قوموں کے لئے بھی چین کی نیند حرام ہو چکی ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ اس صدی کی پہلی چند قرنوں تک جس طرح عالمی معاملات سے عموماً الگ تھلگ رہا ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے، پہلی عالمی جنگ کے آخری مرحلہ پر یہ ملک بعد مشکل اس بات پر آمادہ ہوا تھا کہ جنگ میں دخل دے اور جب جنگ ختم ہو گئی اور جمعیۃ اقوام کی داغ بیل پڑنے لگی تو امریکی قوم نے صدر ولسن کی خواہشات کے خلاف پھر سے اپنی روائتی علیحدگی کی طرف رجوع ضروری سمجھا، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس قوم کو اپنے قومی انزوا پر ناز تھا مشرق اور مغرب دونوں طرف سے وسیع اور گہرے سمندر اسے پرانی جھگڑالو دنیا سے الگ کئے ہوئے تھے، اور خواہ مخواہ پرائے جھگڑوں میں

پہنچ بنتا گویا قومی توانائی کو بیکار گنوانا تھا، دوسری عالمی جنگ نے اس امر کی ازدواکا ہمیشہ کے لئے
غائر کر دیا ہے، گویا جو جنگ خوف کا خاتمہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھی اس نے اس نعرہ کے بلند کرنے
والوں کو بھی مستقل طور پر خوف کا شکار بنا دیا ہے، جب امریکہ جیسے پرعظمت اور الگ تھلگ ملک کا
یہ حال ہے تو باقی اقوام کی حالت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، آج دنیا جس خوف و ہراس کے دور میں
گذر رہی ہے اس کو دیکھ کر اسرائیلی پیغمبر حضرت جرمیہ کے تاریخی الفاظ یاد آنے لگتے ہیں، جب
آپ نے فرمایا تھا: "ہم امن کی امید لگائے بیٹھے تھے، مگر افسوس کہ زخموں کے اچھا ہونے کی مہلت
بھی نہ ملی، ہماری سب امیدیں خاک میں مل گئیں"۔

موجودہ دنیا کی سیاسی تصویر کا یہ رُخ بہت سبق آموز ہے، سائنس اور تکنیک کی حیرت انگیز
ترقیوں نے بیسویں صدی کے مہذب انسان کو اس فریب میں مبتلا کر دیا تھا بس اس نے زندگی کے
تمام انتہا، بھید پائے اور وہ بہت جلد معراجِ انسانیت پر پہونچا ہی چاہتا ہے، اسے اپنے مادی اسباب
کی جادو اثری پر پورا بھروسا تھا، کیونکہ ان اسباب کی بدولت ان کا قدم آگے ہی آگے بڑھتا گیا تھا مگر
اس صدی کی دو جنگوں نے اس طلسم فریب کا سارا بھرم کھول کر رکھ دیا ہے، آج انسان کے ہاتھ میں
تن آسانی کے سارے مادی ذرائع موجود ہیں۔ مگر اسے روحانی چین نصیب نہیں۔ وہ ہرچند اپنی
سائنسی ترقیوں کی مدد سے انسانی دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہے، مگر دنیا کی اجتماعی زندگی کی گتھیاں بجائے
سلجھنے کے روز بروز زیادہ سے زیادہ الجھتی جاتی ہیں اور مادی ترقیاں روحانی سکون کے بارے میں
بالکل بے بس نظر آتی ہیں، اس نقصے نے مغربی دنیا کو سائنسی تکنیک کے علاوہ کسی اور چیز کا سہارا
تلاش کرنے پر مجبور کیا ہے، انگلستانی مدرسوں میں اجتماعی عبادت لازمی قرار دی جا چکی ہے اور امریکی
ماہرین تعلیم بھی نوجوانوں کی روحانی تربیت پر زور دینے لگے ہیں، یہ احساس اب زور پکڑ رہا ہے کہ
ہرچند یہ بتانا مشکل ہے کہ موجودہ دور کشمکش کے بطن سے کس قسم کا نظام عالم جنم لے گا، تاہم یہ بات
یقینی ہے کہ اس نئے نظام کے خدوخال متعین کرنے میں، ایمان و یقین کی قوت کو بہت دخل ہو گا۔
کیوں کہ جب تک انسانی تعلقات کا رُخ اخلاقی اور روحانی اقدار کی روشنی میں مقرر نہ کیا جائے

اس وقت تک ان کی پائداری پر بھروسہ ممکن نہیں۔

آج عالمی صورت حال کی سب سے نمایاں خصوصیت عدم یقین اور پریشان خیالی ہے جنگ کے صبر آزما ابتلا اس امید میں کٹ گئے تھے کہ چین کی گھڑی زیادہ دور نہیں، جنگ ختم ہوتے ہی ہر جگہ سے آوازیں اٹھنے لگیں کہ زمانہ جنگ کی پابندیوں اور کفایت شعاریوں کا یک قلم خاتمہ ہو جانا چاہیئے، ہر کس و ناکس مادی آسائشوں کا اضافہ چاہتا تھا، اور نہایت بے تابی سے یہ سوال پوچھتا تھا کہ پرانی فراوانی کے راستے میں اب کونسی چیز حائل ہے؟ جب یہ پتہ چلا کہ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی اگلی جنگ کی تیاری شروع ہو چکی ہے تو قدرتی طور پر اکثر لوگ خوف، عدم یقین، تشکک اور پریشان خیالی کا شکار ہونے لگے، اور اب حالت یہ ہے کہ لاکھوں انسان مسلمہ معیاروں اور قدروں کو بے معنی سمجھنے لگے ہیں انہیں سب سے زیادہ پریشان کرنے والی بات یہ ہے کہ ایسی مادی ترقیوں سے آخر کیا حاصل جو انسان کے قابو میں نہ رہ سکیں؟ اگر یہ ہماری تن آسانی کو بڑھانے کی بجائے الٹا ہمیں خوفزدہ کرنے لگیں تو آخر ان سے کیا فائدہ، ایسے لوگوں کو یہ سبق سکھانے کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی شخص ساری دنیا کو قابو میں کر لے اور خود اپنی روح کو کھو دے تو ایسی کامیابی سے کیا حاصل؟

موجودہ پُرآشوب دور تاریخ کے ان پرفتنہ زمانوں میں سے ہے، جب انسانوں کو اپنے معتقدات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، آج ہر صاحب فہم آدمی کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیئے کہ وہ کس نصب العین اور کن اقدار کی خاطر جیتا ہے، وہ کون سی روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں جنہیں وہ فتنہ کی دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے، اور اگر ضرورت پڑے تو ان کے بچاؤ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہتا ہے، جو شخص کوئی ایسا نصب العین یا کوئی ایسی اقدار نہیں رکھتا وہ ایک ایسے جرم کا مرتکب ہے، جسے نوع انسان کبھی معاف نہیں کرے گی کیونکہ وہ آئندہ نسلوں کو ایسے مستقبل میں دھکیلنے والا ہو گا جس کے خدوخال کے متعلق کسی کو کچھ خبر نہیں۔

آج نوع انسان کو ہر چیز سے بڑھ کر امن کی ضرورت ہے، تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ اپنی

ت کے پھل کھا سکے اور اپنے پسندیدہ معتقدات پر آزادی سے عمل کر سکے، یہ امن اور سلامتی کس طرح
صل ہو، سائنس اور علوم و فنون کی ہوشربا کامرانیاں اس میدان میں ہار مان چکی ہیں، بلکہ ان کی
ر نئی کامیابی ایک نئی تباہی کا پیغام لانے والی ثابت ہوئی ہے، اس ہجوم یاس میں امید کی کرن
ہاں سے آئے، اس سوال کے جواب میں یوں تو دنیا کے کئی حصوں سے آوازیں اٹھ رہی ہیں
لین اگر پاکستانی اساتذہ چاہیں تو غالباً اس کا بہترین جواب دے سکتے ہیں، شاید یہ فقرہ بعض
وں میں "چھوٹا منہ بڑی بات" کا خیال پیدا کر دے، لیکن سچ یہ ہے کہ ایسا خیال خود فراموشی کے سوا
چھ نہیں کیوں کہ گو دوسرے لوگ فن اور تکنیک میں بدرجہا آگے ہوں۔ ایمان و یقین میں ہمیں
سی سے پیچھے نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس خاص میدان میں ہمیں اوروں کو راستہ دکھانا چاہیئے۔

اس نکتے کو کچھ اور صاف ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ اس گمان کا شائبہ نہ رہے کہ محض خوش فہمی سے
ام لیا جا رہا ہے، پاکستان کا قیام عہد حاضر کی تاریخ میں ایک نہایت معنی خیز واقعہ ہے بلکہ
ظری پہلو سے یہ کہنا صحیح ہے کہ تاریخ میں یہ اپنی نظیر آپ ہے، یہ درست ہے کہ اس سے
پہلے بہت سی مسلمان حکومتیں دنیا میں مدتوں قائم رہیں، اور آج بھی دنیا کا نقشہ ان کے وجود
سے خالی نہیں، لیکن تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے جب ایک ملت نے اپنے لئے ایک وطن کا مطالبہ
رف اس بنا پر کیا کہ وہاں اسلامی اقدار زندگی کو رواج دیا جائے، حصول آزادی کے بعد
ب ہماری تعلیمی زندگی کا نقشہ تیار کیا جانے لگا تو یہ بات کھلے کھلے لفظوں میں کہہ دی گئی تھی
کہ اس تعمیر کی ساری بنیاد اسلامی اقدار پر اٹھائی جائے گی، آج دنیا میں دو متضاد فلسفہ ہائے حیات
سارے کرہ ارض پر چھا جانے کے لئے دست بگریباں ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ
وہ خلاصہ انسانیت ہے اور اگر وہ مٹ گیا تو انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماتم کرنا ہوگا، ہمیں ان
دونوں فلسفوں میں سے کسی کے ساتھ خاص عناد نہیں، یہ بھی درست ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں
بعض پہلو ایسے ہیں جو اسلامی اقدار زندگی سے بہت قریب ہیں، آج یہ دونوں حریف اقوام عالم کو
للکار للکار کر اپنی طرف بلا رہے ہیں اور ہر ایک یہ یقین دلا رہا ہے کہ نجات صرف اسی کے جھنڈے تلے ہے۔

اس صورت حال میں پاکستان کو کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے؟ بہت سے فہمیدہ پاکستانی ایسے ملیں گے جو دونوں فریقوں میں سے ایک نہ ایک کی طرف داری کو پسند کریں گے لیکن کیا یہ راہ اس نصب العین کی طرف لے جانے والی ہو گی جس کے نام پر ہم نے الگ وطن حاصل کیا ہے! ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صریح نفی میں ہے، پاکستان سچی اسلامی اقدار کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے اور سچی اسلامی اقدار ہی سرگشتہ انسانیت کے دکھوں کا صحیح حل پیش کر سکتی ہیں۔ پاکستان کو دنیا کی تقدیر پلٹنے میں ایک نمایاں حصہ لینا ہے اور یہ بات اسی صورت میں ہو گی جب ہم اپنے ہاں سچی اسلامی اقدار کو رواج دے سکیں، ان اقدار کے مروج ہونے کی عملی صورت کیا ہو؟ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ مقننہ اور عاملہ کا ڈنڈہ یہ سارا کرشمہ چٹکی بجاتے میں کر دکھائے گا، تاہم معاشری علوم میں سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ کرشمہ مقننہ اور عاملہ کے ہاتھوں نہیں بلکہ ہمارے مدرسوں کی ہمت سے پورا ہو گا، سچی اسلامی اقدار اس وقت اساس زندگی بنے گی جب ہمارے مدرسوں اور کالجوں سے نکلنے والے نوجوان یہ زندہ یقین اور آتشین جذبہ ساتھ لے کر نکلیں گے کہ انسانیت کی نجات نہ اشتراکیت میں ہے نہ مغربی جمہوریت میں۔ انفرادی۔ اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی زندگیوں میں سلامتی کا راستہ صرف دین فطرت کا بتایا ہوا راستہ ہے، وہ راستہ جو مادی اور روحانی افراطوں سے یکساں دامن بچاتا ہوا ہر دو کے بین بین اعتدال کی ایسی سیدھی راہ تجویز کرتا ہے جس پر چلنے والوں کے لئے امن و سلامتی کی نعمتیں مقدر ہو چکی ہیں۔

اس مقصد کو پورا کرنے کی ایک اہم شرط ہماری معاشری زندگی کی اصلاح ہے، مدرسوں میں لاکھ چیخ پکار کی جائے کہ اسلام اخوت اور مساوات کا سبق دیتا ہے، مگر جب تک گردوپیش کی معاشری زندگی میں غیر اسلامی اقدار کی حکمرانی ہے، اس وقت تک مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے ذہنوں میں خلجان پیدا کرنے کی بجائے اور کیا کر سکتی ہے؛ شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہزاروں کے مجمع میں فرمایا تھا کہ میں نے تمہارے سارے جھوٹے گھمنڈ پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔ لیکن

آج ہماری معاشرتی زندگی کے ستونوں میں سے کتنے ہیں جو ان چھوٹے گھمنڈوں پر اتراتے نہیں تھکتے، ذات پات اور دولت کے غیر اسلامی معیاروں کو کس حد تک خیرباد کہا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ہم دنیا کو ہدایت کی راہ دکھانا چاہتے ہیں تو خالی باتوں سے کام نہیں چلے گا، بلکہ ہمیں عملی نمونہ دکھانا ہوگا، قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات تو ہر زمانے میں جوں کی توں موجود ہی ہیں، اگر خطرہ رہا ہے۔ تو ان تعلیمات کے عملی نمونے کا، پس ہمیں سب سے پہلے اپنی معاشرتی زندگی کو تمام غیر اسلامی اثرات سے پاک کرنا ہوگا، یہ کام بے شک متقننہ اور عاملہ کے کرنے کا ہے، یہ بھی درست ہے کہ یہ کام چنداں آسان نہیں، صدیوں سے ہماری معاشرتی زندگی پر عجمی اور ہندی آریائی اثرات کے غلاف پر غلاف چڑھتے چلے آئے ہیں، جہالت اور توہم پرستی نے ان غیر اسلامی غلافوں کو حقیقت اسلام کا درجہ دے رکھا ہے، ان کثیف اور سیاہ پردوں کو چیر کر حقیقت کے نورانی چہرے کو نمایاں کرنا ہوگا، جب یہ ہوگا تو آئندہ پود کی سچی اسلامی تربیت کا راستہ بہت کچھ صاف ہو جائے گا۔

ہماری تعمیر نو کے متعلق دو آوازیں زیادہ نمایاں طور پر سنائی دیتی ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو نہایت خلوص سے اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا لباس، ہماری وضع قطع اور ہمارے رہنے سہنے کے طریقے "غیر اسلامی" ہیں، جب تک ہم ان چیزوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑ پھینکتے اس وقت تک اسلامی اقدار کا احیاء ناممکن ہے، قومی استحکام اور ملکی عظمت کی اور کوئی راہ نہیں دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دورِ حاضر کی مادی ترقیوں سے بے حد متاثر ہیں، ان کی دیانتداری سے یہ رائے ہے کہ ہمارے لئے ترقی اور استحکام کی واحد راہ یہ ہے کہ جدید علوم کے ساتھ ساتھ جدید تہذیب کی ساری تکنیک کو بھی اپنائیں، یہ دونوں فریق ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ کہ ملّی عظمت و استحکام کی بنیادیں ہمیشہ دلوں میں استوار کی جاتی ہیں مادی اسباب پر نہیں اگر مذہب کے ظاہری لوازمات ہی سربلندی کے ضامن ہوتے تو عالم اسلام پر کبھی ذلت طاری نہ ہونے پاتی کیوں کہ ان ظاہری لوازمات کے بارے میں ہم صدیوں تک سرفراز رہے ہے، اسی طرح اگر عہد حاضر کی سائنسی اور میکانکی ترقیاں ہی سب کچھ ہوتیں تو ہمارے دوبارہ زندہ ہونے کے

امکانات کبھی پیدا ہی نہ ہوتے، پس اصلی چیز وہ بے تاب روح ہے جو نہ صرف اپنے حامل کی کایا پلٹ دیا کرتی ہے، بلکہ جس کی ضیا پاشی گردوپیش میں بھی دور دور تک اجالا کر دیا کرتی ہے یہ روحانی عظمت صرف ایمان و یقین سے ہی پیدا ہوا کرتی ہے، یہاں یہ نکتہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ قرآن میں تمام بشارتیں ایمان والوں کے لئے ہیں، کسی مخصوص ظاہریت یا فنی مہارت کے لئے نہیں۔

پچھلے دنوں کراچی کی احتفال علمائے اسلام میں ایک مقرر نے کہا تھا ایک وقت وہ بھی تھا جب مسلمان تعداد میں بہت تھوڑے تھے اور ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا، اس کے باوجود وہ جہاں گئے کامیابی نے ان کے قدم چومے، آج حالت یہ ہے کہ ہماری تعداد کروڑوں تک پہونچتی ہے، دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جو ہم سے خالی ہو، مادی اسباب اور قدرتی وسائل کی ہمارے ہاں ریل پیل ہے، پھر بھی گردش ادوار نے ہمیں چاروں طرف سے نرغے میں لے رکھا ہے اور ہم ہر جگہ اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں صورت حال کی یہ تصویر لفظاً بہ لفظاً صحیح ہے لیکن آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ آج سب کچھ ہوتے ہوئے ہمارے ہاتھ پاؤں جواب کیوں دے چکے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ ہماری روحیں مردہ ہیں، روحوں کو زندہ رکھنے والی روحانی اور اخلاقی اقدار ہوا کرتی ہیں، جب یہ بلند اقدار قوموں کے خون کو کھولانے سے قاصر رہ جاتی ہیں اور وہ ان کی خاطر کسی کی قربانی کو پسند نہیں کرتیں، جب ان کی ساری کوششیں حیوانوں کی طرح صرف پیٹ کے دھندوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہیں تو پھر نکبت اور ذلت کا طاری ہو جانا بالکل قدرتی ہے، قرون اولیٰ میں مسلمان ہر چند تھوڑے تھے اور ان کے پاس ذرائع کی بڑی قلت تھی، مگر ان کا سب کچھ ایک نہایت بلند نصب العین پر چھا در ہونے کے لئے بے تاب تھا، انہیں اس قربانی میں سب سے زیادہ لذت محسوس ہوتی تھی آج معاملہ اس کے الٹ ہے، ہم زبان سے خواہ کچھ بھی دعویٰ کریں، عملاً ہماری ساری بھاگ دوڑ عموماً محدود ذاتی مفاد کی حدوں سے آگے نہیں جاتی، مغربی استعمار نے ہماری کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا ہے، آج دنیائے اسلام کے وسیع رقبے غلامی یا نیم غلامی کی حالت پر قانع ہیں، اگر اس ساری معیبت کا کھوج لگایا جائے تو یہ چیز ہر جگہ ابھری ہوئی دکھائی دے گی کہ افراد نے اپنے فائدے کے لئے قوم اور ملک کو بیچ دیا، آج دنیائے اسلام

ے زیادہ جس شے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ نئی پود کو صحیح اسلامی اقدار کی پاکیزہ عظمت اور
لی سرمدی حلاوت سے اچھی طرح آشنا کر دیا جائے، یہ کام جبریا خشک وعظوں سے انجام نہ
ے گا، اس کی صحیح صورت یہ ہوگی کہ اسلامی تاریخ میں ان اقدار کی کارفرمائیوں کو درست طور پر
یک زندہ جذبے کے ساتھ پیش کیا جائے، اس ضمن میں مدرسے اور اساتذہ پر جو فرض عائد ہوتا
س کے متعلق غالباً کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اس روحانی تربیت کے ضمن میں ایک انتباہ ضروری ہے، صحیح اسلامی اقدار کی عملی کارفرمائیوں
ضیح کرتے وقت لازمی ہے کہ ان کی عالمگیر نوعیت کو اچھی طرح کھول کر بیان کیا جائے۔ اور
تاریخ کی روشنی میں یہ حقیقت آشکارا کر دی جائے کہ یہ اقدار نہ صرف ہر طرح کی سربلندی کی اٹل
ین ہیں، بلکہ ان کی اجارہ داری بھی کسی خاص ملک، قوم یا نسل کے حصے میں نہیں آئی، تاریخ
کے تمام اتار چڑھاؤ اسی روشنی میں دیکھے جا سکتے ہیں، یہ درست ہے کہ ہمیں تاریخ کی کئی بالادست
ں ان اقدار میں سے بعض کے معاملے میں خالی نظر آئیں گی، لیکن ان کی برتری محض ایک اضافی
ت کا درجہ رکھتی ہے، کیوں کہ جو قومیں زیر دست تھیں وہ ان اقدار کے معاملے میں کم و بیش
ے سے کوری تھیں، اس سلسلے میں مجھے ایک مولوی صاحب کا واقعہ یاد آگیا جو ایک جامع مسجد
طیب ہونے کے علاوہ ایک خاصے بڑے طبقے کے مخدوم بھی تھے، ایک بحث کے دوران میں
رت مولانا نے یہ گلفشانی فرمائی تھی کہ ہر چند کہ ہم خیر الامم ہیں لیکن ہماری بعض کوتاہیوں کی
ا دینے کے لئے روئے زمین کی بدترین قوم یعنی انگریزوں کو ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ
حقائق کو اس طرح مسخ کرنے کا نتیجہ تنگ نظری اور بے عملی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، اگر سچ پوچھا
ئے تو یہ احمقانہ تنگ نظری ہی ہمارے اکثر دکھوں کا باعث بنی ہے، ہمارے اساتذہ کو یہ نکتہ
ا طرح سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا خدا صرف مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ تمام کائنات کا خدا ہے
بیت کے اعتبار سے اس کے ہاں انسانوں میں کوئی تفریق نہیں، جو قوم اس کی وضع کی ہوئی
رت کے اصولوں کو جس حد تک اساس زندگی بناتی ہے اسی حد تک وہ سربلند ہوتی ہے، اسلام کو

دین فطرت ہونے کا دعویٰ ہے، اس لئے اس کے پیروؤں پر یہ فرض بدرجۂ اولیٰ عائد ہوتا ہے کہ وہ فطرت کے روحانی اور مادی قوانین کے عین مطابق زندگی گذاریں۔

اس ضمن میں ایک اور اہم احتیاط جس کی مزید ضرورت ہے یہ ہے کہ ایمان و یقین خالی الفاظ پر ختم نہیں ہو جایا کرتے، بلکہ ان کی اصل پہچان عمل ہے، اس بارے میں قرآن حکیم کے اس جان پرور ارشاد کی طرف خاص الخاص توجہ دلانا ہوگی کہ ایمان والے صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے، پھر انہیں اس ضمن میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہوا اور انہوں نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں۔"

پس روحانی اور اخلاقی اقدار کا زبانی اقرار اور احترام کچھ زیادہ سود مند نہیں، زبانی دعووں کو سچا ثابت کرنے کے لئے اپنی عزیز ترین متاع کی ہر قربانی کے لئے تیار رہنا سچے ایمان کی اصل پہچان ہے، یہی وہ نمایاں خوبی ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو ہم سے ممتاز کرتی ہے، اور جب تک ہم اسے واپس حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک ہم اپنی عظیم الشان میراث کے وارث نہیں بن سکتے۔

آج دنیا کو مادی ذرائع کی کمی کا رونا نہیں، بلکہ اسے روحانی اور اخلاقی راہ نماؤں کی ضرورت ہے پاکستانی راہ نماؤں کی طرف سے کئی دفعہ یہ کہا جا چکا ہے کہ پاکستان ایک ایسی روحانی ہدایت کی شمع روشن کرنے والا ہے جو اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی انسانیت کو امن و سلامتی کا سیدھا راستہ دکھائے، یہ الفاظ نہایت حسین اور دل کش ہیں، لیکن انہیں عملی شکل دینے کے لئے ضروری ہوگا کہ پاکستان کی نئی پود کو سچی اسلامی اقدار کا حامل بنایا جائے، موجودہ نسل نے عہد غلامی کی روایات میں پرورش پائی ہے، ان روایات نے ملک کی انتظامی زندگی کے لئے جو کل پرزے تیار کر رکھے ہیں ان کی سیرت و کردار کا حال سب کو معلوم ہے، اگر ہمارے مدرسے اس انتظامی کارخانے کو سنبھالنے کے لئے ایسے نوجوان تیار کر دیں جو سچے اسلامی جذبے کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت انجام دیں تو ہماری اجتماعی زندگی میں ایک ایسا انقلاب برپا ہو جائے جو بالآخر دنیا کی تقدیر کو بھی بہت کچھ متاثر کرے۔

سچی اسلامی اقدار کیا ہیں؟ خدا پر ایمان سب سے پہلی چیز ہے، ایسا ایمان جو ہر وقت یہ زندہ احساس
ہیں پیدا کئے رکھے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں بہت جلد مجھے اس کا جواب دینا ہے، اس احساس کو قرآن نے
ی کے نام سے پکارا ہے، اس کے ساتھ دوسری چیزیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہیں، یعنی
خوف و خطر نیکی کی تائید اور برائی کی مخالفت کرنا، یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کے خیر الامم ہونے کی
بہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، ان بنیادی اقدار کے لازمی نتائج
شمار ہیں جن میں آزادیٔ ضمیر، احترام انسانیت۔ رواداری، عدل اور مروت خاص طور پر اہم ہیں
غرض اسلام اس سب سے بڑی نفسیاتی حقیقت کا پورا پورا دھیان رکھتا ہے کہ کوئی تبدیلی
ں وقت تک ممکن نہیں جب تک انسانوں کے دل نہ بدل جائیں، پس وہ اپنی تعلیم کی ساری
اد روحانی اقدار پر بلند کرتا ہے، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ مادی اسباب لاکھ اہم سہی مگر روح کی
ائیوں میں ان کا گذر نہیں، وہاں اگر کوئی چیز تاثیر پیدا کر سکتی ہے تو روحانی اقدار۔ جدید تہذیب کو آج
ن مصائب کا سامنا ہے وہ اس روشن حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ انسان نے اپنے ذہن اور
نے ہاتھ کے طفیل عجیب و غریب کرشمے اور ہوش ربا عجوبے تو پیدا کر لئے لیکن ان سے مفید خدمت
نے کا سلیقہ پیدا نہ کر سکا، گویا ایک مشہور مغربی عالم کے قول کے مطابق اُس نے غیر پسندیدہ مقاصد کو
قی دینے کے لئے ترقی یافتہ ذرائع معلوم کر لئے"۔ ظاہر ہے کہ مقاصد کا پسندیدہ ہونا فنی مہارت یا
افنی تکنیک کے بس کی بات نہیں، یہاں اگر کوئی شے مفید مطلب نتائج پیدا کر سکتی ہے تو روحانی
قدار سے دل بستگی، پس سچی اسلامی اقدار کی تعلیم دے کر ہم نہ صرف اپنے ملک کی اہم ترین خدمت
نجام دیں گے، بلکہ اس کے ساتھ ہی نوع انسانی پر بھی بہت بڑا احسان کریں گے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ روحانی تربیت کے لئے استاد کو کیا کچھ کرنا ہوگا، اس ضمن میں سب سے اہم
ات یہ ہے کہ یہاں خلاصے لکھوا دینے یا تقریریں جھاڑ دینے سے کام نہ چل سکے گا، روحانی تربیت
ایک نہایت لطیف عمل ہے، اور اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مدرسہ کوئی ایسی جگہ نہ ہو جہاں طلبہ کو
نہ سکھایا جاتا ہو بلکہ وہ کچھ ایسی جگہ ہو جہاں ایک قسم کی زندگی بس رہی ہو، صرف یہی ایک صورت ہے

جس سے مطلوبہ اقدار کے متعلق حق الیقین حاصل ہو سکتا ہے۔ یوں تو اکثر اخلاقی اوصاف کا حال سن کر ہم ان کی اچھائی کو ماننے لگتے ہیں لیکن یہ ماننا صرف الفاظ کی حد تک رہتا ہے، ہمارا عمل اسی صورت میں متاثر ہوگا جب ہم کسی ایسے معاشری ماحول سے گھرے ہوں جہاں ان اقدار کی حکمرانی ہو پس استاد کو لازم ہے کہ پہلے اپنی اقدار کا اچھی طرح جائزہ لے اور سوچے کہ کیا اس کی اپنی اقدار سچی اسلامی اقدار ہیں؟ اگر خدانخواستہ ان میں کچھ کمی ہے تو اس کا فوری تدارک ہونا چاہیے۔ پھر اسے دیکھنا ہوگا کہ مدرسہ کا عام ماحول تو ایسا نہیں جو اس کی پسندیدہ اقدار کو بروئے کار آنے سے روکے۔ اگر ایسا ہے تو اسے یا تو اس ماحول میں مناسب تبدیلی کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور یا پھر اس مدرسہ کو خیر باد کہنا چاہیے۔ اگر استاد کی اپنی اقدار درست ہیں اور مدرسہ کا ماحول سازگار ہے تو استاد کا نمونہ اور مدرسہ کی زندگی روحانی تربیت کے بہترین ذرائع ثابت ہوں گے، طلبہ جب خود اسلامی اقدار پر مبنی زندگی کی مٹھاس سے آشنا ہو جائیں گے تو تعلیم سے فارغ ہو کر جہاں بھی جائیں گے اسی زندگی کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کریں گے، چونکہ وہ بلند ترین انسانی اقدار کی عملی کارفرمائی کی ایک جھلک دیکھ چکے ہوں گے اس لئے اور کوئی قدریں ان کی نگاہ میں نہ جچیں گی۔

آج ہمارے مدرسوں میں روحانی تربیت کے امکانات جس طرح ناپید ہیں ان کو دیکھتے ہوئے شاید بعض دوستوں کو مندرجہ بالا تصویر ناممکن العمل دکھائی دے لیکن اگر ہم اپنے دعاوی میں سچے ہیں تو ہمیں ایک نہ ایک دن یہ کام کرنا ہوگا، اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہم نے یہ تجربہ کامیابی کے ساتھ آزمایا تھا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے دہرایا نہ جا سکے ۞

قسط نمبر ۲

عراق میں لازمی تعلیم

محمد عبد العزیز

اقتصادی، سیاسی اور سماجی عوامل

لازمی اور مفت تعلیم کے حصول کے لئے عراق کو ابھی دشوار گذار مراحل سے گذرنا ہوگا، وقت قریب ہے موزوں بھی اور مناسب بھی کہ عراق اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، شہروں اور دیہاتوں میں اسکولوں کی کمی محسوس کی جارہی ہے، اگر اسکول اور اساتذہ دونوں میسر آسکیں تو طلبہ کی بہت بڑی تعداد تعلیم سے فیض یاب ہوسکتی ہے، وزارت کو اس کا پورا پورا علم اور احساس ہے، وہ اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے میں برابر مصروف ہے اگرچہ حصول مقصد کے لئے وقت اور روپیہ دونوں درکار ہیں، لیکن طلبہ کی اس بڑھتی ہوئی تعداد کو زیادہ دیر تک روکا نہیں جا سکتا حصول تعلیم کے لئے انھیں کوئی نہ کوئی جگہ دینی پڑے گی، اس لئے عراقی ماہرین تعلیم لازمی اور مفت تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشاں نظر آتے ہیں، مگر جب تک سیاسی سماجی، اور اقتصادی موانع پر عبور نہیں حاصل کیا جائے گا اس مقصد میں کامیابی کا تصور محض دیوانے کا خواب ہو سکتا ہے، جیسا کہ ایک سابق وزیر تعلیم نے کہا ہے "اچھے اور نئے نئے اسکولوں کے قیام کا جذبہ ہی کافی نہیں ہے، ایک اچھا و مفید مطلب نظام تعلیم اسی وقت قائم ہو سکتا ہے، جب اس کا ملک کے اقتصادی اور مالی مسائل سے براہ راست تعلق ہو"

اقتصادیات

تعلیم کی ترویج کے لئے سب سے اہم مسئلہ مالی و اقتصادی ہوتا ہے، صرف تجویزیں مرتب کرنے سے تعلیمی ترقی کی بنیادیں قائم نہیں کی جا سکتیں، تجویزوں کے ساتھ ساتھ

یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ان کے حصول کے وسائل و ذرائع کیا ہیں، کیا حکومت اور عوام کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ اس تجویزہ پروگرام کو بروئے کار لاسکیں۔ حکومت کے تعلیمی اخراجات کا ایک مختصر سا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ عراق اپنی تعلیمی جدوجہد میں کیا کچھ کر رہا ہے اور آنے والی زندگی میں اپنے شہریوں کے لئے کیا کچھ کر سکے گا۔

تعلیمی اخراجات

سال	ہر مقصد کے لئے		تعلیم کے لئے		تعلیمی اخراجات کا فی صدی تناسب
۱۹۳۰-۳۱	۵۵۵۶۵۷۴	پونڈ	۱۲۰۳۶۰	پونڈ	۳۵۰۶۲
۱۹۳۰-۳۱	۳،۹۹۴،۳۳۷	"	۲۹۴،۲۶۲	"	۳۷ ،۷
۱۹۳۸-۳۹	۵،۴۶۹،۸۱۳	"	۷۰۸،۰۵۶	"	۹۴ ،۱۲
۱۹۳۹-۴۰	۶،۳۶۹،۱۴۸	"	۸۱۰،۴۷۷	"	۷۲ ،۱۲
۱۹۴۰-۴۱	۷،۱۴۴،۹۱۰	"	۸۴۸،۱۶۸	"	۸۷ ،۱۱
۱۹۴۱-۴۲	۷،۷۰۱،۱۷۸	"	۸۵۵،۵۴۰	"	۱۱ ،۱۱
۱۹۴۲-۴۳	۱۰،۶۲۰،۸۲۲	"	۱،۱۳۷،۴۱۴	"	۶۵ ،۱۰
۱۹۴۳-۴۴	۱۳،۷۴۹،۳۲۱	"	۱،۵۱۵،۵۴۲	"	۲۰ ،۱۱
۱۹۴۴-۴۵	۱۵،۴۸۴،۷۵۲	"	۱،۲۳۵،۴۷۵	"	۶۲ ،۸
۱۹۴۵-۴۶	۱۷،۵۶۳،۲۳۰	"	۱،۶۱۱،۸۴۳	"	۱۸ ،۹
۱۹۴۶-۴۷	۱۸،۴۶۸،۵۶۷	"	۱،۷۳۷،۶۰۴	"	۴۳ ،۹
۱۹۴۷-۴۸	۱۸،۷۴۷،۶۵۷	"	۲،۱۵۷،۳۱۵	"	۵۱ ،۱۱
۱۹۴۸-۴۹	۲۱،۹۴۷،۹۹۴	"	۲،۵۷۲،۶۲۵	"	۷۲ ،۱۱
۱۹۴۹-۵۰	۲۴،۰۹۵،۳۰۰	"	۳،۷۸۳،۳۰۹	"	۷۰ ،۱۵

اس وقت ایک بچے کی ابتدائی تعلیم کے لئے ۸ پونڈ سالانہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس طرح ۰۰۰...۷۵ بچوں کے تعلیمی مصارف ...۰۰۰۶ پونڈ ہوتے ہیں۔ یعنی موجودہ تعلیمی بجٹ کا کم و بیش دوگنا، اور یہ تخمینہ صرف تعلیم

راجات کا ہے، عمارتوں کی تعمیر و تجدید کا مہیا کرنا، تعلیمی لوازمات کی فراہمی، اساتذہ کی تنخواہیں اس میں
ل نہیں ہیں اور اس میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا، یہی وجہ ہے کہ بعض ذمہ دار
رین تعلیم جب اخراجات کا جائزہ لیتے ہیں تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالباً ابھی ایک مدت مدید تک
زمی اور مفت تعلیم کا تصور بے معنی ہوگا، یہ خیال ممکن ہے صحیح نہ ہو، مگر کسی منصوبے کی تکمیل کے لئے
لی وسائل کا جائزہ لینا نہایت اہم ہوتا ہے، بعض لوگ لازمی تعلیم سے محض اس لئے خوفزدہ نظر آتے
یں کہ مالی مشکلات پر بظاہر قابو پانا دشوار معلوم ہوتا ہے، لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ دوسرے
مالک کے تجربے اس سے کچھ مختلف ہیں، جب ملک اور قوم کو تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوا تو
س کے قیام اور اہتمام کے لئے روپیہ بھی میسر آگیا، اگر کچھ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں کہ عوام
س تعلیمی خلا کو شدت سے محسوس کرنے لگیں تو عراق میں تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ روپیہ
سر اہم ہو سکتا ہے۔

عراقی تعلیمی نظام کا ایک بڑا نقص تعلیم کا خالصتاً مرکزی ہونا ہے، حالاں کہ ابتدائی تعلیم
مقامی حکومتوں کی ذمہ داری ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مقامی حکومتوں کے مالی وسائل سے محکمۂ تعلیم
کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا، اگر مقامی مالی وسائل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی تو ضرورت کے
مطابق مرکزی تعلیمی بجٹ سے بھی اس کی امداد کی جا سکتی ہے، اگر محصولات کا صحیح اور متعین نظام عمل میں
آئے تو اور بہت سی مالی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں، کسٹم اور اکسائز سے جو محصولات حاصل ہوتے ہیں
ان سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، مزید براں سیلز ٹیکس جو اس وقت ساڑھے بارہ فی صدی مقرر
ہے، اسے ایک مقررہ پیمانے میں لایا جا سکتا ہے، مزید مالی استحکام کے لئے زمین اور زمین کی پیداوار
کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہ دیا جائے۔

عراق کی آمدنی زیادہ تر اس کی زرعی پیداوار سے ہوتی ہے، اگر زمین کا صحیح بندوبست کیا جائے
تو اور زیادہ رقم حاصل ہو سکتی ہے، اسی پر عراق کی مالی اور اقتصادی بہبود کا انحصار ہے، بدقسمتی سے
ملک کا موجودہ زرعی نظام اس کی زرعی ترقی میں مانع ہے، زمین دار بالعموم شیخ کہلاتے ہیں، ان میں سے

بیشتر شہروں میں رہتے ہیں اور دیہاتی علاقوں میں ان کی بہت بڑی بڑی جائداد ہوتی ہیں، وہ اپ
کارندوں کے ذریعہ محاصل وصول کرتے ہیں، سب افسوس کی بات یہ ہے کہ عراق کا کسان محنت مشقت
سے کما کر سب کچھ اپنے شہری آقا کے قدموں پر ڈال دیتا ہے اور اس سے خود بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، بٹائی
طریقہ دراصل اس ترقی یافتہ زمانے میں کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ای
طرف زمین دار ہے اور دولت کا انبار، دوسری طرف کسان ہے اور نکبت وافلاس، عراق کی سما
اور اقتصادی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے زرعی مسائل کا حل سب سے زیادہ ضروری ہے۔ زمین
عراق کی سب سے بڑی دولت ہے، اس وقت میکانکی زراعت کو فروغ دینے کے لئے زرعی مشینوں
اور نئے نظام زراعت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے لیکن زمین داروں کو اس کی ترقی سے کو
دلچسپی نہیں ہے۔ آخر ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ دجلہ اور فرات کا درمیانی علاقہ لہلہاتا ہوا سبزہ زار تھا، عا
فصل اور زرخیز زمین کی بدولت دنیا کا آباد ترین علاقہ تھا، تہذیب و تمدن کا مرکز اور علم و فن کا گہوارہ
لیکن آج وہی سبزہ زار صحرا میں تبدیل ہو چکا ہے، اور محض اپنی غفلت اور نادانی کی وجہ سے مو
صورت حال میں اس کی اصلاح ناممکن سی نظر آتی ہے اور جمہوری اداروں کے فروغ کے امکا
بھی بہت کم ہیں، مرکزی اور مقامی حکومتیں دونوں اس وقت تک معذور ہیں، جب تک عوام کا مع
زندگی بلند نہیں کیا جائے گا، مالی اور اقتصادی مشکلات سے قطع نظر تعلیمی ترقی میں اور بہت سی مشکلا
بھی حائل ہیں اور یہ مشکلات زیادہ تر سیاسی اور تنظیمی ہیں۔

تعلیم کا غیر مربوط ہونا تعلیمی ترقی کی راہ میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ نظام تعلیم اور مرکزی تعلیمی پا
بالکل غیر مربوط ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سلسلہ صدیوں سے
جاری ہے، اگر پچھلے چند سالوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو وزیر معارف اور محکمہ تعلیم کے ذ
ذمہ دار افسروں کی پالیسی میں بھی ہم آہنگی نہیں ملے گی، اس عدم مطابقت سے بہت سی خام
پیدا ہو جاتی ہیں۔

تعلیم و تنظیم کا مسئلہ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا ہے، عراق کا نظام تعلیم مرکزی ہے، وزار

نصاب تیار کرتی ہے، کتابیں مہیا کرتی ہے اور امتحانات لیتی ہے، اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے اور ان کا تقرر کرتی ہے، مرکزی خزانے سے ہی انہیں تنخواہیں ملتی ہیں، کسی سرکاری یا تربیتی ادارے کے پاس اپنا فنڈ نہیں ہوتا اور اسکولوں کی کتابوں کے انتخاب کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ تدریسی سازوسامان خریدنے کی بھی براہ راست انھیں اجازت نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اسکولوں کے وقت نامے کو بھی ابتدائی مدارس کا قانون متعین کرتا ہے، ہر صوبے میں علیحدہ علیحدہ ناظم ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت وزارت معارف کے نمائندے کی ہوتی ہے، ایسا مرکزی نظام شروع میں تو مفید ہو سکتا ہے، لیکن زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ردوبدل کی ضرورت ہے، آگے چل کر وزارت کو اس سلسلے میں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، مدرسوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے، قومی تعلیمی ترقی کا مسئلہ اہم سے اہم تر ہوتا جاتا ہے، ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ مقامی حکومتوں کے تعاون کے بغیر نظام تعلیم کی مشین کو چلایا جا سکے۔

مختلف علاقائی ضروریات

ہر علاقے کی اپنی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور تعلیم کا سب سے اہم مقصد انھیں ضروریات کو پورا کرنا ہے، وقت آ رہا ہے کہ تعلیمی نظام کو مقامی حکومتوں کو سونپنا پڑے گا، یوں تو عراق کی مجموعی آبادی اتنی زیادہ نہیں ہے، پھر بھی علاقائی اختلافات بہت ہیں، بغداد کی شہری ضروریات اور گردوپیش کے صوبوں کی ضروریات میں بھی عظیم اختلاف ہے اور منتفق اور موصل کے بدویوں کی ضروریات ان سے بھی مختلف ہیں، اس طرح عراق کو قومی اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، مرکزی تعلیمی نظام سے یہ اندیشہ بھی ہو سکتا ہے کہ علاقائی ضرورتوں کو محسوس نہ کرتے ہوئے کوئی ایسا نظام تعلیم قائم ہو جائے جس سے آپس میں نفاق اور اختلاف پیدا ہونے کا احتمال ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو یہ قوم اور ملک کے مفاد کے منافی ہی نہیں ہوگا اس کے اثرات دوررس اور مہلک ہوں گے۔

جہالت اور صحت کے مسائل

عراق کی بالغ آبادی جاہل ہے، یہ جہالت اور قومی صحت کی زبوں حالی ابتدائی تعلیم کے پھیلنے میں ہمیشہ مانع آئیں گی، بالخصوص دیہاتی

علاقوں میں جب تک ان بیماریوں کا تدارک نہ کیا جائے تعلیمی ترقی ممکن نہیں، اس کے اسباب واضح ہیں جو والدین ناخواندہ ہیں اور ان کا معیار حیات پست، انھیں اپنے بچوں کی تعلیم کی ترغیب نہیں دی جا سکتی، نہ تو وہ انھیں گھروں میں اونچی ذہنی اقدار کا حامل بنا سکتے ہیں اور نہ اسکول کی روشن فضا سے ان کے دماغوں کو روشن کر سکتے ہیں، پھر بھی رفتہ رفتہ یہ دقتیں دور ہوتی جاتی ہیں، عوامی نظام صحت بھی رو بہ ترقی ہے، اب تو دور افتادہ گاؤں میں بھی ڈاکٹر کام کرتے ہوئے نظر آجاتے ہیں، یہ اقدام قومی صحت کے مسائل کو حل کرنے میں مفید ثابت ہوگا، اس طرح یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گاؤں میں مفلس اور نادار والدین بھی اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے قربانیاں کر رہے ہیں، ان کی یہ قربانی رائگاں نہیں جائے گی، لیکن لازمی تعلیم کی ترویج سے پہلے بالغوں کی جماعت میں بھی علم کی روشنی پہنچانا ضروری ہے، جب یہ بالغ تعلیم کی اہمیت کو سمجھ لیں گے تو تعلیم کو لازمی بنانے میں اتنی دشواریاں پیدا نہیں ہوں گی، دیہاتی علاقوں میں بچوں کی تعلیم کے ساتھ اگر تربیتی ادارے، مدرسین کی تدریسی تربیت کے علاوہ انھیں ناخواندہ بالغوں کو تعلیم دینے کے طریقے سکھائیں تو یہ مدرسین پوری قوم کے لئے مفید ثابت ہوں گے،

بچے اور عورتیں

عراقی تعلیم گاہوں میں مخلوط تعلیم کا رواج بہت کم ہے، گاؤں میں البتہ ابتدائی مدارس لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے، لیکن شہروں میں چوں کہ مغربی اثرات بڑھ رہے ہیں اس لیے بعض حلقوں میں مخلوط تعلیم کی موافقت کی جا رہی ہے۔ شہروں کے ابتدائی مدارس میں صرف کنڈرگارٹن مدرسوں میں مخلوط تعلیم رائج ہے، اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم گاہوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں، ابتدائی مدارس اور ان کے نظام کا گہرے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور جو مستورات تعلیم و تدریس کا کام کر رہی ہیں، بچوں کی نجی صفائی، نگرانی اور ان کی عمومی حالت کو بہتر بنانے میں مردوں سے زیادہ مستعد نظر آتی ہیں، فی الحقیقت چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مستورات جس دل چسپی اور محبت و اخلاص کا اظہار کر سکتی ہیں، مرد کے لئے فطرتاً ممکن نہیں ہے۔

عوام میں تلاش نکبت زیادہ ہے۔ صبح کو اگر روٹی میسر ہو جاتی ہے تو پورے خاندان کو نان شبینہ کی فکر رہتی ہے
ن دیہیوں کا اکثریت اپنے بچوں کو شروع سے ہی محنت مزدوری کا عادی بنا دیتی ہے، اگر وہ مزدوری نہ کریں تو پیٹ
نا دشوار ہو جائے، اس کے باوجود یہ مفلس نادار والدین اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لئے مدرسوں میں بھیج سکتے ہیں
ر حکومت مفلس بچوں کے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کر دے تو اسکولوں میں طلبہ کی حاضری اور مستعدی
ں اضافہ ہو سکتا ہے اور دیہاتی مدرسوں میں تو اس اقدام سے معتدبہ فائدے کی توقع ہو سکتی ہے، بغداد کے
ک جدید مدرسے میں نہایت عمدہ دوپہر کا کھانا مہیا کیا جاتا ہے لیکن اس مدرسے میں زیادہ تر کھاتے
یتے گھروں کے بچے تعلیم پاتے ہیں، وہ ان اخراجات کو برداشت کر سکتے ہیں اور جو خود نان جویں کی
لاش میں صبح و شام سرگرداں رہتے ہیں، ان کے لئے یہ مشکل ہے، بہر صورت گاؤں میں سادہ کھانا کھلانا
نا زیادہ گراں نہیں ہوتا، کم از کم ان میں ضرورت مند بچوں کی امداد کی جا سکتی ہے، عراق میں بچوں کی محنت مزدوری
پابندی عائد کرنے کے سلسلے میں اب تک کوئی قانون نہیں پاس ہوا۔

قبائلی علاقے اور بدوی

اس ملک میں کوئی نظام تعلیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اپنی
توجہات کو قبائلی علاقوں کی تعلیم پر مرکوز نہ کیا جائے، قبائلی علاقوں کی آبادی کو دو
گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) وہ قبیلے جو اب تک نیم بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں (۲) وہ قبیلے جو نیم آباد شدہ دور سے گذر رہے ہیں۔

ان سب کی مجموعی تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے، ان میں مدرسے جانے والے بچوں کی تعداد تقریباً تین لاکھ ہے
اس پوری آبادی میں ۸ فی صدی قریباً لکھانہ بدوش ہیں جو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہتے ہیں خواہ وہ خاص
موسموں ہی میں کیوں نہ ہو، ان پر کسی نظام تعلیم کا اطلاق نہیں ہو سکتا، ایسے ممالک میں جہاں مدتوں سے لازمی تعلیم
رائج ہے ایسے بچوں کی تعلیم کا اب تک کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا جو اپنے والدین کے ساتھ کاروانوں میں مختلف مقامات پر
جاتے رہتے ہیں، عراق کی اس آبادی میں کسی نظام تعلیم کا رواج دینا مشکل ہے، اس کے لئے ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ ان قبیلوں
کے ساتھ ایسے اساتذہ ہوں جو ان کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں پھرتے رہیں، اور جہاں یہ قیام کریں وہ خود ایک مدرسہ
قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں، یہی مدرسہ بچوں کی تعلیم اور بالغوں کی سماجی اور معاشرتی تنظیم کا مرکز ہو، اس اسکیم کی کامیابی

عبدالغفور چودھری

میرے خیال میں گھر پر کاپیاں صحیح کرنا محض تضیع اوقات ہے، کوئی بچہ سُرخ اور سیاہ پنسل کا نشان دوبارہ نہیں پڑھتا بعض بچوں میں ایک نفسیاتی کمزوری یا اپنے اوپر بے اعتمادی ہوتی ہے یا انہیں اپنی غلطیاں دیکھ کر جذبات مجروح ہونے کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ اکثر اُن کی صحیح کی ہوئی غلطیوں پر دوبارہ نظر ڈالنے سے بھی جھجک سے جاتے ہیں، میں تو چاہتا ہوں کہ میں بچے کے برابر بیٹھ کر اس کی غلطیاں درست کروں۔ میں مضمون نویسی کے لئے زندہ موضوع چاہتا ہوں، مثلاً اگر تم ایک ہزار سال کے لیے سو جاؤ تو پھر اُٹھنے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرو، اگر تمہیں عمرو عیار کی ٹوپی مل جائے تو کیا کرو گے؟ بعضوں نے جواب میں لکھا چوریاں کریں گے ڈاکے ماریں گے، یا خفیہ طور سے لوگوں کے بھید معلوم کریں گے اور بے ٹکٹ سفر کیا کریں گے، تصور کرو کہ تم اکیلے ہی دنیا میں زندہ رہ گئے، اُس پر ایک مضمون لکھو، ایک سات سال کے بچے کو نہلایا جا رہا ہے۔ اس کی بابت لکھو۔ ۹۰ سال کی عمر میں وفات پا کر اپنے متعلق مقامی اخبار میں ایک پیراگراف لکھو۔

آج میں سمپسن سے ملا جو ایک آزمودہ کار ہیڈ ماسٹر ہے۔ مدا اگلے سال استادوں کی انجمن کا صدر ہونے والا ہے، مجھے مفصلہ ذیل الفاظ میں ان سے تعارف کرایا گیا، آپ ایک نوجوان ہیں اور تعلیم کے موضوع پر کچھ نظریہ رکھتے ہیں، انسپکٹر لوگوں کی تو ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتے، اور ضبط اور اس کی

بندیوں سے تو دل سے نفرت کرتے ہیں۔ سمپ سن (SIMPSON) نے مجھے اپنی عینک کے اوپر سے
سر سے لے کر پاؤں تک جانچا۔ اس کے بعد ایک (GRUNT) کے ساتھ کہنے لگا، میاں آہستہ آہستہ
سب بھول جاؤ گے۔ میں نے ہنس کر جواب دیا حضرت اس کا تو مجھے بھی ڈر ہے، مجھے خوف ہے کہیں اس
بس کی چکی میں پس کر یا اس کو ٹھوکریں جُت کر میری آنکھوں میں کھٹنے نہ چڑھ جائیں۔
"اجی آپ دیکھیں گے تجربہ وسعتِ نگاہ کو خراب نہیں کرتا"۔ میں نے کہا اجی میری رائے میں تو
تجربہ سات گنا ہونا اس میں سب سے بڑا گناہ ہے"۔ "تجربہ کار کی تعریف۔ ایک ایسا انسان ہے جو کسی
چیز کو بھی اس خوف کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگاتا، کیوں کہ ایک مرتبہ اس کی انگلیاں جل چکی ہیں، یہ
تجربہ ہی تو ہے جو ہم سب کو بزدل بنا دیتا ہے"۔
سمپ سن نے کہا۔ "اخاہ تو اس وقت آپ کو مذاق کی سوجھ رہی ہے، بھلا اس بات سے کون
انکار کر سکتا ہے کہ مجھے پڑھانے کا ۳۰ سال کا تجربہ ہے، تعلیم کی بابت تم سے زیادہ جانتا ہوں۔
میاں لونڈے! میں تو اُس وقت بھی پڑھا رہا تھا، جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ "اچھا یہ تو بتاؤ
تم ضبط کی بجائے کس سے کام لیتے ہو؟" "میں تو اس کے بغیر ہی کام چلا لیتا ہوں"۔ یا اللہ! تم نے
تو غضب کر دیا۔ آخر یہ تو بتاؤ کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ حضرت یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، میری فطرت گوارا
نہیں کرتی کہ کوئی میرے لئے قانون بنائے، اور میں خود نہیں چاہتا کہ میں بچوں کی نقل و حرکت کے لئے
کسی قسم کے قواعد مرتب کروں، آخر یہ تو بتاؤ تم بچوں سے کام کیسے لیتے ہو؟" "جناب میں تو اسکولوں
میں کام پر اہمیت ہی نہیں دیتا۔ کام میں اہمیت دینا اتنی ہی بے ایمانی ہے جتنا علم محض پر زور دینا"
انگلستان جرمنی کے خلاف کیوں جنگ کر رہا ہے؟ کیوں کہ وہ اُن کی عسکریت کو توڑنا چاہتا ہے
لیکن مدرسوں کی عسکریت کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا، یہاں بھی تو جابر ڈکٹیٹر مسلط ہیں، یہاں بھی
تو ذہنیت انگریزی کا ماحول رہتا ہے، اگر میں ایک بچے کو اس لئے ماروں کہ اس نے حساب کا ایک
سوال حل کرنے میں غلطی کی ہے تو میں اس جرمن افسر سے کسی حالت میں بھی کم مجرم نہیں ہوں
جو پولینڈ کے ایک شہری کو محض اس لئے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ اس نے اس کی

نگاہوں کے سامنے ایک گلی میں سے گزر جانے کی جرأت کی۔ ایسی حالت میں میں بے وقوف بھی ہوں اور (BULLY) بھی"۔ اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "تو کیا تم بچوں کو ان کی لاپروائی پر سزا نہیں دیتے"
"دیتا ہوں کبھی کبھی مگر بہت کم، بات یہ ہے کہ میں خود بھی تو بہت لاپروا ہوں، ہاں خوب یاد آیا داخل ہوتے وقت میں باغ کا پھاٹک کھلا چھوڑ آیا تھا، مجھے ڈر ہے آپ کی ساری مرغیاں باغ کے باہر پھڑ پھڑا رہی ہوں گی"۔

"تمہارے خیال میں تو گندا پن بھی ایک خوبی ہے"۔ "نہیں نہیں یہ تو میں نہیں خیال کرتا لیکن یہ ایک فطری انسانی خصلت تو ضرور ہے"۔ "کیا تمہارے طلبہ اکثر گندے رہتے ہیں"۔ "جی ایک دو کیا کوڑیوں، بھلا یہ بچے کسی کارخانے میں ملازم ہوں گے تب ان کا کیا حال ہوگا، کیا کوئی مستری اپنے کام پر بٹھائے گا"

"دیکھئے اب آپ مدرسہ کا موضوع چھوڑ کر پیشے کے متعلق بحث کرنے لگے، آپ چاہتے ہیں اسکولوں میں سے کاری گر قسم کے لوگ پیدا ہونے لگیں، یہ سچ ہے کہ صفائی اور چابکدستی عملی صنعت و حرفت میں بہت کام آتی ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ تعلیم کو کفش دوزی یا کفن، سازی کے درجہ پر گرا دوں۔ اگر لڑکا غور و فکر کرسکتا ہے تو سب کچھ ہے، خواہ وہ گندہ ہی کیوں نہ ہو"۔ "جناب یہ تو غلط بات ہے اگر بچہ گندہ ہوگا تو اس میں غور و خوض کی عادت ہی پیدا نہیں ہو سکے گی"۔ "میرے خیال میں تو آپ غلط کہتے ہیں ذاتی طور پر تو میں بڑا سست آدمی ہوں، میرا کتب خانہ تو عام طور پر فرش پر ہی پڑا رہتا ہے، لیکن اگر میں جسمانی لحاظ سے سست ہوں لیکن ذہنی لحاظ سے نہیں"۔

"تو جب سمپسن اس وقت پہونچا جب میں بچوں کو قطار میں کھڑا کرا کے اندر لے جا رہا تھا۔ "تم انہیں ایک قطار میں کھڑا کرا کے مارچ کیوں نہیں کراتے"۔ "پہلے کراتا تھا لیکن اب تو چھوڑ دیا ہے، اور سچ پوچھو تو مجھے سیدھی قطاروں سے سخت نفرت ہے"۔ ہم کمرے میں داخل ہو گئے، سمپسن کھڑا ہوا آپس میں باتیں کرنے والے بچوں کو سختی سے گھور رہا تھا، ادھر میں رجسٹر پر حاضری لگا رہا تھا۔ "مجھے تو یہ شور برداشت

ہو نہیں سکتا۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا "یہ جماعت آپ کے گاف کلب جتنا تو شور نہیں مچاتی ہے۔" اتنے
بن جان میرے ڈیسک کے پاس پہونچا، اس نے اخبار ہاتھ میں اٹھالیا اور اس کے بعد کچھ گاتا ہوا
کھیل کے میدان میں چلا گیا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "یہی ایک لڑکا ہے جو لڑائی
کی خبریں بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔" اس کے بعد ایک لڑکی آئی اور کہنے لگی "میں (FOUR FELTERS)
اپنے ساتھ گھر لے گئی تھی اور میری اماں نے اُسے پڑھنا شروع کر دیا ہے۔" "کیا کوئی اور شخص اس کتاب کو پڑھ
رہا ہے؟" میں نے وہ کتاب اُسے دے دی اور وہ باہر چلی گئی، اس کے بعد جوَن آیا وہ مینویل روم کی چابی
مانگ رہا تھا اسے ایک کشتی تیار کرنا تھی۔ سمپسن بولا۔ "کیا تم ان کو من مانی کارروائیاں کرنے دیتے
ہو؟" "ہاں بڑی جماعتوں میں۔" میری (MARY) جو آگے کی صف میں بیٹھی تھی اس نے ایک مٹھائی کا تھیلہ
کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ "جناب کیا یہ بھی کچھ لیں گے" (سمپسن کی طرف اشارہ کر کے) سمپسن نے
ایک ایسے شخص کے انداز میں جو چھٹیاں منا رہا تھا اور جیسے بے پرواہ نہ ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ایک ٹکڑا
اٹھالیا۔ سمپسن بولا۔ "ارے میاں کیا تم اسکول میں کھانے کی بھی اجازت دے دیتے ہو، دیکھو تو
ایک بچہ پیچھے بیٹھا ہوا اخروٹ کھا رہا ہے۔" میں نے اپنی نگاہیں جوَن پر لگا ہی دیں۔ "جوَن اگر تم ان
چھلکوں کا ذرہ بھی فرش پر پھینکو گے تو میں تمہیں کھا ہی جاؤں گا۔" "میں تو انہیں اپنے بٹوے میں ڈال
رہا ہوں۔" "شاباش۔ شاباش۔ اچھا ایک سوال لکھو۔" ہم ذرا اٹھے تو دیکھا کہ دو بچے پڑھ رہے ہیں، ایک
۔۔ے میں کچھ کھیل کھیل رہا ہے، دو تین گھوڑوں کے متعلق باتیں کر رہے ہیں، واپسی پر سمپسن نے
کہا۔ "یہاں فضا تو بہت لطیف اور دلچسپ ہے، مگر جماعت میں مٹھائی کھانا اور اخروٹ کھانا چہ معنی؟"
"واہ آپ کا تو دایاں ہاتھ بار بار اٹھتا ہو گا۔" میں نے ہنس کر کہا "کیوں نہیں؟" "مگر کیا تمہیں کبھی غصہ نہیں آتا؟"
"ہاں کبھی کبھی۔" "اچھا تو تمہارا سسٹم مکمل نہ ہوا۔" "واللہ تم بھی کیا باتیں کرتے ہو، کیا تم نے مجھے آسمان کا
فرشتہ سمجھا ہے؟ میں بھی کبھی کبھی چڑھ جاتا ہوں، مگر ہمیشہ الزام اپنے اوپر ہی رکھا ہے۔"

ہمارے مدارس میں تدریس الجبرا

محمد مظفر الدین

الجبرا ریاضی کی ایک شاخ ہے اور اس سے وہی نتائج حاصل ہوتے ہیں جو اس کی دوسری شاخ
سے ہوتے ہیں لیکن یہ کچھ ایسے طریقے سے پڑھایا جاتا ہے کہ طلبا بلکہ بعض اساتذہ بالخصوص ایس۔ وی
حضرات اسے ریاضی کی دوسری شاخوں سے ایک علیحدہ مضمون خیال کرنے لگے ہیں، اس کی وجہ اس
تدریس کا ناقص طریقہ اور پڑھانے والوں کی علمی بے مائگی ہے، ورنہ یہ حرفی یا عمومی حساب ہے ا
حساب کے قاعدوں کی ہی وسعت ہے۔ جب تک بچوں کو یہ محسوس نہ کرایا جائے کہ الجبرا ان کی عملی ز
کے لئے مفید ہے، ان کے دلوں میں اس کے لئے دلچسپی پیدا نہیں ہوگی، وہ اس کی قدر اسی وق
محسوس کریں گے جب انھیں فی الواقع کوئی بڑا سا سوال حل کرنے کو دے دیا جائے، وہ اسے حل کر
کے لئے سر توڑ کوشش کریں گے۔ ایسا کرتے وقت استاد کی طرف سے تھوڑی سی راہ نمائی ان کے
دلوں میں اس مضمون سے مستقل دلچسپی پیدا کر سکتی ہے، اس وقت جس طریقہ سے اسکولوں
میں الجبرا پڑھایا جا رہا ہے اس سے طلبہ کا اسے ایک نیا اور زائد بوجھ خیال کرنا ناگزیر ہے

الجبرا کی تدریس ساتویں جماعت سے شروع ہوتی ہے لیکن طبقۂ وسطانیہ میں سب سے زیادہ
غفلت کا شکار ہو رہا ہے، اس میں اسے پڑھانے والے عام طور پر ایس وی مدرسین ہوتے ہیں
ان مدرسین کی علمی معلومات بہت محدود ہوتی ہیں، وہ خود الجبرا صرف ساتویں اور آٹھویں جماعتوں میں
اس کے بعد ایس وی کلاس میں تقریباً ایک سال پڑھتے ہیں، اس لئے وہ خود اس مضمون

عادی نہیں ہوتے اور جماعت میں بالعموم اس کی تدریس سے پہلو تہی کرتے ہیں اور تھوڑا وقت دیتے ہیں، اور اس میں بھی عام طور پر ایسے سوالات کراتے ہیں جو انہیں خود آتے ہیں اور ایسے طریقے سے کراتے ہیں جس سے وہ خود طالب علمی کے زمانے سے روشناس ہوتے ہیں، بیشتر جیسے کو نظر انداز کر دیتے ہیں، چند مخصوص طریقوں پر اکتفا کرتے ہیں، اور تھوڑا بہت جو پڑھایا جاتا ہے وہ بھی استاد کی ذاتی بے توجہی اور ان کی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے نہ پڑھانے کے برابر ہوتا ہے، اس کا اثر قدرتاً ان کے شاگردوں پر پڑتا ہے اور انہیں بھی الجبرے سے بجائے دل چسپی کے نفرت ہو جاتی ہے، الجبرا پڑھانے کی غرض و غایت اور اس کا فائدہ لڑکوں کو نہیں بتایا جاتا اور غالباً بیشتر مدرسین اسے خود بھی نہیں جانتے، وہ اس مضمون کو اوپر والی جماعتوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں لیکن اوپر والی جماعتوں میں بھی اس کا تقریباً یہی حشر ہوتا ہے، اس کے نمبروں کی کسر حساب یا دوسرے زیادہ وقت دیکر اور اس کے زیادہ سوالات کرا کے پورا کرنے کی سعی کی جاتی ہے، اس وجہ سے لڑکوں کے دلوں میں اس مضمون سے لگاؤ پیدا نہیں ہوتا، اور وہ بھی اس کو تقریباً نظر انداز کر دیتے ہیں طبقہ وسطانیہ سے ثانوی مدارج میں آنے والے طلبہ میں سے بیشتر کو مبادیات کا ابتدائی تصور مثلاً نفی × نفی = مثبت یا نفی × مثبت = نفی بھی واضح نہیں ہوتا، لڑکے جمع تفریق ضرب اور تقسیم کے پیچیدہ سوالات نہیں کر سکتے، ان سوالوں کے حل کرانے کا صحیح طریقہ بھی سکھے نہیں آتا، اگر رقوم کو ترتیب دے لیا جائے تو یہ آسانی سے ہو سکتے ہیں۔

مساوات کے استعمال میں چھوٹا اور آسان طریقہ (USE OF TRICKS) استعمال نہیں کرایا جاتا اور اس کا انحصار محض فکر و تدبر پر ہوتا ہے، اس کے عبارتی سوالات جو اس کی تعلیم کو عام زندگی سے مربوط کرتے ہیں اور اس مضمون کو خاص طور پر دلچسپ بناتے ہیں۔ نہیں کرائے جاتے۔ غیر عبارتی سوالات بھی اس انداز سے کرائے جاتے ہیں جس میں لمبی ضرب اور تقسیم والے صبر آزما اور حوصلہ شکن سوالات ہوتے ہیں۔

جن سوالات میں جواب کی پڑتال ہو سکتی ہے، مثلاً مساوات میں، ان کی پڑتال بھی نہیں کرائی جاتی۔

بچوں کے عملی کام کی طرف مدرسین بالعموم توجہ نہیں دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمل عام طور پر غلط ہوتا ہے اور بیشتر طلبہ مساوات کے سوالوں میں ہر سطر کے شروع میں یا لکھنے کی بجائے = لکھ دیتے ہیں اور کسور کے سوالوں میں جہاں پہلی سطر کے بعد = لکھنا چاہئے، کچھ بھی نہیں لکھتے اور یہ غلط ہے۔

اصول اور کلیے بتا دیئے جاتے ہیں، لیکن اخذ نہیں کرائے جاتے اور نہ پھر کافی مشق سے ذہن نشین ہی کئے جاتے ہیں۔

لڑکے گراف کو نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ اسے استعمال ہی کر سکتے ہیں، حالاں کہ الجبرے میں ترسیم کا علیحدہ باب ہے۔

غرضیکہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ امتحان کے زیر اثر پڑھایا جاتا ہے، مقاصد تعلیم کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا، ان حالات کی اصلاح کے لئے حسب ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں

الجبرا شروع کرنے سے پیشتر طلبہ پر اس کی اہمیت واضح کی جائے، انہیں بتایا جائے کہ الجبرا حساب ہی تو ہے جس میں ہندسوں کی بجائے حروف ہوتے ہیں جس وجہ سے اسے حرفی یا عمومی حساب بھی کہا جاتا ہے، اس میں حساب کے قاعدوں کی وسعت ہوتی ہے۔ مثلاً:—

$\frac{1}{3} + \frac{1}{4} = \frac{3+4}{4 \times 3}$ اور

$\frac{1}{د} + \frac{1}{ب} = \frac{ب+د}{د\,ب}$ یہ بعینہٖ حساب کی عام کسروں کو حل کرنے کا طریقہ ہے۔ اسی طرح

$د^2 \times د^3 = د^5$ سے $د^س \times د^ی = د^{س+ی}$ اس سے حساب کے مشکل سوالات بڑی آسانی سے تھوڑے وقت میں حل ہو جاتے ہیں۔

مثلاً $\frac{.9653 \times .9653 \times .9653 + .0347 \times .0347 \times .0347}{.9653 \times .9653 + .9653 \times .0347 - .0347 \times .0347}$ کو اگر حساب کے عام قاعدے سے حل کیا جائے تو لمبی حوصلہ شکن ضربیں دینی پڑتی ہیں، لیکن الجبرے کی مدد سے اسے حل کیا جائے تو یہ اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کا جواب آسانی سے ایک منٹ میں نکالا جا سکتا ہے۔

اسی طرح $91 \times 89 = (90 + 1)(90 - 1) = 90^2 - 1^2 = 8100 - 1 = 8099$ میں لمبی ضربوں سے بچ سکتے ہیں۔

جذر کا عمل الجبرے کے فارمولا $(ا + ب)^2 = ا^2 + 2اب + ب^2$ سے ہی سمجھایا جا سکتا ہے اس طرح الجبرے کا فائدہ اور ریاضی کی دوسری شاخوں اور دوسرے مضامین میں اس کا استعمال ذہن نشین کیا جائے تاکہ لڑکے اسے مفید خیال کریں اور اسی میں دلچسپی لیں ۔ اسے صرف اعلیٰ تعلیم یا کالج کے لئے ہی ضروری نہ سمجھیں بلکہ حساب کے مشکل سوالات کو بھی حل کرنے کا آسان ذریعہ خیال کریں۔

حساب کراتے وقت اگر اساتذہ قاعدوں میں اعداد کے ساتھ حروف کا بھی استعمال کریں تو یہ تصور اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

اسی طرح طلبہ کو بتایا جائے کہ حساب کے قاعدوں کو الجبرے میں عام کلیوں میں ظاہر کیا جاتا ہے اور پورے جملوں کو حروف کے استعمال سے چھوٹے کلیوں میں رکھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً حساب میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر کسی چیز کا حجم معلوم کرنا ہو تو وہ اس کی لمبائی، چوڑائی اور بلندی یا موٹائی کو آپس میں ضرب دینے سے معلوم ہوگا۔ لیکن الجبرے میں اسے اس طرح ظاہر کریں گے۔

$$ح = ا\ ب\ ج$$

حروف کے استعمال سے حساب کے عام سوالات میں ساوات بن جاتی ہیں جن کی مدد سے سوالات آسانی سے حل ہو جاتے ہیں مثلاً ۱۲۵ کو ایسے چار حصوں میں تقسیم کرو کہ اگر پہلے حصے میں ۴ جمع کریں دوسرے سے ۴ نفی کریں، تیسرے کو ۴ سے ضرب دیں اور چوتھے کو ۴ سے تقسیم کریں تو نتیجہ ہر حالت میں یکساں ہو۔

اس سے ایسا علم حاصل ہوتا ہے جس کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم میں ضرورت پڑتی ہے۔ زندگی میں بہت سی چیزیں ایک دوسرے کی تفاعل ہیں، یعنی ایک چیز میں تبدیلی کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً دائرے میں اگر قطر میں تبدیلی ہو رہی ہو محیط میں بھی ویسے ہی تبدیلی واقع ہوتی ہے

یعنی جتنا قطر گھٹتا بڑھتا جائے گا اتنا ہی محیط بھی گھٹتا بڑھتا جاتا ہے، یہاں کہا جاتا ہے کہ محیط قطر کا تفاعل (FUNCTION) ہے۔ تفاعل سے مساوات بنائی جاتی ہے، اور مساوات کا گراف کھینچا جا سکتا ہے اور اس ترسیم سے بہت سی حالتوں کو نمایاں کیا جا سکتا ہے

الجبرا کی تدریس کے لئے اسکولوں میں ایسے اساتذہ مامور کرنے چاہئیں جنہیں اس مضمون سے خاص شغف ہو، اگر ایف۔ اے یا بی۔ اے ریاضی پڑھے ہوئے گریجویٹ مل سکیں تو سب سے اچھا ہوگا ہر جماعت میں الجبرے کے نصاب کو اچھی طرح ختم کرنا چاہئے، کوئی قاعدہ چھوڑنا نہیں چاہئے جہاں تک ممکن ہو متعدد مثالیں استقرائی طریقہ (INDUCTIVE METHOD) کے استعمال سے طلبہ سے کلیئے اخذ کرائے جائیں۔ ہر کلیہ کی مشق مختلف قسم کے زیادہ سے زیادہ سوالات سے خوب کرائی جائے، سوال حل کراتے وقت طلبہ سے کلیہ کے استعمال کی وجہ بھی پوچھی جائے اور انہیں کلیے خوب ذہن نشین کرائے جائیں، یوں ہی رٹائے نہ جائیں۔ کیوں کہ اس سے حافظے پر زور پڑتا ہے اور لڑکوں میں سوچ اور عملی استعمال کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔

نوٹ:- استقرائی طریقے سے اگر فارمولا (لا + ب) (لا + ج) = لا² + (ب + ج) لا + ب ج سکھانا ہو تو پہلے لڑکوں سے دو رکنی والی آسان رقمیں دے کر ضرب دلائیں۔

مثلاً:- (لا + ۱) (لا + ۲) = لا² + ۳لا + ۲

(لا + ۲) (لا + ۳) = لا² + ۵لا + ۶

(لا + ۳) (لا + ۴) = لا² + ۷لا + ۱۲

(لا + ۴) (لا + ۵) = لا² + ۹لا + ۲۰

(لا + ۶) (لا + ۷) = لا² + ۱۳لا + ۴۲

(لا + ۸) (لا - ۴) = لا² + ۴لا - ۳۲

(لا - ۵) (لا + ۶) = لا² + لا - ۳۰

(لا - ۷) (لا - ۳) = لا² - ۱۰لا + ۲۱

پھر ان کو تختہ سیاہ پر لکھ کر ان سے یہ کلیہ اخذ کرایا جائے۔

(ا + ب)(ا + ج) = ا^2 + (ب + ج) ا + ب ج

مساوات کے قاعدے کو جلد سے جلد شروع کرنا چاہئے، بلکہ بعض اساتذہ کی رائے ہے کہ الجبرے کی ابتدا مساوات سے کی جائے اور اس کی مدد سے ابتدائی تصورات دیئے جائیں، بہر حال جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے مساوات جلد سے جلد شروع کیا جائے کیونکہ فی الحقیقت الجبرے کا یہی دلچسپ حصہ ہے، اور عملی زندگی سے وابستہ کرنے کا ذریعہ ابتدائی تصورات کو خاص طور پر توجہ دے کر پختہ کیا جائے۔

اسکولوں میں طلبہ کے عمل اور تحریری کام کی استاد کو پڑتال کرنی چاہیئے، ابتدا میں زیادہ پڑتال کی ضرورت ہے کیونکہ غلط عادات پڑ جانے پر ان کا چھڑانا نئی عادت ڈالنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر مدرس سارے سوال درست نہیں کر سکتا تو ان میں سے کم از کم دو کو تو درست کر دیا کرے یا ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ تو الجبرے کے سوالوں کی کاپیوں کی اصلاح احتیاط اور غور سے کر دیا کرے اور اغلاط کو طلبہ سے دوبارہ صحیح لکھوا کر ان کے دلوں پہ تعمیمات کو راسخ کیا کرے، ہیڈ ماسٹر صاحبان کو بھی تحریری کام کی پڑتال کے وقت اس بات کی پڑتال کرنی چاہیئے۔

الجبرے کے سوالات کراتے وقت خاص چھوٹے آسان اور دلچسپ طریقے اختیار کرائے جائیں جن سے لمبی لمبی ضربوں اور تقسیموں کی ضرورت نہیں رہتی، اور سوالات بڑی آسانی سے دلچسپ طور پر حل ہو جاتے ہیں۔

مساوات اور دوسرے قاعدوں کے سوالات میں جن میں جواب کے صحت کی پڑتال ہو سکتی ہے اصل سوال میں جواب رکھ کر طلبہ سے کرائی جائے، مساوات میں اسے ہر طرف رکھ کر ہر طرف کی قیمت علیحدہ علیحدہ نکالی جائے اور دیکھا جائے کہ دونوں طرف برابر ہیں یا نہیں۔

طلبہ کو کم سے کم کلیے یاد کرائے جائیں، لیکن جتنے بھی یاد کرائے جائیں، ان کی خوب مشق

کرائی جائے اور ان کا استعمال مختلف نوع کے سوالات سے کرا کے طلبہ کے دماغوں پر اسے را
کیا جائے کیلئے یاد کرانے کا بہترین طریقہ ہے کہ طلبہ ان کو ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا
یا اپنے کمرے کی دیوار پر ایسی جگہ جہاں وہ انہیں آسانی سے پڑھ سکیں لگا دیں اور روزانہ
دو تین دفعہ کہہ لیا کریں ، گا ہے گا ہے انہیں زبانی لکھ کر اصل سے مقابلہ کر کے اپنی یادد
کا اپنا امتحان خود بھی لے لیا کریں ، اس طرح وہ انہیں ازبر ہو جائیں گے ۔
کمزور لڑکوں کو کلاس سے علیحدہ زائد وقت دیا جائے اور ان کو معیار پر لانے کے لئے
کوشش کی جائے ۔
آج کل عام زندگی میں ترسیم کا بڑا استعمال ہوتا ہے جن چیزوں کا مقابلہ کرنا ہو
ترسیم کی مدد سے کیا جاتا ہے ، درجۂ حرارت ، بارش ، پیداوار وغیرہ کے ترسیم ہوتے ہیں
مدد سے مقابلہ واضح ہو جاتا ہے ، عام شہریوں کو ان کے سمجھنے کی اہلیت ہونی چاہیے ، لہٰ
اسے خاص طور پر سکھایا جائے ، اس کا صرف سکھا دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کا پڑھنا
استعمال بھی بتایا جائے
عام لڑکے ترسیم کی ماہیت کو نہیں سمجھتے ، شاید ہی کوئی لڑکا ہوگا جو یہ سمجھتا ہو کہ
(LOCUS) اور ترسیم دراصل ایک چیز ہیں ، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ لوکس میں اسے
کے ذریعہ اور الجبرے میں حروف (SYMBOLS) کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا
لہٰذا بہتر ہوگا کہ جیومیٹری میں لوکس پڑھانے کے بعد الجبرے میں ترسیم پڑھایا جائے ۔
اجزائے ضربی میں عام طور پر مسئلہ باقی (REMAINDER THEOREM
جماعت میں پڑھانا چھوڑ دیا جاتا ہے ، اسے چھوڑا نہ جائے بلکہ پڑھایا جائے ، ذ
کر کے مشق کرائی جائے تو یہ بہت ہی آسان معلوم ہوگا ۔

ہومرلین اور اس کی تعلیمی خدمات

انتصار مہدی

تعلیم ایک انسانی ضرورت ہے، مگر ہر ضرورت کی نوعیت مزاجِ زمانہ سے ہم آہنگ ہوا کرتی ہے۔ قرونِ اولیٰ اور وسطیٰ میں تعلیم ایک مذہبی فریضہ اور مدرسہ ایک دینی ادارہ متصور ہوتا تھا۔ مسجدوں، خانقاہوں، گرجوں یا مندروں میں ہی مدارس ہوا کرتے تھے اور مذہبی راہ نما ہی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ آگے چل کر زمانہ بدلا تو تعلیمی قدریں بھی بدل گئیں، مدرسہ اور عبادت گاہ کا رشتہ ٹوٹ گیا اور مدارس نے جداگانہ حیثیت اختیار کر لی۔ بدلے ہوئے حالات میں گھر اور مدرسہ کے دوگونہ اثرات تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئے تو کچھ لوگوں نے اقامتی مدارس (RESIDENTIAL) کی بنیاد رکھی۔ تعلیمی نفسیات کی ترقی سے دنیائے تعلیم میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا تو کچھ دھن چلے افراد نے چند مدارس حکومتِ خود اختیاری کے اصولوں پر چلائے۔

عبادت گاہوں میں تعلیم پانے والے طلبا اپنے اساتذہ سے صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں سیکھتے بلکہ سر سے پاؤں تک۔ استاد کے رنگ میں رنگ جایا کرتے تھے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان مضبوط روحانی رشتہ قائم تھا، استاد مرشد تھا اور شاگرد مرید، مگر جب مادیت کے سیلاب میں پرا[نا] نظامِ تعلیم بہ گیا تو استاد اور شاگرد کا پرانا رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا، اور مدرسہ کے ابھارے ہوئے نقوش گھر کی ناسازگار فضا میں دھندلے پڑنے لگے۔ لہٰذا گھر اور مدرسہ کی خلیج پر اقامتی مدارس کا پل تعمیر کر[نے] کی کوشش کی گئی، لیکن جلد ہی تعلیمی نفسیات کی روشنی میں تعلیمی نظریات ہی بدل گئے، مدرسہ کے

نظم ونسق اور طریق تعلیم میں بنیادی ردوبدل کے بغیر تنہا اقامتی مدارس ناکافی ثابت ہوئے، کچھ دار
حکومت خود اختیاری کے اصولوں پر قائم ہوئے۔ "جور استاد بہ زمہر پدر" کے پرانے نسخے پر خط تنسیخ
پھیرا گیا اور استاد کی حیثیت ایک جمہوری رہنما کی قرار پائی، طلبا کے لئے بیش از بیش آزادی کے مواقع
بہم پہونچائے گئے۔ تاکہ بچے کو خود اپنے تجربات کی روشنی میں تعمیر شخصیت کا موقع مل سکے۔

اس صدی کے شروع میں اسی قسم کا ایک تجربہ ہومرلین نے بھی کیا، اس نے اپنے تجربہ کے لئے
کچھ روبچوں کو منتخب کیا، بگڑے ہوئے بچوں کی اصلاح کے لئے اس کی نگرانی میں حکومت خود اختیاری
کے اصولوں پر ایک ادارہ قائم کیا گیا، کام بہت دشوار تھا۔ مگر صرف چھ سات سال کی مختصر سی مدت میں
سینکڑوں بگڑے ہوئے بچوں کی زندگیاں سنوار دیں، ہومرلین کے تجربات ہمارے لئے بھی د
کا باعث ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ ہماری ضروریات بھی کچھ اسی نوعیت کی ہیں۔

ہومرلین نہ کوئی باقاعدہ مفکر تھا نہ کوئی بلند پایہ عالم بلکہ ایک سیدھا سادھا سوفیصدی عملی
انسان تھا۔ قدرت نے اسے بچوں کی نفسیات سمجھنے اور بگڑے ہوئے بچوں کی اصلاح کا حیرتناک
ملکہ دیا تھا، ابتدائی زندگی ماں کی غلط تربیت کی وجہ سے آوارہ گردی میں گزری اور آخری ایام حکومت
کی غلط فہمی کی نذر ہو گئے، درمیان کے تھوڑے سے وقفہ میں دنیائے تعلیم میں ایک نئی عمارت کی
داغ بیل ڈال گیا۔

انیسویں صدی کے ربع آخر ([illegible]) کا ذکر ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مشہور شہر
ہڈسن میں ایک ہونہار بچہ نے جنم لیا، ہومرلین نام رکھا گیا، مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس
ہونہار بچہ کو ایک کٹر ماں کی آغوش ملی، ماں کی سخت گیری رنگ لائی اور بچہ تنگ آکر کچھ اس طرح ماں
سے بے ہاتھ ہوا کہ شہر کے اوباش لڑکوں کا سرگروہ بن کر شہر کی پرسکون فضا کو مکدر کرنے لگا، ماں
مزید سختیاں بھی بچہ کو راہ راست پر نہ لا سکیں، ماں کی روزانہ سزاؤں سے بچنے کے لئے چودہ برس
کے سن میں شمال کے قدرتی جنگلات کی طرف بھاگ نکلا۔ اور لکڑکٹوں کے پڑاؤ پر ڈیرا ڈال دیا، یہاں
مکہ بازی میں خوب نام پیدا کیا، فکر معاش دامن گیر ہوئی تو جنگل سے بھاگ کر ایک پرچون کی دکان

د پیشہ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی اسی ییل و نہار میں ہومرلین اپنی عمر کی ۳۳ ویں منزل میں
ں ہوا تو اس کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا، اس کی نظروں میں خود اپنا بھیانک بچپن پھر گیا، باپ تو
ں ہوتے ہیں مگر سمجھدار اور فرض شناس باپ کم ہوتے ہیں، بچہ کی محبت نے ہومرلین کی اصلی شخصیت
ایاں کر دیا۔ فرض شناس باپ معلم بننے پر مجبور ہو گیا، لہذا معلم دستکاری کی تربیت حاصل کرنے
لئے بوسٹن کے سلائیڈ (SLOYED) ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔

ٹریننگ اسکول میں علم النفس پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اس کا فطری ذوق جاگ اٹھا، اسی زمانہ سے
بچوں کی نفسیات کی کرید میں لگ گیا، کئی مقامات پر معلم کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد شہر ڈٹرائٹ
(DETRO) کے سرکاری اسکول میں مدرس مقرر ہو گیا، خوش قسمتی سے اس شہر میں اسے بچوں کے
لق اپنے تجربات کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا موقع ملا۔ شہر میں آوارہ گرد بد معاش نوجوانوں کی
ے جماعت پیدا ہو گئی تھی، ہومرلین پر خود کبھی یہ دَور گزر چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ ان کی اصلاح کیوں کر
سکتی ہے، اس نے ان نوجوانوں کی اصلاح کے لئے ٹرائی اسکوائر کلب (TRYS Q-UARE CLUB)
بنیاد رکھی، تعطیلات کے زمانہ میں مدارس کے طلباء شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے اور عدم
خولیت کی صورت میں تخریبی حرکات کی طرف مائل ہو جاتے تھے، اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے
ے تعطیلات کے زمانہ میں شہر کی طرف سے ان طلباء کے لئے ایک میدان میں کھیلوں کا خاص انتظام
وتا تھا، ہومرلین نے یہاں بچوں کے کھیلوں اور ان کی دلچسپیوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔
ہر عرصہ تک کھیلوں کے میدان کا مہتمم بھی رہا، یہاں سے فرصت پاکر ایک زمانہ تک ایک اسپتال میں
نھے بچوں کی پرورش اور ان کے افعال و کردار کا مطالعہ کرتا رہا، آخر کار اسی شہر کے دار الاطفال کا
ہتم ہو گیا، یہ ایک اصلاحی ادارہ تھا، بدقسمتی سے دار الاطفال (BOYS HOME) کی عمارت میں
اگ لگ گئی، ایک بچے کو آگ سے بچاتے ہوئے ہومرلین نے اپنی کلائی توڑ لی، مگر جب تک تمام بچوں
و محفوظ جگہ پر نہیں پہونچا دیا، اس وقت تک اپنی ٹوٹی ہوئی کلائی کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اسکول
کی نئی عمارت بنی تو دار الاطفال کی بجائے اس کا نام جمہوریہ فورڈ (FORD REPUBLIC) ہو گیا

ہومرلین کی تجویز یہ تھی کہ ایک بڑی مشترکہ عمارت کی بجائے جمہوریہ چند چھوٹے چھوٹے مکانات پر تقسیم ہو اور بچوں کو چند خاندانوں میں تقسیم کرکے الگ الگ مکانات میں رکھا جائے۔ اسکول کی کمیٹی نے یہ تجویز مسترد کردی تو ہومرلین ۱۹۱۱ء میں مستعفی ہوگیا، لیکن جو خواب اس نے امریکہ میں دیکھا تھا اس کی تعبیر اسے انگلستان میں ملی۔

ہومرلین بچوں کی اصلاح میں کافی شہرت حاصل کرچکا تھا۔ اس زمانہ میں انگلستان میں ڈارسٹ شائر (DORSET SHIRE) کے علاقہ میں ایک اصلاحی ادارہ کھولنے کی تجویز زیر غور تھی۔ اس سلسلہ میں ہومرلین کو اپنے نظریات پیش کرنے کے لئے دعوت دی گئی۔ یہ تجویز بارآور ہوئی اور ایورشاٹ (EVERSHOT) کے مقام پر ایک اصلاحی ادارہ بچوں کی دولت مشترکہ (LITTLE COMMONWEALTH) کے نام سے قائم ہوگیا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک بار پھر ہومرلین کو انگلستان بلایا گیا اور اس کو بچوں کی دولت مشترکہ کا مہتمم مقرر کردیا گیا۔ بدقسمتی سے ۱۹۱۸ء میں یہ اسکول بند ہوگیا۔ بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے حکومت کی یہ خواہش تھی کہ ہومرلین کو برطرف کردیا جائے۔ مگر منتظمین نے ہومرلین کے بغیر اسکول جاری رکھنے سے بہتر یہی تصور کیا کہ ادارہ توڑ ہی دیا جائے۔

اسکول بند ہونے کے بعد ہومرلین لندن چلا آیا اور کچھ دنوں نفسیاتی مشیر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ حکومت کی نظر میں پہلے ہی مشکوک ہوچکا تھا، اس پر قیامت یہ ہوئی کہ اس کے خلاف ایک مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجبوراً اسے اپنی زندگی کے آخری ایام فرانس میں سخت پریشانی میں گذارنے پڑے۔ آخر ستمبر ۱۹۲۵ء میں دنیائے تعلیم کا یہ درخشندہ ستارہ میعادی بخار اور نمونیا میں مبتلا ہوکر ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

بچوں کی دولت مشترکہ (LITTLE COMMON WEALTH) جنوبی انگلستان میں ضلع ڈارسٹ شائر (DORSETSHISE) رود بار انگلستان کے ساحل پر پھیلا ہوا ہے۔ اس علاقہ میں ایک مشہور قصبہ ہے ایورشاٹ۔ اسی قصبہ کو بچوں کی دولت مشترکہ کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ ایک نیم اصلاحی ادارہ تھا۔ اس کے بانیوں میں مسٹر جارج مانٹیگو پیش پیش

داره تقریباً سات سال زندہ رہا اور اس زمانے میں ہومرلین اس کا مہتمم رہا، تعلیم مخلوط تھی، لڑکے
لڑکیاں ایک ساتھ زیر تربیت رہتی تھیں، ادارہ ایک چھوٹی سی حکومت کا نمونہ تھا، بچے خود ہی
لم تھے اور خود ہی محکوم، اس طرح بچوں کی فطری صلاحیتوں کو خود بروئے کار آنے کا موقع دیا
اتھا۔

بادی | ادارے کی آبادی تین قسم کے عناصر پر مشتمل تھی، ایک تو بالغ عنصر تھا یہ معلم اور کام کے
ران افراد کی جماعت تھی، یہ ادارے کے تنخواہ دار ملازم تھے، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔
گ دولت مشترکہ کے نظام میں حتی الامکان ہر قسم کا اقتدار استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے، البتہ بچوں
تعلیم اور کام کی مکمل نگرانی کرتے تھے، دوسرا عنصر تیرہ ۱۳ سال سے زیادہ عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کا
ا، یہ وہ نوجوان تھے جو بچپن کی غلط تربیت کا شکار ہوکر مجرمانہ ذہنیت اختیار کر لیتے تھے، عام طور سے
سے لڑکے لڑکیاں کسی اصلاحی جیل خانہ یا ادارے کے سپرد کردیئے جایا کرتے تھے، یہ نوجوان
مر کسی عدالت سے کسی جرم میں سزایاب ہوکر اصلاح کے لئے بچوں کی "دولت مشترکہ" میں بھیجے جاتے
تے، تیسرا عنصر ان بچوں کا تھا جن کی عمریں ۱۳ سال یا اس سے کم تھیں، ان میں چند ماہ سے
ے کر تیرہ ۱۳ سال تک عمر کے لڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں، یہ وہ لاوارث بچے تھے جو بصورت دیگر
سی یتیم خانہ یا خیرات خانہ میں پرورش پاتے، اس طرح طلبہ میں چند ماہ سے لے کر انیس سالہ
ڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں دولت مشترکہ کے طلبا کی کل تعداد اکیاون افراد پر مشتمل تھی۔ بیالیس ۴۲ چودہ ۱۴ سے
یس ۱۹ کے لڑکے اور لڑکیاں اور نو چھوٹے بچے، یہ آبادی سترہ سترہ ۱۷ افراد کے تین خاندانوں
یں منقسم تھی، کسی فرد کو کسی خاندان کا ممبر بننے پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا، ہر شخص کسی بھی خاندان کا رکن
ن سکتا تھا بشرطیکہ افراد خاندان کو اس کی رکنیت پر اعتراض نہ ہو، کسی ایک خاندان میں ۱۷ افراد
ہوتے تھے جن کی طبائع اور حالات بڑی حد تک یکساں ہوتے تھے، ہر خاندان کی رہائش گاہ
الگ الگ تھی، ایک ہی خاندان میں لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوتی تھیں، تیرہ سال سے زیادہ عمر بچے

لڑکے اور لڑکیاں اپنے خاندان کے اخراجات، انتظام اور خاندان کے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہوتے تھے، اس طرح دولت مشترکہ کے خاندانوں کو زیادہ سے زیادہ حقیقی خاندانوں کی شکل وصورت دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

نظم ونسق | دولت مشترکہ کے شہریوں پر ادارہ کے ذمہ داروں کی طرف سے کوئی ضابطۂ قانون مسلط نہیں کیا گیا تھا، بلکہ انہیں موقع دیا گیا تھا کہ خود اپنے لئے مناسب قوانین وضع کر لیں، اساتذہ اور کام کے نگران حتی المقدور انتظامی معاملات میں دخل دینے سے گریز کرتے تھے، شروع شروع میں یقیناً دشواریوں کا سامنا ہوا مگر جب طلبا کو مکمل آزادی دے دی گئی تو رفتہ رفتہ انہوں نے خود اپنے لئے ضابطۂ حیات کی ضرورت محسوس کر لی، اور نتیجہ میں خود اپنی پارلیمنٹ قائم کر لی، اور عدالتی نظام درست کر لیا، چودہ سال یا اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اور لڑکیاں دولت مشترکہ کے شہری تھے، ان کو رائے دہی کا حق حاصل تھا قوانین وضع کرنے کے لئے طلباء کی اپنی ایک پارلیمنٹ تھی، ہر شہری اس کا ممبر تھا، شہری قوانین کا احترام نہ کرنے والوں سے نپٹنے کے لئے ایک شہری عدالت تھی، اس عدالت کا جج ایک طالب علم ہی ہوتا تھا جو خود ان کا منتخب کردہ ہوتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے کوئی ملزم جج کے فیصلہ سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ تو اسے آخری عدالت میں اپیل کا حق بھی حاصل تھا، آخری عدالت تمام شہریوں پر مشتمل ہوتی تھی اور عام رائے شماری سے فیصلہ ہوتا تھا، اور یہ فیصلہ آخری ہوتا۔

اقتصادی نظام | "دولت مشترکہ" ایک خود مکتفی ادارہ تھا، ہر شہری اپنے تمام اخراجات کا ذمہ دار تھا، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کہیں اور سے رقم لاکر اخراجات پورے کئے جائیں، بلکہ دولت مشترکہ کے اندر ہی شہری کو اپنی روزی کمانا پڑتی تھی، ہر شہری کو تعلیمی اوقات کے بعد اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی نہ کسی پیشہ کا کام لازمی طور سے کرنا پڑتا تھا، اس کام کی اجرت دولت مشترکہ کے سکول میں ادا کی جاتی تھی، اجرت کا نرخ وہی تھا جو دولت مشترکہ سے باہر اس قسم کے کام کا تھا، شہریوں کا بیشتر وقت اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے روزی کمانے میں صرف ہوتا تھا، اپنی کمائی کو صرف کرنے میں ہر شہری آزاد تھا، چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے کام لازمی نہ تھا، ان کا اصل کام علم حاصل کرنا تھا، البتہ

تعلیمی اوقات کے بعد وہ کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔

دولت مشترکہ کا نظام چلانے کے لئے شہری ٹیکس بھی ادا کرتے تھے، اس طرح دولت مشترکہ کا باسرکاری خزانہ بھی تھا، سرکاری خزانہ کی آمدنی دولت مشترکہ کی حکومت عام طور سے مفاد عامہ کے موں پر صرف کرتی تھی، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی سست اور کام چور شہری یا کوئی غیر منظم شہری اپنی آمدنی اور خرچ کا توازن قائم نہ رکھ سکتا۔ کبھی کبھی کوئی غیر مطمئن شہری دولت مشترکہ یا کسی شہری کو نقصان بھی پہونچاتا، بعض اوقات کوئی شہری اپنے اخراجات ادا کیے بغیر بھاگ جاتا تھا، ایسی تمام صورتوں میں واجب الادا رقوم سرکاری خزانہ سے ادا کر دی جایا کرتی تھیں، اسی طرح اگر شہری عدالت کسی شہری پر کوئی ایسا ہرجانہ عاید کر دیتی جو اس کی کمائی پر اثر انداز ہوتا تو تمام شہری اس کی ضروریات مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

دولت مشترکہ کی امتیازی حیثیت اُس دور کے دیگر اصلاحی اداروں سے یہ دولت مشترکہ بہت کچھ مختلف تھی، تمام اصلاحی مدارس میں ذمہ داروں کی طرف سے قوانین اور ضوابط طلباء پر مسلط کیے جاتے تھے، جن کی پابندی بہرحال ان کے لئے لازمی ہوا کرتی تھی، مگر انسان کسی قدر باغیانہ فطرت کا مالک ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے ہر وہ پابندی ناگوار گذرتی ہے جو کسی با اقتدار ہستی کی طرف سے ٹھونس دی جائے، خاص طور سے بچے اس معاملہ میں بڑے حساس ہوتے ہیں، بچہ ایک کام خود بڑے ذوق شوق سے کرتا ہے، مگر جب کوئی اسی کام پر مجبور کرتا ہے تو اس کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے اور شوق بغاوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام بچوں کے لئے بالعموم اور بگڑے ہوئے بچوں کے لئے بالخصوص اس قسم کی پابندی مفید سے زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے، لیکن دولت مشترکہ میں کوئی ضابطہ باہر سے نہیں ٹھونسا گیا بلکہ طلباء کے لئے ایسا سازگار ماحول پیدا کر دیا گیا کہ وہ قانون کی ضرورت محسوس کرنے لگیں اور ضرورت کے ماتحت اپنے اوپر خود پابندی عاید کر لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ قانون شکنی کے عادی لڑکے اور لڑکیاں نہ صرف قانون کا احترام کرنا سیکھ گئے بلکہ قانون کی پابندی پر ایک طرح کا فخر محسوس کرنے لگے، اس لئے کہ یہ قوانین خود ان کے اپنے

وضع کئے ہوئے تھے۔

دنیاوی زندگی میں بالعموم اخلاق اور خوش حالی کا رشتہ قائم نہیں رہتا، جب معاد کی فکر ہوتی تو اپنے فائدے کے سامنے دوسرے کا خیال نہیں رہتا، اکثر خرابیاں اسی وجہ سے رونما ہوتی ہیں چوربازاری اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ اسی مطلب پرستی کا نتیجہ ہیں، مگر دولت مشترکہ میں خوش حالی کی بنیادیں اخلاقی قدروں پر قائم تھیں، اگر ایک طرف شہری اپنی خوش حالی کے لئے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتے تھے تو دوسری طرف کسی ضرورت مند یا قابل اصلاح شہری کی مدد بھی پوری خندہ پیشانی سے کر دیا کرتے تھے، اگر کسی نافرض شناس شہری کی بے راہ روی کی وجہ سے دولت مشترکہ کے سرکاری خزانہ پر بے جا بار پڑتا تھا تو چیں بجبیں نہیں ہوتے تھے، غلط کار افراد کے ساتھ شہریوں کا رویہ انتقامی نہ تھا، بلکہ ہمدردانہ تھا، ماننا پڑتا ہے کہ نوجوان انسانی فطرت کی خوبیوں کو بروئے کار لانے کا کامیاب ترین لائحہ عمل وہی ہے جو دولت مشترکہ نے اختیار کر رکھا تھا یعنی ڈنڈے کے زور سے نیک بنانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ طلبا کو خود ذمہ دار بنا کر ایسا سازگار ماحول پیدا کر دیا جائے کہ فطری خوبیاں بغیر کسی روک ٹوک کے پھل پھول سکیں، اس طرح انسانی کردار فطری سانچے میں ڈھلتا ہے، ورنہ نیکی ریاکاری کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی، یہی وجہ تھی کہ نافرض شناس اور مجرم افراد کے ساتھ دولت مشترکہ کی شہری عدالت کا اخلاقی معیار ہمیشہ واضح اور مکمل رہا ہے، جرموں کے فیصلے کبھی اس خیال سے متاثر نہیں ہوئے کہ فلاں جرم سے شہریوں پر بار پڑتا ہے اور فلاں سے نہیں، بلکہ فیصلہ کا معیار ہمیشہ ایک رہا یعنی مجرم کی اصلاح۔ اگرچہ دولت مشترکہ کے نظام میں اقتصادیات کو بڑی اہمیت حاصل تھی، پھر بھی اخلاقی قدریں روپیہ پیسہ کے ترازو میں نہیں تلا کرتی تھیں دولت مشترکہ کے شہری مالی منفعت سے بالاتر ہو کر بھی طرز عمل اختیار کر لیا کرتے تھے۔

ابتدائی دشواریاں دولت مشترکہ کی مختصر سی زندگی میں سب سے زیادہ دلچسپ دور ابتدائی چند ماہ کا زمانہ تھا، شروع شروع میں تقریبًا پندرہ ایسے لڑکے اور لڑکیاں جمع کئے

ہ کسی نہ کسی جرم میں ماخوذ تھے، ان طلبا پر حکومت خود اختیاری کا تجربہ شروع کیا گیا، یہ طلبا صرف معاشرتی قدروں سے نابلد ہی نہ تھے بلکہ ایک طرح سماج دشمن حرکات کے عادی ہو چکے تھے گھٹی ہوئی گندی آبادیوں میں جنم لیا اور اسی گھناؤنے ماحول میں پرورش پائی، ہر طرف سے طاقت اور اقتدار نے ان کو اس طرح کس رکھا تھا کہ اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا، ایک طرف سے والدین کا دباؤ تو دوسری طرف سے پولیس کا خوف اور تیسری طرف سے اسکول کے ذمہ داروں کی کڑی نگرانی اور سخت ضوابط، نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں اپنے آپ پر قابو پانے کی صلاحیت مرچکی تھی، ان کی حالت ایک مسلے ہوئے پودے کی سی تھی، جب تک اسے سہارا ملتا ہے سیدھا رہتا ہے اور جب ٹیک ہٹا لی جاتی ہے زمین پر لیٹ جاتا ہے، جب تک کسی صاحبِ اقتدار کی کڑی نگرانی میں رہتے بڑے منظم اور پُرسکون نظر آتے اور ادھر نگران کی نظر چوکتی اور ادھر ان کی تخریبی کارروائیاں شروع ہو جاتیں، وحشی انسانوں کی طرح اقتدار کے مقابلہ میں تعاون پر فوراً آمادہ ہو جاتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جب تک الگ الگ رہتے بڑے دبے دبائے رہتے، اور اُدھر ان میں ایک جہتی پیدا ہو جاتی اور اُدھر جارحانہ اور سماج دشمن حرکات شروع ہو جاتیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت غلط تربیت کی وجہ سے کچے دھاگے کی طرح الجھ کر رہ گئی تھی، اس کا سلجھانا بڑا دشوار مسئلہ تھا۔

دشواریوں کا علاج ان بگڑے ہوئے نوخیز لڑکے اور لڑکیوں کا مرض کچھ اس طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ غیر معمولی ذرائع کے بغیر علاج ناممکن تھا، شروع شروع میں جب دولت مشترکہ کے ذمہ داروں نے اُن سے کھلے لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ تم اپنے طرزِ عمل میں بالکل آزاد ہو، تم جو کچھ چاہو کر سکتے ہو تو یہ مظلوم کچھ اس طرح پس چکے تھے کہ ذمہ داروں کی بات پر یقین کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے، جب تک استاد یا نگران موجود رہتے، دبے دبائے اور سہمے ہوئے رہتے اور جب تنہا ہوتے تو ان میں زندگی کی لہر پیدا ہو جاتی، مگر عموماً اس زندگی کا رُخ تخریب کی طرف ہوتا تھا، توڑ پھوڑ، لڑائی بھڑائی، دنگا فساد اور شور و شر ان کی پسندیدہ حرکات تھیں، ایسا لڑکا ان کا محبوب سرگروہ

بن جایا کرتا تھا جو سب سے زیادہ غلیظ زبان استعمال کرسکتا تھا یا تخریبی کارروائیوں میں پیش پیش رہتا تھا اور بڑوں کے مقابلہ میں توہین آمیز طرزِ عمل اختیار کرسکتا تھا ظاہر ہے کہ ان کے نظریات سو فیصدی سماج دشمن تھے، یہ نظریات اتنے پختہ ہوچکے تھے کہ ان کا بدلنا ٹیڑھی کھیر تھی۔

بچوں کے تصورات اور نظریات بدلنے کے دو طریقے ہیں ایک رسمی اور دوسرا منطقی، رسمی طریقہ تو یہ ہے کہ بچہ کی ناپسندیدہ حرکات کو طاقت سے دبا دیا جائے اور سزا یا انعام کے ذریعے نئے نظریات کی طرف مائل کیا جائے، ہمارے ملک میں عام طور سے بچہ کی اصلاح اسی عنوان سے کی جاتی ہے، مگر جبر یا رشوت کا بچہ پر زیادہ اثر نہیں ہوتا، جبر یا سزا سے بچہ بغاوت پر آمادہ ہوجاتا ہے نیز جھوٹ یا فریب کا عادی بن جاتا ہے، انعام کو بچہ رشوت سمجھتا ہے اور رفتہ رفتہ ضد اور ہٹ کا عادی ہوجاتا ہے، لہٰذا ان بگڑے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کی اصلاح کے لئے دولت مشترکہ کے مہتمم ہومرلین نے اصلاح کا منطقی عنوان اختیار کیا یعنی دولت مشترکہ کے طلباء کی تخریبی حرکات کی اس حد تک ہمت افزائی کی کہ تخریب سے ان کی دلچسپیوں کا خاتمہ ہوگیا اور نتیجہ میں ان کے معاشرتی نظریات خود بخود بدل گئے، ہومرلین نے نہ صرف ان کی تخریبی کارروائیوں کی ہمت افزائی کی، بلکہ خود ان میں شریک ہوگیا، اس طرح تخریبی کارروائیوں کی ساری دلچسپیاں ختم ہوگئیں، آدھی رات کو چھپ چھپ کر تکیوں سے جنگ ہوتی تھی، راتوں کو توشہ خانہ پر حملے ہوتے اور دوسری توڑ پھوڑ کو عملی جامہ پہنایا جاتا تھا، ہومرلین نے ان حرکات میں دلچسپی لینا شروع کی، شروع شروع میں لڑکے جھجکے مگر رفتہ رفتہ ہومرلین خود اسی گروہ کا ایک فرد بن گیا، ان کے مشوروں میں شریک ہوتا اور خود بھی تکیوں کی جنگ میں حصہ لیتا، جب لڑکوں نے دیکھا کہ دولت مشترکہ کے سب سے بڑے ذمہ دار نے نہ صرف تخریبی کارروائیوں کی اجازت ہی دے رکھی ہے، بلکہ خود بھی عملی حصہ لیتا ہے تو ان حرکات میں جو خطرے کا عنصر تھا ختم ہوگیا، یہ حرکتیں لڑکے اس لئے کرتے تھے کہ ممنوع تھیں، مگر جب کوئی رکاوٹ ہی نہیں تو ایسے افعال میں مزا ہی کیا رہا، لہٰذا تخریب سے کوئی وجہ بھی باقی نہ رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تخریبی ذہنیت کی بیخ کنی ہوگئی، اب تعمیری کام بہت کچھ آسان

ر چکا تھا، طلبہ کے نظریات بالکل بدل چکے تھے، وہ خود اپنی اصلاح کی طرف مائل تھے، رفتہ رفتہ
نی زندگی کو با قاعدہ بنانے کے لئے ان کو بھی قواعد اور قوانین کی ضرورت محسوس ہونے لگی، غلط
بیت کے نتیجہ میں ان کی صحیح فطرت مسخ ہو گئی تھی، ہومرلین نے اسی فطرت کو پھر اصلی راہ پر ڈال
یا تھا، اس کا اثر یہ ہوا کہ طلبا نے خود ایک قسم کا پارلیمانی نظام قائم کر لیا اور اس پارلیمنٹ نے
اسب قوانین وضع کر لئے، اب قانون دشمن عناصر قانون دوست بن چکے تھے، پھر بھی کچھ نئے
راد آتے رہتے تھے جو اپنی پرانی عادتوں کو کچھ دنوں تک دولت مشترکہ میں بھی دہراتے رہتے
ے، ان کی روک تھام اور اصلاح کے لئے طلبا نے ایک عدالتی نظام بھی قائم کر لیا، مختصر یہ ہے
بچوں کی دولت مشترکہ صحیح معنوں میں دولت مشترکہ بن گئی ۔

امیل یا روسو کی تعلیم

توقیر مرزا المتقی

مسلسل نمبر 19

یہ بیان کرتے کرتے کہ بچے کی فرصت کے طویل اوقات کو کس طرح صرف کیا جائے میں ایسی تفصیلات میں چلا گیا جو بادی النظر میں مبہم اور فضول معلوم ہوتی ہیں، آپ کہیں گے "واہ یہ عجیب قسم کی تعلیم ہے کہ آپ خود اس کی نکتہ چینی کر رہے ہیں یہ تو محض وہی سکھاتی ہے جس کے سیکھنے کی کسی کو ضرورت ہی نہیں ہے۔ بھلا اس علم کے حصول میں وقت ضائع کرنے سے آپ کو کیا فائدہ جو بلا کسی دقت یا محنت کے از خود حاصل ہو جاتا ہے؟ بارہ سال کی عمر کا کیا کوئی ایسا بچہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنے استاد کی دی ہوئی تعلیم سے واقف ہونے کے باوجود بھی ان امور سے لاعلم ہو جو آپ اپنے شاگرد کو سکھانا چاہتے ہیں"

جناب عالی آپ کو تسامح ہو رہا ہے، میں اپنے شاگرد کو ایک ایسا ہنر سکھا رہا ہوں جس کے حصول کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے، اور جس سے آپ کا طالب علم قطعاً محروم ہے، یہ ہنر جاہل رہنے کا ہنر ہے۔ کیوں کہ کسی ایسے شخص کا علم جو اپنے حقیقی ذاتی علم کے متعلق محض یہی خیال رکھتا ہے کہ وہ جانتا ہے ایک نہایت ہی معمولی چیز ہے، آپ سائنس پڑھاتے ہیں چلئے بہت اچھا ہے، میں اس کے حصول کے لئے ضروری اوزار تیار کرانے میں مشغول ہوں، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وینس والے سینٹ مارک کے گرجا کے خزانوں کا مظاہرہ ہسپانوی سفیر کے روبرو کر رہے تھے، سفیر نے محض ایک یہ فقرہ کہا -Q.U.TNOM RADICE) پس میں جب کبھی کسی استاد کو اپنے شاگرد کی قابلیت اور علمیت کا مظاہرہ کرتا دیکھتا ہوں تو مجھے بھی ہمیشہ اس کے روبرو یہی الفاظ دہرانے کی ترغیب ہوتی ہے۔

ہر وہ شخص جس نے قدیم لوگوں کی طرز معاشرت پر غور کیا ہے ان کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی جن کی بدولت دیگر حاضر کے لوگوں سے بہت ممتاز تھے ان کی طبعی ورزشوں سے متصف اور متعلق کرتا ہے۔ مونٹیگنی (MONTAIG) اس خیال پر جو زور دیتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل پر بھی اس کا بہت بڑا اثر تھا، بار بار وہ اس طرف ہی رجوع کرتا ہے، بچے کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔ "دماغ قوی کرنے کے لئے آپ کو رگ اور پٹھوں کو مضبوط کرنا ضروری ہے، بچے کو محنت اور مزدوری کی عادت ڈال کر آپ مصائب و آلام برداشت کرنے کے لئے تیار کر دیتے ہیں۔ ریاحی درد اور طبعی بیماریوں کی تکالیف برداشت کرنے کے قابل بنانے کے لئے اس کو جسمانی ورزشوں اور سختیوں کی سختیوں میں ڈالنا نہایت ضروری ہے"۔ فیلسوف لاک (LOCK) مسز رولن (ROLL) لائق تلیوری (FLURY) اور خود نما کراوزاس (CROVJUS) سب کے سب آپس میں کتنے ہی مختلف الخیال ہوں لیکن محض بچوں کی جسمانی ورزش کے ایک معاملہ میں بالکل متفق ہیں۔

یہی ان کی معقول ترین نصیحت ہے اور اسی ایک کو نفیتی طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے میں اس کی اہمیت پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں، اور چونکہ لاک کی کتاب سے بہتر اور معقول دلائل مجھے اور کہیں نہیں ملے، اس لئے میں چند اپنے ذاتی خیالات کے اضافہ کے ساتھ انہیں کو نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

لباس زیر تعلیم بچے کے اعضا کو اس کے لباس کے اندر ہلنے چلنے کی آزادی ہونی چاہئے ان کی روئیدگی اور نقل و حرکت کی مزاحمت نہ ہونے پائے، انہیں کوئی تنگ اور جسم سے چپٹا ہوا لباس نہ پہنانا چاہئے کسی قسم کی پیٹی وغیرہ نہ باندھنی چاہئے۔ فرانسیسی طرز کا لباس جو لوگوں کے لئے تکلیف دہ اور مضر صحت ہوتا ہے بچوں کے لئے بالخصوص نہایت ہی مضرت رساں ہے محبوس یا ٹھہرا ہوا پسینہ جس کی روانی بند ہو چکی ہے، سکوت کی حالت میں سڑ جاتا ہے اور یہ عمل عہدی اور مجہول زندگی میں بہت جلد جلد ہوتا رہتا ہے جس کے باعث فساد پیدا ہو کر کبھی

یا خارش کی بیماریاں نمودار ہو جاتی ہیں، یہ بیماریاں جو ہم میں روز بروز ترقی پکڑتی جا رہی ہیں ان قدیم لوگوں میں جن کا لباس اور طریقہ معیشت انہیں ان سے محفوظ رکھتا تھا بالکل معدوم تھیں۔ گھوڑے سواروں کا لباس اس کی کمی کو پورا کرنے کی بجائے اس میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور چند فیتوں کو ترک کرنے کی خاطر بچے کے سارے جسم ہی کو کس دیتا ہے، بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ بچوں کو حتی الامکان فراک پہنایا جائے، پھر مابعد ڈھیلے ڈھالے کپڑے زیب تن کرائے جائیں، کوئی وضع معین کرنے کی سعی نہ کی جائے، ورنہ بچے کو بدشکل بنانے کا یہ دوسرا طریقہ ہوگا۔ بچوں کی جسمانی اور دماغی تمام خرابیوں کی بنیاد محض ایک ہی خواہش یا شوق میں پائی جاتی ہے یعنی یہ کہ بچوں کو قبل از وقت آدمی بنا دینا۔

بعض رنگ بھڑک دار اور شوخ ہوتے ہیں اور بعض صوتیانے اور ہلکے، بچہ ہمیشہ شوخ اور بھڑک دار ہی رنگ پسند کرتا ہے اور وہ اس کے لئے موزوں بھی ہوتے ہیں۔ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ اس فطرتی موزونیت کا کیوں خیال نہ کیا جائے۔ لیکن جس وقت بھی کسی شے کو محض اس وجہ سے بچہ ترجیح دینے لگتا ہے کہ وہ بیش بہا اور قیمتی ہے تو اس وقت اس کا دل عیاشی کے تخیل سے متاثر ہو چکتا ہے اور وہ فیشن اور خوش وضعی کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ پس یہ ذہنیت قدرتاً اس کی ذاتی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بیان کرنا مشکل ہے کہ لباس کے اس شوق کا تعلیم پر کیا کچھ اثر پڑتا ہے، اور اس مذاق کی نیت کیا ہوتی ہے۔ نہ صرف کوتاہ اندیش مائیں اپنے بچوں کو زیورات بطور انعام دیتی ہیں بلکہ بعض اتالیق بھی ایسے احمق ہوتے ہیں کہ اپنے شاگرد سادہ اور موٹا جھوٹا لباس محض سزاءً پہنواتے ہیں۔ اس فقرے سے "اگر تم سبق اچھی طرح یاد نہ کرو گے اور اپنے لباس کی ٹھیک حفاظت نہ کرو گے تو تم کو اس کسان کے بچے کی طرح کے کپڑے پہنا دیئے جائیں گے"۔ یہ مراد ہوتی ہے کہ "یاد رکھو! آدمی لباس ہی سے بنتا ہے"۔ اس میں کونسی تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ ہمارا نوجوان اس سبق سے فائدہ اٹھاتا ہے اور سوائے لباس کے دوسری کسی چیز کی پروا نہیں کرتا، اور صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر وہ کسی کی بھلائی برائی کا اندازہ لگاتا ہے۔

ده لباس کی ترغیب دینے کا سبق

اگر اس طرح کا بگڑا ہوا کوئی بچہ مجھے درست کرنے کو ملے تو میں یہ انتظام کروں گا کہ اس کا عمدہ سے عمدہ لباس ایسا
بواؤں گا کہ اس میں وہ ہمیشہ اکڑا بندھا اور ہر طرح سے بے چین رہے، آزادی اور آرام اس کی
ن شوکت کے باعث پریشان ہو جائیں، اگر وہ زیادہ سادہ لباس پہنے ہوئے بچوں کے کھیلوں میں شریک
جاتا ہے تو سارے بچے کھیل چھوڑ کر بھاگ جائیں، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں ٹھاٹھ باٹ
ان و شوکت سے تھکا کر اس کو ایسا عاجز کردوں گا کہ سنہرے فیتوں کے کوٹ کو وہ اپنی زندگی کا
ون خیال کرنے لگے گا جتنا کہ اندھیرے گپ جیل خانے کو بھی دیکھ کر اتنا خوفزدہ نہ ہوگا جتنا
ہ سنگار کی تیاری کے سامان کو دیکھ کر دہشت کھائے گا، تاثرات کی غلامی کا طوق پہننے کے قبل
کی فطرتی خواہش ابتداءً ہمیشہ آزادی اور سکون حاصل کرنے کی ہوتی ہے، وہ ہمیشہ ایسے سیدھے
دھے لباس کو پسند کرتا ہے جس میں اس کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو سکے۔

بہت سی عادتیں جسمانی بھی ہوتی ہیں بعض کامیاب زندگی کے لئے سزاوار اور بعض مجہول اور نکمی زندگی
لئے موزوں ہوتی ہیں، آخر الذکر زندگی رطوبتوں کے لئے معتدل اور ہموار ارادہ پیدا کر دیتی ہے
ر اس میں جسمانی حفاظت کی غرض سے سردی گرمی کی احتیاط لازم ہے، اول الذکر میں کام کے بعد آرام
ر گرمی کے بعد سردی سے گذرنا ضروری ہوتا ہے، پس ان تغیرات کا جسم عادی ہونا چاہیئے، لہذا
وگ دفتری یا بیٹھے بیٹھے کام انجام دیتے ہیں، ان کو ہمیشہ گرم لباس استعمال کرنا چاہیئے، تاکہ حتی الامکان
قت اور ہر موسم میں اپنی جسمانی حرارت کا درجہ یکساں رکھ سکیں، لیکن بہر حال جو لوگ دھوپ، ہوا اور
ش میں چل پھر کر زیادہ محنت اور مشقت کرتے ہیں اور زیادہ وقت کھلے میدانوں میں گذارتے ہیں
ن کو ہلکا لباس استعمال کرنا چاہیئے، تاکہ موسمی تبدیلیوں کے عادی ہو جائیں اور ہر درجہ کی حرارت اور
ھنڈک بلا تکلف برداشت کر سکیں، میں ہر دو کو مشورہ دیتا ہوں کہ تبدیلی موسم کے ساتھ وہ کبھی اپنا لباس
ہ تبدیل کریں، میرے شاگرد اسمٰعیل کی تو کم از کم یہی عادت ہوگی، اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ عہد یوسف کی
انند وہ موسم گرما میں بھی زمستانی لباس ہی استعمال کرے گا، بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ وہ گرمائی لباس موسم سرما

میں بھی محنتی اور جفاکش لوگوں کی طرح استعمال کرے گا۔ سر اسحاق نیوٹن کا مستقلاً یہی طریقہ تھا اور وہ
اسی سال تک زندہ رہا۔

برس کے بارہ مہینے اسمٰعیل ننگے سر ہی رہے گا۔ قدیم مصری ہمیشہ برہنہ سر ہی پھرا کرتے تھے۔ فارس
والے بھاری بھاری کلغیوں دار کلاہیں استعمال کرتے تھے، اور اب بھی بڑے بڑے شملے باندھتے ہیں۔ جو
جارڈین کے قول کے مطابق وہاں کی آب وہوا کے لحاظ سے ضروری اور موزوں ہیں۔ فارس والوں
اور مصریوں کی کھوپڑی کے درمیان ایک لڑائی کے موقع پر ہیروڈوٹس نے جس فرق کا مشاہدہ کیا ہے اُس کا
میں نے کہیں اور ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ دماغ کو ضرر سے محفوظ رکھنے ہی کے لئے بلکہ اس کو نزلے زکام بخار
اور ہوا کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی کھوپڑی کی ہڈیاں زیادہ سخت اور ٹھوس ہونی چاہئیں۔
نازک اور مسام دار نہ ہونی چاہئیں، اس لئے اپنے بچوں کو سردی گرمی ہمیشہ ننگے سر رہنے کا آپ عادی
بنائیں، اگر رات کے وقت آپ اس غرض سے ان کو ٹوپی پہنانا چاہتے ہیں کہ ان کے بال صاف ستھرے
رہیں تو ٹوپی کا کپڑا نہایت پتلا اور جالیدار ایسا جھر جھرا ہوا چاہیئے جیسا کہ باسک (BOOGUC) اپنے سر کے
بال ڈھانکنے کے لئے استعمال کرتی تھی، یہ میں جانتا ہوں کہ اکثر و بیشتر مائیں میرے دلائل کے مقابلہ میں
جارڈین کی رائے کو ہی ترجیح دیں گی اور خیال کرلیں گی کہ ہر جگہ کی آب وہوا فارس ہی جیسی ہوتی ہے لیکن میں نے
ایک یوروپین شاگرد کو ایشیائی بنانے کے لئے منتخب تھوڑے ہی کیا ہے۔

بچوں کو بالخصوص آغاز سن میں بیحد کپڑوں سے اکثر لاد دیا جاتا ہے، ان کو گرمی کی بجائے سردی کا
عادی بنانا چاہیئے، شدید سردی بچوں کو کبھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچا سکتی، بشرطیکہ کافی کم عمری
میں ہی ان کو باہر نکالا جانے لگے، لیکن ان کی کھال نہایت ملائم اور نازک ہونے کی وجہ سے پسینے کے لئے
بالکل آزاد راستہ چھوڑ دیتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ شدید گرمی سے بھی وہ بے انتہا کم تعداد میں بچتے رہتے
ہیں، دیکھا گیا ہے کہ ماہ اگست میں بچوں کی اموات کا اوسط سب سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ کہ جنوبی یورپ
کے باشندوں کا مقابلہ کرنے سے یہ واقعہ حد یقین کو پہونچ گیا ہے کہ شدید گرمی برداشت کرنے کی
نسبت شدید سردی برداشت کرنے سے زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے، لیکن جوں جوں بچے کا جسم

ونما پاتا چاہیے۔ اور اس کے رگ و پٹھوں میں قوت آتی جائے، بتدریج آپ اس کو سورج کی
مازتیں برداشت کرنے کا بھی عادی بناتے رہیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کو اس قدر سخت جان
دیں کہ منطقہ حارہ کی جلتی ہوئی دھوپ کا بھی وہ بلا خوف و خطر مقابلہ کر سکے۔

لاک ہم کو معقول و مردانہ مشورہ دینے کے دوران میں اس قدر مختلف اور بے ربط ہو گیا ہے
ایسے محتاط مفکر سے مشکل ہی کوئی ایسی توقع کر سکتا ہے، وہی شخص جو بچوں کو ٹھنڈے برف کے
نی سے غسل کرانے کا قائل ہے، ان بچوں کو جبکہ وہ گرما گرم ہوں، یا سیلی ہوئی گھاس پر لیٹے ہوں
ٹھنڈا پانی پینے تک سے منع کرتا ہے، لیکن وہ ان کو کبھی برساتی جوتے استعمال نہیں کرنے دیتا
جب بچہ ٹھنڈا ہونے کے بجائے گرمایا ہوا ہو تو زیادہ پانی کو وہ کیوں داخل ہونے دے اور
نتیجہ وہ ہاتھ پاؤں جسم اور چہرے کے متعلق نکالتا ہے۔ کیا ہم بھی پاؤں و جسم کے متعلق وہی نتیجہ اخذ نہ
یں؟ اگر وہ آدمی کے چہرے کو اس قدر اہمیت دیتا ہے تو مجھ پر یہ الزام کیوں لگایا جاتا ہے کہ میں
ن کے پاؤں کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں؟

لاک کہتا ہے کہ بچہ جب گرم ہو تو اس کو ٹھنڈا پانی پینے کے قبل روٹی کا ایک ٹکڑا کھانے کی
ادت ڈالنی چاہیے، یہ عجیب بات ہے کہ جب بچہ پیاسا ہو تو اس کو روٹی کھلائی جائے، میں تو
ب دھوکا ہوگا تو فوراً پہلے پانی پلاؤں گا، اس معاملہ میں آپ مجھے کبھی قائل نہیں کر سکتے
ابتدائی فطرت ایسی بے قاعدہ ہو سکتی ہے کہ زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر ہم اس کی تکمیل نہیں
ر سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو آدمی زندہ رہنا سیکھنے کے قبل کئی مرتبہ ہلاک ہو جاتا۔

جب کبھی ایمیل پیاسا ہوگا، اس کو جیسی حالت میں بھی ہو تازہ پانی پلایا جائے گا، کڑکڑاتے
جاڑوں یا پسینے کی حالت میں بھی پانی کی ٹھنڈک کم نہ کی جائے گی، میں صرف اتنی ہی احتیاط ملحوظ رکھوں گا
کہ دیکھ لوں کہ پانی کہاں کا اور کیسا ہے۔ اگر پانی بہتے دریا کا ہوگا تو ویسا ہی اس کو پلا دوں گا
اگر کسی چشمہ کا ہوگا تو اس کو تھوڑی دیر ہوا میں رکھ کر پلاؤں گا، موسم گرما میں دریا کا پانی بھی گرم ہو جاتا ہے
چشمے کا پانی ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اس کو ہوا نہیں لگتی، پس چشمے کے پانی کے لئے آپ کو اتنی دیر انتظار

کرنا چاہیئے کہ اس کا درجۂ حرارت ہوا کے درجۂ حرارت کے مماثل ہو جائے، جاڑوں میں چشمے کا پانی دریا
کے پانی کی نسبت زیادہ محفوظ ہوتا ہے، بہرحال جاڑوں میں پسینہ آنا ایک نہایت غیر معمولی اور خلاف فطرت
بات ہے، بالخصوص کھلی ہوا میں، تو آہی نہیں سکتا، کیوں کہ ٹھنڈی ہوا جلد کو تنگ کر کے پسینے کو اندر کر دیتی ہے اور
مسامات کو اس قدر کشادہ ہونے نہیں دیتی کہ پسینہ باہر نکل سکے میرا ارادہ، اسمٰعیل کو اب آگ کے قریب
ورزش کرانے کا نہیں ہے، بلکہ میں تو اس کو میدان کی برف میں ورزش کراؤں گا، برف میں کھیلنے اور
اور اس کے گولے بنانے میں اگر وہ گرما جائے اور اس کو پیاس لگے تو پانی پینے دیجئے اور پھر کھیل میں
لگ جانے دیجئے، آپ کو کسی نقصان کا خوف نہ کرنا چاہیئے، اور اگر کوئی دوسری ورزش کرتے وقت اس کو
پسینہ آجائے تب بھی جاڑوں میں اس کو ٹھنڈا ہی پانی پلائیے بس فقط اس کا خیال رکھئے کہ پانی پینے
کے لئے وہ خود ہی کافی ٹھنڈا ہو جائے گا، سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ ان تدابیر کو اس سے پوشیدہ
رکھنے کی احتیاط کی جائے میں تو چاہتا ہوں کہ ہمیشہ تندرست رہنے کی بجائے وہ کبھی کبھی بیمار بھی پڑا کرے۔

بچے دن بھر کثرت سے ورزش کرتے رہتے ہیں اس لئے ان کو نیند کی بڑی سخت ضرورت
ہوتی ہے، ایک فعل دوسرے فعل کی کمی کو پورا کر دیتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فعل ضروری ہیں
رات کا وقت قدرت نے آرام کے لئے مختص کیا ہے، یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جب سورج افق کے نیچے
چھپ جاتا ہے تو نیند زیادہ تسکین بخش اور آرام دہ ہو جاتی ہے، اور یہ کہ جب سورج کی کرنیں کرۂ ہوائی
کو گرماتی ہیں تو ہمارے حواس بھی ساکن نہیں رہتے یقیناً صحت کے لئے بہترین عمل یہی ہے کہ سورج
نکلنے کے ساتھ اٹھو اور اس کے غروب کے ساتھ ہی بستر میں گھس جاؤ، پس ہمارے ملک میں لوگ اور ان کے
ساتھ ساتھ جملہ حیوان گرمیوں کی نسبت سردیوں میں نیند کے زیادہ خواہاں ہوتے ہیں لیکن شہری تمدن اس قدر
پیچیدہ اور خلاف فطرت اور اتفاقات و تغیرات کا اس قدر تابع ہے کہ انسان کو کسی روزمرہ کی ایسی عادات کا
خوگر ہو جانا کہ اس کے بغیر کوئی کام ہی نہ چل سکے، عقلمندی نہیں ہے، قواعد اور اصولوں کی پابندی
بلاشک انسان پر لازم ہے، لیکن اہم ترین اصول یہ ہے کہ بوقت ضرورت قاعدہ توڑنے کے عادی ہو
لہذا آپ کہیں ایسا نہ کر بیٹھیں کہ اپنے شاگردوں کو پوری نیند سلا سلا کر آرام طلب اور نازک مزاج بنا دیں

ابتدا میں بغیر روک ٹوک آپ اس کو قدرتی قوانین پر عمل کرنے دیں لیکن یہ فراموش نہ فرمائیے کہ ہمارے حالات کے لحاظ سے اس کا طریقہ سب سے زیادہ ہو کہ اس کو ابتدا ہی سے شتاب پڑے گا اس کو جلدی سونے سویرے اٹھنے یکایک جاگ پڑتے وہ بلا ضرورت رات بھر جاگ کر گذار دینے کا عادی بنائیے۔ یہ کام ابتدا سن میں ہی جلدی شروع کر دیجئے، اور آہستہ آہستہ موقع سے ایک ایک قدم بڑھائیے تو ساخت جسمانی انہی حالات کی مطابقت کرنے لگے گی جو اگر سن رسیدہ آدمی پر یہ عمل لائے جائیں تو اس کو فنا اور برباد ہی کر دیں۔

اس کے بعد اس کو سخت اور تکلیف دہ بچھونوں میں سونے کی عادت ڈالنی چاہیئے تا کہ ہر قسم کا بچھونا اس کے لئے آرام دہ ہو جائے یا بالفاظ عام یہ یاد رکھئے کہ جب تکلیف اور مصیبت کے ہم ایک مرتبہ خوگر ہو جاتے ہیں تو ہمارے پُر لطف تسکین بخش تجربات میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ کہ پُر عیش زندگی لا تعداد مصائب اور آلام کی رہنمائی کرتی ہے۔ جو لوگ ناز و نعم کے پلے ہوتے ہیں ان کو نرم نرم ریشمین یا پَروں کے گلدے ہی پر نیند آسکتی ہے، اور جو کھری زمین اور تختوں پر سونے کے عادی ہوتے ہیں، ان کو ہر جگہ نیند آجاتی ہے۔ بس جس کو فوراً نیند آ جائے اس کے لئے سخت بچھونا وغیرہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

نرم اور ملائم بچھونے کے مضر اثرات

جب کوئی نرم نرم گدوں والے بچھونوں میں استراحت کرتا ہے تو یقول شخصے اس کا جسم نرم اور ملائم بستر کے اندر ڈھیلا پڑ کر گھلنے لگتا ہے، دل گردے اور اندرونی حصص اگر زیادہ گرمائی میں محسوس رہتے ہیں تو ان پر ورم آجاتا ہے، پتھری اور اس قسم کی دوسری اشد بیماریاں اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں، اور اس سے ساخت جسمانی بھی لازماً نازک ہو جاتی ہے جس سے تمام جہان کی بیماریوں اور درد دکھ کی تخم ریزی ہوتی ہے۔

جس بچھونے میں ہم کو خوب سنانے کی نیند آئے وہی بہترین بچھونا ہوتا ہے، اسمٰعیل اور ایڈ دونوں مل کر اپنے اپنے لئے دن کے وقت اسی قسم کا بچھونا تیار کریں گے، ہمارا بچھونا بچھانے کے لئے ہم کو کسی ایرانی غلام کی ضرورت نہ ہو گی۔ کیوں کہ جب ہم مٹی کھودتے ہیں تو گویا ہم اپنے لئے گدے تیار کر لیتے ہیں، یہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ تندرست بچے کو جب چاہے سلایا اور جگایا جا سکتا ہے

اس کی انّا اس کی باتوں سے تنگ ہو کر اسے کچھ نے پر لٹا کر جب کہہ دیتی ہے "بس اب سو جاؤ" تو اس کی گویا ایسی ہی مثال ہوتی ہے کہ اگر وہ بیمار ہو تو اس سے کہہ دیا جائے - "اچھے ہو جاؤ" جناب عالی صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو خود بخود تھک جانے دیجئے اور اس سے اتنی باتیں کیجئے کہ وہ اپنی زبان بند کرنے کے لئے مجبور ہو کر فوراً خود بخود سو جائے، بندو نصائح کا کم از کم ایک فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، اس لئے جھولا جھلانے کے ساتھ ساتھ آپ اس کو وعظ بھی سنا سکتے ہیں لیکن اگر یہ خواب آور نسخہ آپ رات میں استعمال کرائیں تو للّٰہ دن کو رحم فرمائیے۔ اس وقت اس کو استعمال نہ فرمائیے گا۔

بسا اوقات میں رات کے وقت اسمٰعیل کو جگا دیا کروں گا، اس غرض کے لئے نہیں کہ وہ زیادہ سویا نہ کرے بلکہ محض اس لئے کہ ہر بات حتیٰ کہ اچانک جاگ اٹھنے کا بھی وہ عادی ہو جائے علاوہ ازیں اگر میں اس کو خود بخود جاگ جانے کا ایسا عادی نہ بنا سکوں کہ وہ بغیر جگائے خود بخود اپنی مرضی سے اٹھ جایا کرے تو میں اپنے اس بیٹے کے لئے نااہل ثابت ہوں گا۔

اگر وہ بہت سویرے اٹھ بیٹھے گا تو میں اس کے لئے صبح کرنا کٹھن اور شاق محسوس کراؤں گا تاکہ جتنا وقت بھی وہ نیند میں گذار سکے اس کو غنیمت خیال کرے، اگر وہ دیر میں سوئے گا تو صبح اٹھنے پر میں اس کو کوئی مرغوب ترین کھلونا دکھاؤں گا، جب میں اس کو کسی معینہ وقت پر بیدار کرنا چاہوں گا تو میں اس سے کہوں گا، "صبح چھ بجے میں مچھلی کے شکار میں جا رہا ہوں، یا فلاں فلاں مقام پر جا رہا ہوں کیا تم بھی چلنا چاہتے ہو؟" وہ چلنے کو تیار ہو جائے گا اور مجھ سے استدعا کرے گا کہ اس کو وقت پر جگا دوں، میں موقع کے لحاظ سے کبھی وعدہ کروں گا کبھی نہیں کروں گا، پس اگر وہ دیر میں اٹھے گا تو مجھے نہیں پائے گا پس اب بھی اگر وہ از خود اٹھنا نہ سیکھے تو ضرور اس میں کچھ نہ کچھ خرابی ہوگی۔

عیش پرستی اور کاہلی سے محفوظ کرنا اور دکھ درد کا عادی بنانا

برایں ہمہ اگر شاذ و نادر کہیں ایسا اتفاق ہو جائے کہ آرام طلب اور عیش پرست بچہ سست ہی

ہتا ہے تو اس کے اس رجحان کو جڑ پکڑنے کا آپ موقع نہ دیں کیوں کہ یہ اس کو ہمیں بنا دے گا بلکہ
ں میں حدت پیدا کرنے والی اشیا استعمال کرا کے نلیدا حیات کر دیجیے اور اس امر کو ذہن نشین رکھیے کہ جبر و تشدد
مال کرنے کا یہاں کوئی کام نہیں ہے، بلکہ بچے میں ایسی اشتہا پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو عملی زندگی
رف اس کی رہنمائی کر سکے اور یہ اشتہا یا خواہش اگر قدرت کے مفید اور مقررہ طریقوں کے ذریعے
کی جائے تو چپڑی اور دو دو کا مقولہ صادق آ جائے گا۔

اگر ذرا بھی ہوشیاری اور سلیقے سے کام لیا جائے تو میں نہیں خیال کر سکتا کہ بچے میں فخر اور ترنگ
کئے بغیر کسی قسم کا ذوق و شوق پیدا نہ کیا جا سکتا ہو۔ بچے کی سرگرمی اور نقالی کی فطرت از خود اس کام
لئے کافی ہوتی ہے اور اس کی زندہ دلی سونے پر ایسے سہاگے کا کام دیتی ہے، جس سے کسی
د نے آج تک فائدہ اٹھانے کی سعی نہیں کی ہے۔ ہر اس کھیل میں جسے بچہ فی الواقع کھیل ہی تصور
تا ہے بے چون و چرا ہنستے کھیلتے ایسے بڑے بڑے مصائب جھیل جاتا ہے جو دوسرے موقعوں پر
دوں کی ندیاں بہانے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ ان کم سن جنگلیوں کے کھیل کود میں دیر دیر تک بھوکا
سا رہنا، مار پیٹ کرنا، آگ میں جلنا اور انواع اقسام کی تکان اور ماندگی برداشت کرنا شامل ہے پس
ں سے پتہ چلتا ہے کہ دکھ درد کے اندر بھی ایک ایسا لطف اور دلآویزی ہوتی ہے جو اس کی تکلیف
بو کر دیتی ہے، بہر حال ہر استاد اس کی لذتوں سے آشنا نہیں ہوتا ہے اور نہ ہر طالب علم منہ بنائے بغیر
ں کا ذائقہ چکھ سکتا ہے، لہذا مجھے خود بھی ذرا احتیاط ہی سے کام لینا چاہیے کہ کہیں پھر میں مستثنیات
ں الجھ نہ جاؤں۔

آدمی کو دکھ درد، بیماری، حادثات، مہمات یا خود موت کی غلامی ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے۔
ں جوں وہ ان کے تخیلات سے زیادہ آشنا ہوگا، اتنے ہی جلد وہ ان کے ان احساسات مزید سے
ٹکارا پا جائے گا، جو قوت برداشت کی ناصبری کے باعث دردوں کی تکلیف میں اضافہ کر دیتے ہیں
دی پیش شدہ تکالیف کو برداشت کرنے کا جس قدر جلد عادی ہو جائے گا۔ بقول مانٹین (MANTAIGN؟)
، اتنے ہی جلد ان تکالیف اور دردوں کے ڈنک کو نیش زنی سے محروم کر دے گا، اور اس طرز عمل سے

اور اپنی روح کو مضبوط اور صحت مند بنا لے، اور اس طرح خود موت کی آمد بھی جو فی الواقع موت نہیں ہوتی ہے محسوس نہ ہو سکے گی، وہ مرنے کا نہیں بلکہ بقول شخصے زندہ رہے گا یا مردہ اور بس اس کے سوا اور وہ کچھ نہ ہوگا اور جیسا کہ مانٹیگن نے مراقش کے بادشاہ کے متعلق بیان کیا ہے، اس بچے کے متعلق بھی ایسا ہی کہا جا سکتا ہے کسی نے آج تک اپنی زندگی کو اتنی طوالت نہ دی کہ وہ موت کی حد تک پہونچ گئی ہو

ایک بچہ بہادری، قناعت، برداشت اور دیگر نیکیوں کا امیدوار ہوتا ہے، لیکن آپ ان نیکیوں کو بچوں کو نہیں سکھا سکتے ہیں بلکہ انہیں تجربات کے ذریعہ بالکل نادانستہ طریقے پر سکھانا ہوگا، لیکن موت کے تذکرے کے ساتھ مجھے اپنے اسمٰعیل اور سیتلا ماتا کے متعلق کیا تدبیر اختیار کرنی چاہئیں؛ کم سنی ہی میں اسے ٹیکہ دلا دینا چاہئے یا سیتلا کے قدرتاً نکلنے تک انتظار کرنا چاہئے؟ ہمارے ممالک اول الذکر صورت زیادہ مطابقت رکھتی ہے اس لئے کہ اس سے اسمٰعیل کی اس وقت کی زندگی جبکہ قلیل القیمت ہوتی ہے ذرا سی جوکھم میں اس وقت کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے جبکہ وہ بیش بہا ہو جائے گی، بشرطیکہ صحیح اور درست ٹیکہ اندازی کے لئے ہم لفظ جوکھم استعمال بھی کر سکیں۔

لیکن آخر الذکر صورت میرے عام اصول سے زیادہ مطابقت کھاتی ہے، یعنی اسمٰعیل کو قدرت کے سپرد کر دیا جائے اور قدرت خود ہی وہ تدابیر اختیار کرے جس سے وہ انسان کے دخل دیتے ہی دست بردار ہو جاتی ہے، قدرت کا پروردہ آدمی ہمیشہ چست اور ہر کام کے لئے تیار رہتا ہے، لہذا قدرت کو اپنا ٹیکہ خود ہی لگانے دیجئے۔ اس لئے کہ وقت اور موسم کا وہ خود ہی لحاظ رکھتی ہے۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

لب و لہجہ

تعلیم و تدریس میں لب و لہجے اور صحیح اندازِ گفتگو کا کیا مقام ہے، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق اخباروں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور پلیٹ فارموں سے طرح طرح کی تقریریں ہو چکی ہیں، ایک قومی اخبار کے سلسلۂ مکتوبات میں اس موضوع پر بعض بڑے دلچسپ نکات جمع ہو گئے ہیں، ان تحریروں میں قومی جذبہ حب الوطنی کا شدید احساس موجود ہے بعض ایسے سوالات بھی پوچھے گئے ہیں جن کا کوئی موزوں معقول اور مناسب جواب نہیں، آخر دو زبان بولنے سے کیا مراد ہے؟ "معیاری انگریزی" کسے کہتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ ایسے مباحث میں گرما گرمی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، کسی صحیح نتیجے کی توقع کم ہوتی ہے لیکن اگر موضوع بحث صرف اسکولوں میں اس کے صحیح عمل تک ہی محدود رکھا جائے تو اس سلسلے میں پہلی بہت کچھ رہنمائی کی توقع رکھنی چاہیے، اور یہی دراصل اس گفتگو کا نقطۂ آغاز تھا، ان تحریروں میں بعض ایسے نکات بھی ہیں جنہیں حکمانہ پالیسی کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے

جہاں تک لب و لہجے کا تعلق ہے مشاورتی کونسل نے پرائمری اسکول کی رپورٹ میں اسے بالکل واضح کر دیا ہے کہ جس لہجے کو اسکاٹ لینڈ کے عوام نے اپنایا وہ دیہاتی اور دہقانی انداز گفتگو تھا، اور یہی انداز آگے چل کر اظہارِ خیال کا ذریعہ بن گیا۔ اس کی مثال برن (BURN) کی مقامی نظموں سے دی جا سکتی ہے اور کچھ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ یہی لہجہ ملک کی روزمرہ گفتگو میں عام ہو گیا، ایڈنبرا شائر اور اس کے نواحی علاقوں کے باشندے اسی لہجے میں بات چیت کرتے ہیں، اس کے علاوہ بعض دوسرے صنعتی شہروں میں بھی یہی اندازِ گفتگو رائج ہے لیکن کسی علاقے کی تعلیم یافتہ آبادی کا یہ لب و لہجہ نہیں ہے، چنانچہ اس لب و لہجہ کو ذریعۂ تعلیم اور ثقافتی توسیع کا وسیلہ بنانا درست نہیں ہے، دوسرے مقامات پر خارجی اثرات کی وجہ سے اس میں

اسقام پیدا ہو گئے ہیں، زبان گھٹیا، انداز سوقیانہ، غیر مربوط، بے ترتیب اور بے ڈھنگا سا، اس پر مستزاد امریکی ہالی وڈ کے روزمرہ اور اس کے طریق گفتگو کی بے جا نقل نے زبان کی رہی سہی مٹی پلید کر دی ہے، رپورٹ نے اسکولوں سے سفارش کی ہے کہ وہ اس مبتذل زبان کے خلاف احتجاج کریں اور منظم طریقے سے اس کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اس لئے کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدرسوں کا یہ فرض ہے کہ بچوں کو معیاری انگریزی بولنا سکھائیں، تاکہ انہیں اس پر قدرت حاصل ہو سکے، رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عوامی بولی سے مدرسوں کو کوئی سروکار نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کی تحقیر نہ کریں، اور اس بولی کے ناگوار اور مضر اثرات اور غلط طریق گفتگو کی عادت ڈالنے سے بچنے کے لئے اسکولوں کو اس کے خلاف فوری اور معاندانہ مہم جاری کرنی چاہیئے، اسکاٹ لینڈ کے محکمہ تعلیم کے رسالے "اسکاٹ لینڈ میں ابتدائی مدارس" میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بچوں کو انگریزی زبان بولنے اور اس کے استعمال کرنے کی تربیت دینی چاہیئے جسے وہ آسانی اور احتیاط سے اپنے مصرف میں لا سکیں، اس رسالے میں اساتذہ کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ بعض اضلاع میں بچوں کی توجہ کسی عمدہ اسکاٹش مفرد یا مرکب لفظ یا ترکیبوں کی طرف بھی دلائی جا سکتی ہے، جسے وہ خود جانتے ہوں اور جو عام بول چال میں مستعمل ہوں، اساتذہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بچوں میں ایسی فہم و بصیرت پیدا کر دیں کہ وہ اچھے اور برے اسکاٹش الفاظ میں تمیز کر سکیں معیاری انگریزی زبان کو رواج دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مدرسوں میں اسکاٹش لہجے کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

ان بیانات اور تشریحات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تدریس میں کن کن مقامات پر زور دینا چاہیئے صحیح انداز گفتگو اور صحیح تلفظ کے لئے بڑی کاوش کی ضرورت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رابرٹ بریجز (RABERT BRIAGES) جیسی مستند شخصیت کا بھی یہی ایمان ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان، ان کا لہجہ ان کا انداز گفتگو جنوبی انگریزی سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔

اگر ہمارے مدرسوں میں بھی مدرسین ہمت و جرات سے کام لیں اور بچوں کو صحیح اردو اور روزمرہ

سکھانے کی کوشش کریں، اور جا بجا صاف ستھرے مقامی محاوروں کی بھی آمیزش کرتے رہیں تو اس سے
زبان و ادب کی بھی خدمت ہوتی رہے گی اور ہمارا طرزِ تکلم بھی صاف ستھرا اور ٹکسالی ہو جائے گا۔

عمارتی منصوبے

آج کل مدرسوں میں عمارتوں کی تعمیر کی رفتار بہت سست ہے، اس کی ایک وجہ تو عمارتی سامان کی
کم یابی ہے لیکن بڑھتی ہوئی قیمتیں اور ماہرین کی کمی کا بھی اس سے براہِ راست تعلق ہے، اگر مدرسوں کی
عمارتوں کو وقتی ضروریات کو پورا کرنا ہے تو ان عمارتوں کی تعمیر کی رفتار کو تیز تر کرنا ہوگا، اور عمارتی
ساز و سامان کی قیمتوں کو بھی گرانا ہوگا، اس کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ زمین کے ایک ایک انچ سے اور
سامان کے ایک ایک جزو سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ انگلستان کی وزارت معارف کے تعمیراتی اعلان
میں ان مسائل کی پوری تفصیلات درج ہیں، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وزارت معارف کے شعبۂ
تعمیرات نے ان مسائل کے حل کرنے کے لئے کیا کچھ اقدام کیا ہے لیکن صرف کاغذی کارروائیوں سے ان
مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ مدرسہ کی عمارتوں میں نئے طریقے اور نئے
نمونے استعمال کئے جائیں، وزارت معارف کے مہندسوں نے ہرک شائر کاؤنٹی کونسل کے جدید منصوبوں
سے اتفاق کرتے ہوئے دو کنگھم شائر میں ۔۔۶ نئے مدارس تعمیر کئے۔ ان عمارتوں کے بعض حصے چہار منزلہ
ہیں، ان کے منصوبے اور نقشے سنہ ۱۹۵۰ء میں مرتب کئے گئے تھے، اور اب یہ عمارتیں تقریباً مکمل ہو چکی
ہیں، اس اعلان میں مقامی تعلیمی حکومتوں کے لئے تکنیکی معلومات کے متعلق کافی قیمتی مواد موجود ہے تعلیمی
اور فنی نقطۂ نگاہ سے یہ منصوبے نہایت عمدگی سے تیار کئے گئے ہیں، اس دور میں اگر ایک عمارت جو ہر
اعتبار سے موزوں ہو صرف ۔۲ ہ پونڈ میں تیار ہو جائے تو اسے ایک کارنامہ کہنا چاہیئے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

شعبہ ـــــ اسکول

ای/ ۸ ۶ ۷ ۵ م محمد حفیظ اللہ ایک امیدوار معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال (بمشاہرہ ۲۵۰ ـــ ۱۰ ـــ ۲۰۰ ـــ ۱۰ ـــ ۱۳۰) م جمال الدین کی جگہ مقرر ہوئے۔
تاریخ حاضری سے

محمد جمیل بی ایس سی بی ٹی ـ م منظور حسین بھٹی بی ایس سی بی ٹی کی جگہ سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور (شیخوپورہ) مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

م محمد شفیع معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں م محمد صادق ایم اے بی ٹی کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

م آئی ـ سی ـ مل ایک عیسائی امیدوار م محمد شفیع کی جگہ سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں (گجرات) مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)

م عبدالکریم قریشی بی اے بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر (میانوالی) ایس ذوالفقار علی بی اے بی ٹی کی جگہ بحیثیت معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مظ... تبدیل ہوئے۔

ملک عبدالحلیم ایف ـ ایس ـ سی، ٹی ایک امیدوار م عبدالکریم قریشی کی جگہ عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر مقرر ہوئے۔ بمشاہرہ ۸۰ روپے کل تاریخ حاضری

ای/ ۱۲/ ۲ ۷ م نذر محمد اے ڈی آئی ایس ملتان چودھری غلام رسول کی جگہ اے ڈی آئی ایس منٹگمری مقرر ہوئے (بمشاہرہ خود) تاریخ حاضری سے

م محمد اقبال بی اے بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کوٹ ادّو (مظفر گڑھ)
م نذر محمد کی جگہ اے ڈی آئی ایس ملتان مقرر ہوئے۔
م سعادت مند قریشی اے ڈی آئی ایس برائے تربیت جسمانی جھنگ م فتح محمد کی جگہ
اے ڈی آئی ایس منٹگمری مقرر ہوئے تاریخ حاضری سے۔
م سردار مسیح معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری شیخ صدر علی رحمن کا انتقال
ہوگیا ہے) کی جگہ اے ڈی۔ آئی۔ ایس منٹگمری مقرر ہوئے۔
ایس محمد نقی شاہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ چودھری محمد اقبال کی جگہ
اے۔ڈی۔آئی۔ایس لائل پور مقرر ہوئے بشاہرہ خود۔ (تاریخ حاضری سے)
م رحمت علی حلیم معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپتن ایس شمشیر علی شاہ کی جگہ اے ڈی
آئی ایس لائل پور مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)
م عبدالرزاق معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ م رب نواز کی جگہ اے ڈی آئی
ایس۔ ملتان مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)
م تاج محمد معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد (منٹگمری) دوست محمد خاں کی
جگہ اے ڈی آئی ایس ڈیرہ غازی خاں مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے)
شیخ منیر الدین معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مفتی محمد اقبال کی جگہ اے ڈی
آئی۔ایس شاہ پور مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے
م نیاز احمد خلیل معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مری (عارضی) ملک محمد صادق کی جگہ
قائم مقام اے ڈی۔آئی ایس راولپنڈی مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے
ای/۲۷۹۰ م تہذیب الحسن ایک امیدوار ایک خالی آسامی پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ
(راولپنڈی) مقرر ہوئے تاریخ حاضری سے۔
ای/۶۳۷۵ م محمد اعجاز اکبر ایک امیدوار ایک خالی آسامی پر معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ

(شاہ پور) مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے

ای/۵۹۷۹ م تعلیق احمد صدیقی ایک امیدوار م علی اختر زیدی کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کہوٹہ (راولپنڈی) مقرر ہوئے تاریخ حاضری سے

م نبی حسن خیال ایک امیدوار ایس غلام الثقلین ایم اے بی ٹی کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ (راولپنڈی) مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے

م عبدالحمید ایک امیدوار م امیر بخش خان کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے

ایس اختر حسین کاظمی م محمد خان کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے۔

م محمد سلیم ایک امیدوار م مشتاق احمد چوہان کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں (جہلم) مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے۔

م بشیر احمد بھٹی ایک امیدوار م عبدالنعیم قریشی کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں مقرر ہوئے تاریخ حاضری سے

م محمد شریف ایک امیدوار میر غلام سرور کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں مقرر ہوئے۔

شعبہ ــــــ کالج

زیڈ/۵۵۶۶ ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں ایم اے پی ایم ڈی (کینٹب) ڈپٹی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب۔ م یوکرامت صاحب کی جگہ پی ای ایس (اول) سلیکشن گریڈ ۱۵۰۰ -- ۵۰ -- ۱۲۵۰ عارضی سے مستقل پی ای ایس اول سلیکشن گریڈ ۱۵۰۰ -- ۵۰ -- ۱۲۵۰ میں مستقل ہوئے۔

ای/۶۵۶۸ م محمد حسین ایم ایس سی قائم مقام لیکچرار گورنمنٹ کالج جھنگ مقرر ہوئے۔

م محمد حسین ایم ایس سی قائم مقام لیکچرر طبیعیات گورنمنٹ کالج جھنگ ایک خالی آسامی پر قائم مقام [illegible]

Regd. No. L.5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاہئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل

آموزش

۲ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

ماره ۱] لاهور [اپریل ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

: بشیر ہاشمی معاون : عبدالغفور چودھری

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اپریل سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ۶

شمارہ ۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

اعتذار

ہمیں افسوس ہے کہ آموزش کا یہ شمارہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے بروقت شائع نہ ہو سکا۔ بازار میں کاغذ نابود تھا۔ اس لئے حکومت سے کاغذ کے حصول کی خاطر لائسنس کے لئے درخواست کی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ لائسنس مل گیا ہے اور اب انشاءاللہ اگلے شمارے وقت پر شائع ہوا کریں گے۔

ادارہ

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ذہنی حلقہ بندی

۲۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر بشیر احمد صاحب وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی نے راول پنڈی میں اے۔ پی۔ پی کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا "پنجاب میں تین نئی یونی ورسٹیوں کے قیام کے متعلق صوبے کے ارباب حل و عقد کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے، یہ تعلیم گاہیں بنیادی طور پر علم و فن کے کسی خاص شعبے یا چند مخصوص شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کا اہتمام کریں گی اور طلبہ کے لئے تحقیق کا سامان بہم پہونچائیں گی، ان میں سے ایک یونی ورسٹی سہالہ (ضلع راول پنڈی) میں تعمیر کی جائے گی، جہاں صرف سائنس اور طبعی علوم کی تعلیم و تدریس پر زور دیا جائے گا۔ دوسری یونی ورسٹی لائل پور میں قائم کی جائے گی، جہاں علم زراعت کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہوگا، تیسری یونی ورسٹی ملتان میں قائم ہوگی جو علم طب کی تحصیل اور اس کے مختلف شعبوں کی توسیع کے لئے مخصوص ہوگی، اور موجودہ پنجاب یونی ورسٹی علم و ادب اور سماجی علوم کا گہوارہ ہوگی"۔ وائس چانسلر صاحب کا خیال ہے کہ قلت زر اور قوم کی اقتصادی پستی ہماری رفتار ترقی میں مانع نہ آئیں گی، لیکن اتنی بڑی اسکیم کی تکمیل کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے، اور ان تعلیم گاہوں کو جدید ساز و سامان سے آراستہ کرنے میں کم سے کم چار پانچ سال لگ جائیں گے"

نئی تعلیم گاہوں اور تحقیقی اداروں کا قیام برحق لیکن انھیں علم و فن کے چند شعبوں کے لئے مخصوص کر دینا مستحسن نہیں۔ یک سفی طرق تعلیم و تدریس کچھ اتنا مفید ثابت نہیں ہوا، کسی خاص علم میں مہارت پیدا کرنے کے لئے فکر و تدبر اور احتیاط کی ضرورت ہے، اگر اس مہارت کی تحصیل میں عقل و فہم کا سودا کرنا پڑے تو اس میں ہمیں بہت بڑا خسارہ ہوگا، انسانی علوم کے مختلف شعبوں میں مہارت پیدا کرنے اور انھیں

ہم آہنگ اور مربوط رکھنے کے لئے بنیادی اشتراک و تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی خاص موضوع پر تحقیق کرنے والے یا کسی خاص مضمون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کے لئے طبعی اور سماجی علوم کو یک جا کرنا ممکن نہیں لیکن مختلف کلیوں اور شعبوں کے طلبا کے لئے دوسرے علوم و فنون کے متعلق کچھ نہ کچھ جاننا نہایت ضروری ہے، ورنہ ان کی دنیا محدود ہو جائے گی اور وہ اپنی اس تنگنائے سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کریں گے، اس ذہنی حلقہ بندی اور تنگ نظری سے نجات پانے کا صرف یہی راستہ ہے کہ طلبہ کو ان کے اپنے شعبوں کے علاوہ دوسروں کی معلومات سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور جب تک یہ محدود نظریات ختم نہیں ہوں گے سائنس اور دوسرے علوم کی رسّا کشی جاری رہے گی۔ اور یہ نظریہ کہ سائنس اخلاق سے بے تعلق اور انسانی اقدارِ حیات سے ناآشنا ہے، علمی حلقوں میں بدستور قائم رہے گا۔

انگلستان کے ایک شہر کیٹل (اسٹیفورڈ شائر) میں پچھلے چند سال سے اس قسم کا ایک تجربہ کیا جا رہا ہے، یہاں جو یونیورسٹی کالج قائم کیا گیا ہے۔ وہ آگے چل کر بجائے خود ایک یونیورسٹی بن جائے گا۔ اس کے بی۔ اے، اور بی۔ ایس سی۔ کے لئے جو نصاب تعلیم مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے سال میں چند ایسے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن کا براہِ راست علم کی اس شاخ سے کوئی تعلق نہیں جس میں متعلم منتہی ہونا چاہتا ہے، لیکن اس کی ذاتی، معاشری اور قومی زندگی سے اس کا گہرا تعلق ضرور ہے تعلیم کی غرض و غائت یک فنی نظریئے سے انحراف اور انسان کے ذہنی افق کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا ہے اور فی الواقع انسانی تہذیب و ثقافت کی بقا کے لئے ہمیں آج سب سے زیادہ اسی انضباط اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے، اگر ہم انسانی علوم کی حد بندیوں ہی متعین کرتے رہے، اور ہر شخص اپنے حلقۂ فکر کو محدود کرتا رہا تو اس سے ہماری دشواریاں کم نہیں زیادہ ہوتی رہیں گی۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں میں طلبہ کے لئے علوم و فنون کی تدریس و تحقیق کے مواقع بہم پہونچانے ضروری ہیں، علوم طبعی کے پہلو بہ پہلو سماجی علوم اور زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کا اہتمام طلبہ کی زندگی کو زیادہ مربوط اور ہم آہنگ بنا سکتا ہے جس کا براہِ راست اثر ہماری سماجی، قومی اور بین الاقوامی زندگی پر پڑ سکتا ہے، چناں چہ یک فنی اداروں کا قیام ہماری تعلیمی پستی کا علاج نہیں، ہمیں تو ایسے کثیر الفنون اداروں کی ضرورت ہے، جہاں طلبہ مل جل کر مختلف علوم و فنون کی

بل میں معروف رہیں۔ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں اپنے محسوسات سے دوسروں کو
کریں۔ علم کی ہر شاخ اور ہر شعبے کا جائزہ لیں اور پھر اپنے اپنے رجحانات اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے
ابق اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی خاص مضمون کو منتخب کرلیں۔

دو اکادمی

حکومتِ پاکستان نے اردو کی توسیع و ترقی اور اس کی ترویج کے لئے اردو اکادمی کے قیام کا فیصلہ
یا ہے، حکومت کا یہ اقدام نہایت مبارک اور ہماری قومی زندگی کے لئے فالِ نیک ہے، پاکستان
اردو کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسے ہماری سماجی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ایک اہم حصّہ
ا ہے، اس اکادمی کے چلانے کے لئے ملک کے معروف اور ممتاز ادیبوں کی ایک کمیٹی منتخب کی جائے گی
ردو کی توسیع کے لئے مختلف طریقے استعمال کرے گی۔ اُردو رسم الخط کے متعلق اب تک انفرادی طور پر
۔ نہیں بیسیوں تجویزیں پیش ہو چکی ہیں بعض اہل فکر لاطینی رسم الخط کے حق میں ہیں، اور بعض موجودہ
م الخط میں تھوڑی بہت ترمیم کے خواہاں ہیں، اور بعض حضرات چھاپے کے لئے خط نسخ کے استعمال کو اُردو کی
تی کا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن اب تک یہ مسئلہ کسی فیصلہ کن مرحلے تک نہ پہونچ سکا۔ اس اکادمی کے
ام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو رسم الخط میں مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد اسے مختلف آوازوں اور
ملف لہجوں کے ادا کرنے کا اہل بنایا جا سکے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان بننے کی حق دار اور اہل ہے لیکن اس کے باوجود
ب تک اس زبان میں مستند کتب حوالہ مرتب نہیں ہو سکیں، اس سلسلے میں جو بھی یا نیم سرکاری کوششیں
ہوئیں وہ خود کسی نتیجے پر نہیں پہونچ سکیں۔ اس وقت اردو میں سند اور حوالے کے لئے کتابوں کی ترتیب و تدوین
.... نہایت اہم ہے، اس اکادمی کے قیام کا دوسرا مقصد کتب حوالہ اور کتبِ اسناد کا ایک سلسلہ جاری کرنا
ہے جس سے زبان معیاری بن سکے۔

کچھ دنوں پہلے پاکستان تعلیمی مشاورتی بورڈ نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی سرکردگی میں ایک

مشتمل ایک اردو کمیٹی مقرر کی تھی، اس کمیٹی کا احاطہ کار اس اکادمی کے قیام کے امکانات کا جائزہ لینا تھا
چناں چہ کمیٹی نے جو سفارشات پیش کیں تعلیمی مشاورتی بورڈ نے انھیں منظور کر لیا، اس اکادمی کے انصرام
اور اس کے جملہ کاروبار کو چلانے کے لئے زبان وادب کے چالیس مستند عالموں اور ماہرین تعلیم پر مشتمل
ایک مجلسِ انتظامیہ کا قیام عمل میں آئے گا جو اس ادارے کے نظم ونسق کی ذمہ دار ہو گی، پاکستان کے
وزیر معارف اس مجلس کے صدر ہوں گے، اس کے علاوہ حکومت ایک نائب صدر اور ایک سیکریٹری بھی
مقرر کرے گی۔

ہمیں امید ہے کہ اردو اکادمی کا قیام اردو زبان وادب کی ترقی وتوسیع اور ترویج کے سلسلے میں
ایک ایسا مضبوط اقدام ہے کہ اگر عزم وہمت سے کام لیا گیا تو اردو بہت جلد دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں
شمار ہونے لگے گی +

لامی نظریۂ حیات

(ایک تبصرہ)

فیسر بشیر ہاشمی

سنہ ۱۹۴۷ء ہمارے لئے اور ہمارے ہندوستانی بھائیوں کے لئے سانحہ خیز ثابت ہوا۔ انقلاب
ا ہونے سے پہلے ہی ہمیں ایسے حادثات سے دوچار ہونا پڑا جنھوں نے انسانی قدروں کو
ں ثابت کردیا، پوری فضا خوف و ہراس سے معمور تھی۔ زندگی ارزاں اور بے وقیع۔ دیانتداری
ایمانداری مہمل اور بے معنی اور پاکیزگی جسد بے روح، جس کا اخلاقی پہلو مدت ہوئی نذر تغافل ہو چکا
حالات میں پاکستان قائم ہوا، ہم ایک آزاد قوم کہلائے، اور جمہوریت ہمارا سیاسی مسلک قرار پایا،
یوں تو جمہوری اصولوں پر نظم و نسق کا انصرام اتنا مشکل، صبر آزما اور ہمت شکن نہیں ہوتا
ن صحیح جمہوری نظام کا قیام ہنگامی نہیں ارتقائی ہوتا ہے، خواہ یہ کسی سماجی انقلاب کا ہی نتیجہ
ں نہ ہو۔ لوگوں کی زندگی میں اس کا اثر رفتہ رفتہ ہوتا ہے، کسی قوم کی اخلاقی تعمیر کے لئے ایک دو
ں نہیں طویل مدت درکار ہوتی ہے اور یہ مدت انتظامی اداروں کے قیام سے کہیں زیادہ طویل
تی ہے، عبوری دور میں لوگ محض ایمان دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر انھیں ایمان داری سے
ئی سروکار نہیں ہوتا، زبان پر ملک و ملت کی خدمت کے بلند بانگ دعوے ہوتے ہیں، لیکن ان کے
ش نظر ...... ان کا اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے، عبا جمہوری ہوتی ہے لیکن اس کے اندر چھپا ہوا
ل ذاتی منفعت کا طالب، ہمت و مردانگی جرأت و بے باکی اور ذاتی قربانی کا بہانہ ہوتا ہے، مگر مقصد
روزمرہ فرائض کی انجام دہی سے عموماً احتراز ہوتا ہے، بہر صورت جمہوری تقاضوں اور امتداد زمانہ کے

ساتھ ساتھ جمہوریت کی بنیادی قدریں اپنے اصلی رنگ وروپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور زندگی بے مقصد اور متزلزل حدود کو پار کر کے اپنے لئے سازگار ماحول تلاش کر لیتی ہے، جمہوریت میں ایک فطری لگاؤ اور یہ ہمیشہ مائل بہ ترقی رہتی ہے، اس لئے لوگوں کی زندگی میں اخلاقی، مدنی اور سیاسی انقلاب آتے رہتے ہیں، اور قومی زندگی کے صیغۂ نظم ونسق اور معاملہ میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہوتی رہتی ہے، اسی کو آپ حکومت کہہ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی جمہوریت اپنے لئے نئے آسمان اور نئی زمین تلاش کر سکتی ہے، اور بآسانی آمریت یا ضابطہ پرست حکومت بن سکتی ہے، ایک شخص دوسروں سے اختیارات چھین کر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے سکتا ہے یا عوام کے نمائندے ہی استبدادی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، ان دونوں صورتوں میں عوام کو براہ راست یا بالواسطہ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رہتا، اگرچہ یہ درست ہے کہ اس نظام کار میں اگر جمہوریت کا ہلکا سا پرتو بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو آمریت کے قدم جمنے نہیں پاتے اور ضابطہ پرست حکومت بھی اصلاح حال کے لئے مجبور ہو جاتی ہے، ہمارے سامنے ایسی حکومتوں کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں ہیں، لیکن عوام بالعموم بعض اہم معاملات میں بھی فکر وتدبر سے کام نہیں لیتے، ان کے پیش نظر تو اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات ہوتی ہیں، اور ان کا حلقۂ خیال بھی ان ضروریات سے زیادہ وسیع نہیں ہونے پاتا، اور اگر ان کی یہ ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں اور ان کے جمہوری پندار کو ٹھیس نہیں لگتی تو انھیں ایسا سکون خاطر نصیب ہوتا ہے کہ وہ اسی خود فریبی میں مبتلا ہو کر مفلوج اور معطل ہو جاتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ان پر ایک سیاسی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔

آیئے اب ذرا جمہوریت کے دوسرے رُخ کو دیکھیں، اور دوسری ہم سایہ حکومتوں سے اس کے تعلقات کا جائزہ لیں۔ اس دور میں علیحدگی اور انقطاع ناممکن العمل ہے، دور کیوں جایئے، آج سے کوئی دس سال پہلے کا ہی واقعہ ہے کہ جلیل القدر امریکی قوم دنیا سے الگ تھلگ نہ رہ سکی بلکہ علیحدگی کے تصور کی بھی جرأت نہ کر سکی، اسے اقوام عالم کی زندگی اور ان کے کاروبار میں براہ راست حصہ لینا پڑا، اب اگر

جمہوری حکومت دنیا سے تعلقات منقطع کر کے اپنا مرکزی نظام قائم کرنے کی آرزومند ہے تو یہ خودکشی کے
دف ہے۔
جمہوریت کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیئے اور کن چیزوں سے اسے اپنا دامن بچانا چاہیئے۔ یہ
ل تفصیل طلب ہیں، اور میں خود اس موضوع پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت تو میں جمہوریت کی
یف بیان کرنا بھی غیر ضروری سمجھتا ہوں، یہ ضروری نہیں ہے کہ میری تعریف سیاسیات کے عالموں کے
دیک بھی صحیح اور قابل قبول ہو۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دنیا جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں
لے سے زیادہ ہنگامہ خیز اور سیماب صفت ہے، خواہ کسی ملک کا نظام حکومت جمہوری ہو یا غیر جمہوری
ں دور میں نظریاتی اختلافات واقع ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارے
پاس ایسے وسائل بھی موجود ہیں جن سے یہ اختلافات دور ہو سکتے ہیں، اور تنازعات دبائے جا سکتے ہیں۔
گر میں ان مباحث کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑتا ہوں۔ اس وقت مدرس کی حیثیت سے ہمیں تو
یہ دیکھنا ہے کہ اس سلسلے میں تعلیم کون سا اہم پارٹ ادا کر سکتی ہے۔ آج دنیا کی دوسری قومیں یہ سمجھتی ہیں
کہ اگر ہم سلامتی کی شاہ راہ سے ہٹ کر کوئی راستہ اور اختیار کر لیں تو اس کا انجام صرف تباہی ہو سکتا
ہے، میرے خیال میں تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے جو جمہوری نظام کے چلانے میں مدد و معاون ثابت
ہو سکتا ہے، کام مشکل بھی ہے اور بہت کٹھن بھی، لیکن اس کام کا صبر آزما اور اہم ہونا ہی ایک ایسی
دعوت عمل ہے جس کے قبول کرنے میں سعادت ہی سعادت ہے۔

شاید میری یہ بات پرانی اور فرسودہ سمجھی جائے۔ مگر اس کا دہرانا ضروری ہے، ہمیں اپنے نوجوانوں
کو ایسی تربیت دینی ہے جو انہیں جمہوری طریق زندگی کا عادی بنا دے اور وہ دنیاوی حقائق سے
تغافل کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کر سکیں، ان میں سے کچھ ایسے حقائق ہیں جو ہماری
جغرافیائی حدود سے پار دوسرے ممالک سے بھی متعلق اور وابستہ ہیں، ہمیں بعض ایسی مصنوعات کی
ضرورت ہوتی ہے جو دوسرے ملکوں میں تیار ہوتی ہیں اور ہمارے ملک میں بعض ایسی خام اشیاء
پیدا ہوتی ہیں جن کی برآمد کے لئے ہمیں منڈیاں درکار ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کے

رکن کی حیثیت سے دوسرے ممبر ملکوں کے احساسات کو سمجھنا اور ان کے جذبات کا احترام کرنا بھی ہمارا قومی فرض ہے اور یہی نہیں کہ ہم صرف ان کے جذبات اور محسوسات کا احترام کرنا ہی سیکھیں بلکہ ہمیں ان محسوسات کو اپنی قومی ترقی اور پروگرام سے بھی مربوط کرنا ہوگا، المختصر اس وقت ہمیں ایک نئے نظریئے کی تعبیر و تشکیل کے لئے جد و جہد کرنی ہے، اور اس کے لئے ہمیں اپنے فطری وسائل اور صلاحیتوں کا جائزہ لینا ہوگا اور بین الاقوامی حقوق و فرائض کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا۔

یہ سب کچھ ہمارے گھروں، مدرسوں اور کالجوں میں ہو سکتا ہے، لیکن تعلیم گاہوں کو اس سلسلے میں سب سے پہلے اقدام کرنا چاہیئے، بین الاقوامی افہام و تفہیم کے مسائل انھیں مدرسوں اور کالجوں میں طے ہوتے ہیں، اگر ایک مرتبہ ان تعلیم گاہوں کو مفید رجحانات کے تابع کر دیا جائے، اور اس خاکے میں معلومانی آب و رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ گھروں میں بھی ان اقدار کو فروغ ملنے کا سامان مہیا ہو جائے گا، اس سے میری مراد درست اور صحیح بین الاقوامی نظریے کی تعبیر و تشکیل میں گھر کے اثرات کو کم یا زائل کرنا نہیں ہے، میں تو صرف اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ مدرسہ معاشرے کا منظم ادارہ ہے، معاشری زندگی کی تعمیر و ترقی میں قیادت کا علم اسی کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔

اب تک ہمارے مدرسوں اور کالجوں نے ان مسائل کو سلجھانے کے لئے کوئی قابل قدر کام نہیں کیا، یہ ادارے مختلف ممالک میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے، خالص تعلیمی مذاق پیدا کرنے پر تو کامیاب ہو گئے ہیں، لیکن اس سے آگے کوئی مفید مطلب قدم نہیں اٹھا سکے، ظاہر ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں ایسی سطحی دل چسپی ہمیں بہت دور نہیں لے جا سکتی۔

اگر دنیا کے عام حالات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بین الاقوامی افق پر "جنگ" یا "امن" کے بادل چھائے ہوئے ہیں، ہر ملک میں دفاع اور اسلحہ بندی پر کثیر رقم خرچ کی جا رہی ہے اور ہر حکومت اپنی مادی اور انسانی طاقت کو آنے والی جنگ کی تیاری میں صرف کر رہی ہے لیکن چونکہ تیسری عالمگیر جنگ کے خطرات اور اس کے اثرات سے ہر شخص واقف ہے، اس لئے ہر ملک جنگ سے خائف بھی

ں کے نتائج بہت دوررس اور تباہ کن ہوں گے، اور اس میں فتح و کامرانی تو شاید ہی کسی کو نصیب ہو
بتہ جہاں سوز تباہی و بربادی کا دروازہ ضرور کھل جائے گا، میں مانتا ہوں کہ ہر ملک اپنے سارے فطری
ی اور انسانی وسائل کو جنگ کی تیاری میں صرف کر رہا ہے۔ مگر ہر ملک اور ہر قوم دل ہی دل میں امن و آشتی
کا آرزو مند بھی ہے، یہ اسی کشاکش اور خوف و ہراس کا نتیجہ ہے کہ عالمگیر امن کے ذریعے اس تباہی
بچنے کی کوششیں جاری ہیں۔ بحیثیت پاکستانی اور ادارۂ اقوام متحدہ کے رکن کی حیثیت سے یہ ہمارا فرض ہے
کہ ہم دوسرے ملکوں سے تعاون اور اشتراک عمل کرکے ان تنازعات کا ابدی حل تلاش کریں۔

یا اسے یوں سمجھئے کہ تیسری عالمگیر جنگ ناگزیر معلوم ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ موجودہ
تباہ کن ہتھیاروں سے انسانی اقدار اور تہذیب و ثقافت کو تباہ کیا جا سکتا ہے، آئیے ذرا ہم بھی سوچیں
کیا ہمارے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ ہم تباہی کے اس رخ کو کلیتہً موڑ سکیں یا ادبار و فلاکت کے اس
سیلاب کا سدّباب کر سکیں کیا دنیا کی دوسری قوموں کے باہمی تعلقات اور اشتراک و تعاون کے سلسلے میں
ہم کوئی ایسا اہم کام انجام دے سکتے ہیں جو بین الاقوامی مفاہمت، اتحاد اور اعتماد پیدا کر سکے، یہی جذبۂ
تعاون جنگ کے امکانات کو ختم کر سکتا ہے، اور بالفرض اگر اس احساس کے دبانے میں پوری کامیابی
حاصل نہ ہو تو کم سے کم اسے فی الحال بعید از قیاس تو ضرور سمجھ لیا جائے۔

دنیا اس وقت دو متنازع گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے، اگرچہ جنگ کا بھیانک تصور لوگوں کے ذہنوں پر
چھایا ہوا ہے، لیکن پھر بھی ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں جس کا انجام خوفناک جنگ کے سوا کچھ اور
نہیں ہو سکتا، میں مانتا ہوں کہ یہ اختلاف رائے اور یہ کشمکش محض نظریاتی اختلاف کا نتیجہ ہے اور مجھے
اس امر کا بھی یقین ہے کہ اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے پاکستان کوئی مفید حل پیش کر سکتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں جو جذبہ کارفرما رہا، وہ فی الواقع اسلامی
نظریۂ حیات تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ پاکستان عملاً اس نظریئے کو زندہ حقیقت ثابت کرنے میں کامیاب ہوگا۔
میں اسلامی نظریۂ حیات کو دنیا کے دوسرے نظریات میں سب سے بہتر سمجھتا ہوں، اب تک اسلامی نظریۂ
حیات اور موجودہ نظریات کا کوئی محققانہ خارجی اور داخلی تجزیہ نہیں کیا گیا اور نہ ایک دوسرے کی

روشنی میں ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا، اس لئے میں اپنے بیان کے جواز میں نظم و نثر کے اقتباسات پیش نہیں کر سکوں گا لیکن پھر بھی اپنے فکر و مطالعہ کی روشنی میں، کہہ سکتا ہوں کہ اسلام دنیا کے بیشتر مسائل کا بہترین حل ہے۔

لیکن جب یہ کلمات میری زبان سے ادا ہوتے ہیں تو مجھے اپنے دعوے کے کھوکھلے پن کا احساس ہوتا ہے، میری اس گفتگو کو شاید فخر و مباہات سے تعبیر کیا جائے، میرے سامنے ان ممالک کا معیار زندگی بھی ہے جو اسلامی طریق زندگی اور طریق حکومت کے سب سے بڑے داعی ہیں، ان ممالک میں عوام کا طریق بود و ماند اور ان کا معیار حیات نہایت افسوسناک ہے جہل، تعلیمی پستی، بیماری، افلاس اور تنگ دستی ہی تو ان قوموں کے نصیب میں ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں جس عدل و انصاف، احترام آدمیت، آزادی گفتار اور آزادیٔ عمل کا معیار رسول برحقؐ نے قائم کیا تھا آج اتنا پست ہو چکا ہے کہ ہم خود اپنے معترضین کے آگے خجل اور شرمندہ ہیں، میں نے بارہا سوچا، کیا میں فی الواقع اسلامی نظریۂ حیات کو موجودہ بین الاقوامی بیماریوں کا علاج قرار دے سکتا ہوں، اسلامی مملکتوں میں بسنے والے تو سب سے زیادہ پس ماندہ، فلاکت زدہ اور بے بس ہیں، اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے کہ جب اسے پھیلاؤ اور وسعت کا موقع ملا اور جب اسے پوری معاشری زندگی پر عملاً جاری کیا گیا تو اس سے اخلاقی، سماجی، معاشی، تعلیمی اور ثقافتی انحطاط رونما ہوا، کیا اس نام نہاد کلیے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا؟

اور یہی شبہہ، کا تیسیوں کی طرح، مجھے اس مسئلے کے قریب لایا اور میں نے غور کرنا شروع کیا۔ اس ایک عظیم شبہے سے جو سیکڑوں شکوک پیدا ہوتے ہیں کیا ہمارے پاس فی الحقیقت ان کا کوئی جواب ہے۔

میں دل ہی دل میں اکثر یہ بحث کرتا رہا کہ پاکستان بھی ایک اسلامی مملکت ہے، یہ وہ موعود قطعۂ زمین ہے جس کے متعلق بانیٔ پاکستان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس خطے میں لوگوں کو اسلامی شعائر اور اسلامی نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا، ان کا طریق زندگی اور ان کا دستور اسلامی ہوگا، اسلامی نظریۂ حیات کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے برصغیر کے مسلمانوں کے اس تجربے کی

ناکامیابی کے متعلق جو وساوس پیدا ہوتے ہیں کیا ان کی تردید کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ قومیں جو اپنے نظریاتی اختلاف کی وجہ سے اس وقت عینک کو ناگزیر سمجھتی ہیں، انھیں یہ سمجھایا جا سکے کہ اسلامی نظریۂ حیات کے مطالعے سے وہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں، اور اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھال کر نیا جوش اور ولولہ پیدا کر سکتی ہیں؛ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوالات میں نے خود اپنے آپ سے پوچھے اور اس سلسلے میں مسلسل غور و فکر کرتا رہا۔

پاکستان کے آغاز، اس کی تنظیم اور اس کی ترقی و توسیع کو میں نے ہمیشہ آرزومند اور پرجوش نگاہوں سے ایک مرتبہ نہیں سیکڑوں بار اور سیکڑوں زاویئے سے دیکھا، قیام پاکستان بجائے خود اسلامی نظریۂ حیات کی دلیل اور اس کی قوت کا سب سے بڑا کرشمہ ہے، لیکن مجھے ابھی تک اطمینان خاطر نصیب نہیں ہوا۔ کیا میں خود اپنے شکوک رفع کرنے کا اہل نہیں ہوں، یہ ممکن ہے کہ اسلامی ملکوں کی جملہ سماجی برائیوں کے باوجود اسلامی نظریۂ حیات کے متعلق میرا یا احساس اپنے جواز میں بہت کچھ پیش کر سکے، لیکن روزانہ جو کچھ میں اپنے گرد و پیش دیکھتا ہوں اس سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے، اگرچہ اس سے میرے احساس کو تقویت ضرور پہونچتی ہے۔ مگر یہ احساس بہت جلد شرمندۂ معنی ہوتا نظر نہیں آتا۔

اس سے میری مراد اپنی سماجی زندگی کی برائیاں گنانا یا اپنے سیاسی آزار کا ماتم کرنا نہیں ہے اور نہ ان برائیوں کی طرف رجوع کرنا ہی مقصود ہے جو ہماری قومی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں، اسلامی ملکوں کی نوے فی صدی آبادی عوام پر مشتمل ہے، ان کی افسوسناک حالت، مصنوعی مذہب پرستوں اور نمائشی مردانِ کار کی ریاکاریاں، ارباب اقتدار کی بے حسی ہمارے سامنے ہے، اور ہم سب کو آئے دن انھیں سے سابقہ پڑتا ہے، جو لوگ کچھ کام کرنا چاہتے ہیں وہ ان حالات کی روشنی میں ہی اقدام کر سکتے ہیں، لیکن میں جس چیز کو پورے شد و مد کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں وہ میرا اپنا ذاتی احساس ہے، ہماری پس ماندگی کی ذمہ داری اسلامی نظریۂ حیات پر عائد نہیں ہوتی، اس برائی کا منبع کوئی اور ہی مقام ہے۔

کیا کسی اتنے پیچیدہ مسئلے کا سبب اتنا معمولی ہو سکتا ہے" اور غالباً اس کے اسباب و علل کو اتنا سادہ سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہو گی، اس وقت ان اسباب کی طویل فہرست پیش کرنا بھی غیر ضروری ہو گا اس لئے میں صرف انھیں اسباب و علل کی تفصیلات بیان کروں گا جنھیں میں ان تمام برائیوں اور خرابیوں کی جڑ سمجھتا ہوں۔

ہم میں سے جن اصحاب نے رسول پاک کی سیرت اور کلام الٰہی کی سورتوں کا بتدریج مطالعہ کیا ہے، انھیں معلوم ہے کہ رسول کریم بہت بڑے معلم تھے، آپ نے اپنی قوم کو تعلیم دی، اپنے ملک کے باشندوں کو تعلیم دی اور اس سے آپ کا مقصد اس تعلیم کو پوری انسانیت کے لئے عام اور فراواں کرنا تھا، اللہ تعالےٰ نے پورے پیغام کو رفتہ رفتہ نازل کیا، اور اس طرح یہ پیغام بھی لوگوں تک جزواً جزواً پہونچا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر صلعم ارشادات الٰہیہ کو اپنے پیروؤں تک اس طرح پہونچاتے تھے کہ وہ اپنی زندگی کو اسی کے مطابق ڈھال سکیں اور دشواریوں کا مقابلہ کر سکیں، اور پھر آپ اپنی ذاتی مثال سے انھیں تربیت دیتے تھے، چناں چہ متعلمین اور معلم کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کے لئے جو طریقے اور جو تکنیک آپ نے استعمال کی اسے بہترین اور کامیاب تکنیک کہنا بے جا نہ ہوگا اس سے لوگوں کی سماجی اور اخلاقی اصلاح اس انداز میں کی جا سکتی ہے کہ وہ ان تعلیمات کو اپنی روزمرہ زندگی کا لازمی جزو تصور کر لیں، یہ عظیم الشان کامیابی جو بدوی سپاہیوں اور ریاست دانوں نے تربیت یافتہ افواج اور زیرک سیاست دانوں اور ان کی حکمت عملی کے مقابلے میں حاصل کی، وہ اصل رسول برحق ؐ کے کامیاب معلم ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، آپ کے پیروؤں نے جو درس آپ کے قدموں میں رہ کر پڑھا، اسے انھوں نے اس طرح اپنایا کہ وہ ان کی زندگی کا جزو بن گیا، یہ انسانیت کے سب سے بڑے معلم کے مکمل طریق تدریس کا زندہ ثبوت ہے، چناں چہ آپ کے پیرو جہاں کہیں گئے اور سماجی معاشی اور سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لئے جن لوگوں سے انھیں سابقہ پڑا، ان کے مد مقابل کو ان کی برتری کا معترف ہونا پڑا۔

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی نظریۂ حیات کی ابتدائی کامیابی کے دو اسباب ہیں

نہیں کم وبیش ہر مؤرخ نے سراہا ہے۔

(۱) پیغام کی فضیلت اور وہ نظریہ جو اس پیغام نے پیش کیا۔ اور

(۲) اپنے پیروؤں کے لئے رسول کریمؐ کا معلم ہونا۔

جہاں تک پہلے دو عوامل کا تعلق ہے وہ آج بھی سالم و ثابت ہیں، ہم میں سے جو شخص معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی اپنی نجی یا قومی زندگی میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے حقائق سے بآسانی روشناس ہو سکتا ہے، ہمارے ہادی برحق نے تو اپنی زندگی میں ہی اسلام کے بنیادی پیغام کو وسعت بخشی اور جو معاملات مشکوک تھے اور یقیناً بہت ہی کم تھے، ان کی توضیحات ہمارے معروف فقہا نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں۔ ہماری موجودہ برائیوں کی وجہ اسلامی نظریۂ حیات کا تنزل نہیں ہے، سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ بدلتے ہوئے قومی اور بین الاقوامی حالات میں اس نظریئے کو منطبق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مجھے اندیشہ ہے کہ شائد میرے اس بیان سے اشتباہ پیدا ہو جائے اور کہیں یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں اس نظریئے کے خلاف شبہات پیدا کر رہا ہوں

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

(میں نے آج تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے، اور نعمتوں کو تمہارے لئے عام کر دیا ہے اور اسلام کو تمہارا دین منتخب کیا ہے)

اس سے قطع نظر ہم آج بھی دین کی حدود میں رہ کر داست ذو ہتقی، صاحب علم اور دیانت دار بزرگوں کے اجماع الامت اور قیاس کی روشنی میں اپنی مذہبی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو از سر نو مرتب کر کے، موجودہ حالات کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ اپنے پیروؤں کے لئے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معلم ہونا ہے۔
یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ جسمانی لحاظ سے آپ ہمارے پاس موجود نہیں ہیں، اور ہماری انفرادی سماجی، قومی اور بین الاقوامی زندگی آپ کی اس تعلیم سے محروم ہو چکی ہے جس سے صحابۂ کرام اور بعض

عہد کے لوگوں نے براہ راست فائدے اٹھائے، دراصل جس چیز نے چند بدی قائدین کو ان کے ا
زمانے میں انسانی سیادت کا اعزاز بخشا، ہم میں آج اسی جذبۂ کار کی کمی ہے، لیکن آپ نے فرمایا ـــ
انا بشر مثلکم ـ میں تمہاری طرح انسان ہوں ـ اور اس لئے سنتُ اللہ کے تابعؐ ـ اور میر
ایمان ہے کہ اسلام ہر وقت اور ہر زمانے کے لئے نازل کیا گیا ہے، اس کا مقصد صرف آپ کی زندگ
میں ہی موثر اور قابل عمل ہونا نہیں تھا، یہ درست ہے کہ بیسویں صدی میں ہم رسول کریمؐ کی شخصیت
براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے لیکن محض معلم کے جسمانی وجود سے ہی انسان متمتع نہیں ہوتا، آپ ک
پوری زندگی اور آپ کی تعلیمات ہمارے پاس ہیں، ان سب کا مطالعہ اور ان سے فائدہ اٹھانا
کام ہے، یہ تعلیمات تدریسی تکنیک کا قیمتی اور جیتا جاگتا نمونہ ہیں، اور ان کی مدد سے ہم آج بھی اس
نظریۂ حیات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں اور اسے ایک ایسی شکل میں متشکل کر سکتے ہیں کہ اسلا
ہمارے لئے بار خاطر ہونے کی بجائے ہماری اپنی زندگی میں ایک متحرک قوت بن جائے، اگر رسول ک
کے قائم کردہ اصولوں پر عمل کیا جائے تو ہم آپ کے جسمانی لحاظ سے موجود نہ ہونے کا بدل پیدا کر سکتے

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آپؐ کی تدریسی تکنیک کا جو مواد ہمارے پاس موجود ہے، اور جسے ہم آ
سیرت اور آپ کی عملی زندگی سے حاصل کر سکتے ہیں، اس سے ہم قرار واقعی فائدہ نہیں اٹھاتے اور
ممالک میں اسلامی نظریۂ حیات کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ اس تدریسی تکنیک کا غلط استعمال ہے، جو
آج کل اسلامی نظریۂ حیات کو فکر و عمل کے متحرک اور زندہ سانچوں میں ڈھالنے کے ذمہ دار ہیں، ان
طریقے دور از کار اور ناقص ہیں۔

اسلامی نظریۂ حیات کی ناکامی کا دوسرا سبب تقسیم بین الاثنین ہے، مجھے اپنی اس معاشر
کمزوری کا مکمل احساس ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو عملی نظریہ ہماری تاریخ کے ابتدائی ز
میں ہی پیدا ہو چکا تھا، ایک وہ گروہ جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار تھا اور ایک وہ جو دی
محافظ کہلائے، رسول کریمؐ نے اپنی زندگی میں اس دو عملی کو پنپنے کا موقع نہ دیا، بوقت ضرورت
غزوات میں فوجوں کی قیادت آپ خود فرماتے تھے اور میدان جنگ میں صحابہ کے دوش بدوش

م کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے لیکن قرونِ اولیٰ ہی میں خلیفہ قومی زندگی کی مادی اور دنیاوی
تی کا ذمہ دار قرار پایا، اور قوم کی دینی اور روحانی زندگی کی اصلاح فقیہ، محدث اور صوفی کا حافظ
رار پا گیا، یہ حد بندی ہماری اجتماعی زندگی کے لئے بے حد مہلک ثابت ہوئی۔

یہ دو عملی نظریہ ہماری سماجی زندگی میں یا یوں پھیلتا رہا کہ ملک میں نظم و ضبط قائم رکھنا اور بیرونی ملک سے امن کے زمانے میں حکومت
پالیسی مرتب کرنا نظم و نسق سلطنت کا ذمہ دار ہوتا۔ اس کے علاوہ لوگوں کی زندگی کے دوسرے سماجی اور معاشی پہلو پر
رکھنا حکومت کا کام تھا، یا یوں سمجھئے کہ یہ ان کے فرائض کی حد بندی تھی، اس تقسیم نے اس طبقے کے دل میں یہ جذبہ
اکر دیا کہ تحفظ دین اور عوام کی اخلاقی اور روحانی اصلاح ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ اور یہ خیال مسلسل ترقی پاتا رہا اور
ادر زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ اس طبقے نے اپنے آپ کو محض نظم و نسق کا ذمہ دار سمجھا۔ دوسری
ف دین کے محافظ فقیہ، محدث اور صوفی بھی رفتہ رفتہ یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا حلقۂ عمل مسجد، مدرسہ، یا خانقاہ
کی چار دیواری سے باہر نہیں ہے، اس طرح یہ دو عملی نظریہ وسیع ہوتا گیا اور ہماری قومی زندگی میں
ایک ایسی خلیج بن گیا جس کا پاٹنا مشکل ہو گیا، یہی نہیں بلکہ عوام کے لئے "اولو الامر" کی تلاش کا مسئلہ بھی
اتنا اہم ہو گیا کہ وہ اسی میں گم ہو کر تباہ ہو گئے، وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اپنی سماجی اور سیاسی زندگی کی
اصلاح اور رہنمائی کے لئے کس کی طرف رجوع کریں اور کون انہیں منزل مقصود کی طرف لے جا سکتا
ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو ملا (علمائے سو) نے اسلام کا ایسا محدود اور متعصبانہ نظریہ پیش کیا
اور دوسری طرف سیاسی رہنما نے اسلام کی ایسی مبہم اور زمانہ ساز تشریح کی کہ عوام الناس اس
کشاکش کا شکار ہو گئے۔ اولو الامر کون ہے؟ اس کے واضح اور متعین تصور کی عدم موجودگی میں
ان کا انہیں تصورات میں الجھ کر رہ جانا یقینی تھا، یہ خداوندانِ سیاست اور یہ دینی آموزگار۔ دو
طاقت ور گروہ اور ایک دوسرے کے حلیف عوام کو سماجی کٹھ پتلی بنانے میں کامیاب ہو گئے، اب
وہ کبھی سیاست داں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا تھا اور کبھی محافظ دین کے لئے ایک دل خوش کن مشغلہ۔

اس طرح وہ عوام جو قرونِ اولیٰ میں اسلامی مساوات کے زبردست رکن تھے۔ آج معاشرے میں
حقیر، فرومایہ اور غیر پسندیدہ عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملک و ملت کے لئے ان کا وجود غیر سود مند

اور بے کار سمجھا جاتا ہے۔

عام مسلمانوں کو رفتہ رفتہ منظر عام سے ہٹا دیا گیا، اور اب ریاست والوں اور دین کے محافظوں کے درمیان ان کی حیثیت سماجی کوڑی کی بھی نہیں رہی، اس کے بعد موخر الذکر دونوں گروہ بھی علیحدہ علیحدہ دھاروں میں بہنے لگے، ہر گروہ نے اپنے آپ کو منظم کیا، اور اپنے آپ کو مکتفی اور کفیل بنانے کی مہم شروع کر دی۔ یہ اکتفائے ذاتی، محض سیاسی اور معاشی نہیں تھا بلکہ ثقافتی اور دینی بھی چنانچہ سیاسی رہنماؤں اور دینی پیشواؤں میں قیادت کی تگ و دو جاری ہو گئی اور وہ ایک ایسے ثقافتی اور دینی نظام کے قیام کی کوشش میں مصروف ہو گئے، جس سے ایک دوسرے پر فوقیت حاصل ہو سکے یہ ثقافتی اور دینی نظام جو اپنی تعمیر و تشکیل میں ان دونوں گروہوں کا رہین منت ہے، اپنی وضع اور ساخت میں فی الحقیقت اپنی اپنی جگہ دونوں کے وقار اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے مرتب کیا گیا تھا ان میں سے کسی نظام میں عوام کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، اور اگر کوئی گنجائش تھی تو شطرنج کے پیادے مہرے کی سی، اور یہ ایک عجیب حیران کن بات ہے کہ ان سیاسی اور دینی رہنماؤں نے اپنے نظام اقدار میں عوام کے لئے جو پست مقام مخصوص کر دیا، عوام نے اس ذلت و رسوائی کو بآسانی قبول بھی کر لیا، لیکن غالباً سماجی شعور یا ثقافتی بصیرت کی کمی نے اسے متزلزل رکھا اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان دو طاقت ور گروہوں میں کس کی اطاعت لازمی ہے اور بدقسمتی سے وہ ان دونوں نظریات کے درمیان معلق رہا۔

اسلامی معاشرے کی ان تین متضاد اور متبائن گروہوں میں تقسیم ہندوؤں کی ذات پات کی تفریق کے مترادف ہے اور اسلامی نظریات کے منافی۔ رسول کریمؐ نے اپنی مساعی سے اور اپنی موثر قیادت میں ایک ایسے معاشری نظام کی بنیاد ڈالی جس میں سیاسی، دینی یا اور کسی قسم کی قیادت کے لئے کسی شخص یا گروہ پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی تھی، جو معاشرہ آپ نے تعمیر کیا وہ مربوط اور منظم تھا۔ اور اس سماج کے ممبر کی شخصیت اور اس کے کردار میں ایسی صلاحیتیں موجود تھیں کہ اگر انھیں ترقی کرنے اور بڑھنے کا موقع ملے تو ان میں سے ہر شخص بڑی سے بڑی دینی، سیاسی اور عسکری ذمہ داری اٹھانے کا

اہل ہو سکتا تھا۔

لیکن جب یہ تقسیم اسلامی معاشرے کا جزو بن گئی اور اس کا احاطہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ تو صدیوں کے اس اختلاف نے ان تینوں گروہوں کو تین مستقل طبقوں میں تقسیم کر دیا اور انھیں تینوں طبقوں نے تین قسم کے شہریوں کی صورت اختیار کر لی جو اپنی اپنی فرع اور اپنے اپنے کاروبار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہی نہیں تنازع اور آمادۂ پیکار بھی رہتے ہیں، ان میں سے ہر گروہ انتہا پسند ہے، حتیٰ کہ کسی شہری کا ایک سے زیادہ گروہوں سے متعلق ہونا ناممکن ہو گیا، اسے ہم دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک حکم ران، دوسرا دینی مفکر اور تیسرا عام مسلمان جو ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک میں مشکل سے داخل ہو سکتا ہے۔

معاشرے کی اس تقسیم اور انتشار نے ایک اور اہم انتشار کا دروازہ کھول دیا، آغاز کار میں اسلامی نظریہ حیات ایک "مربوط کل" سمجھا جاتا تھا اور اس سے ہمیشہ ایک صحت مند اور متحرک سماجی زندگی مراد لی جاتی تھی، یہی "مربوط کل" بتدریج علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم ہو گیا جو اپنے نظام عمل میں غیر متحرک اور تنگ نظر واقع ہوئے ہیں، وہ طبقہ جسے اپنی حکومت اور اپنے عدل و انصاف پر ناز ہے، اس مربوط نظریے میں سے اسی جزو کو اپناتا ہے جو اس کے لئے سب سے زیادہ مفید مطلب ثابت ہو سکے، علماء کا طریق کار بھی یہی ہے اور عوام ان دونوں گروہوں کے مقاصد کی تکمیل اور ان کی خدمت کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔

اس تقسیم کار نے عوام میں اخلاق کش مسلک قدر اور احساس کم تری کا جذبہ پیدا کر دیا جس کے مضر اثرات صدیوں سے ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے مقسوم ہو چکے ہیں، اس نے ان سے اجتہاد فکر اور جذبۂ سرفروشی چھین لیا اور بالآخر اس بندۂ مفلوج نے حکم ران کی خدمت ہتدین دو نما کی تقدیس کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا اور اپنے سیاسی رہبر اور پیر معنوی کے التفات فراواں، الطاف عمیم اور کرم گستری کے طفیل زندگی بسر کرنے لگا، جیسے اس کی زندگی کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہے، عوام کی یہ تقلید پرستی اور یہ شدید احساس کم تری، اس کے حکم رانوں اور دینی پیشواؤں کا پیدا کردہ ہے۔ جو اس کے حلق و دماغ میں

پیوست ہو چکا تھا اور میں اس جذبۂ فروتنی کو انسانی سماج کی تخریب، ابتری، ارتجاع اور تنزل کی ج
سمجھتا ہوں جو ان دنوں اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

قصہ مختصر مسلمانوں کی موجودہ افسوسناک صورتِ حال کی ذمہ داری اسلامی نظریۂ حیات پر نہیں
بلکہ سنن نبوی سے انحراف پر عائد ہوتی ہے۔ ہم نے رسول پاکؐ کے معمول اور آپؐ کے طریق کار کو چھوڑ د
ہے اور آپؐ کے قائم کردہ اصولوں سے ہم جس قدر دور ہٹتے جاتے ہیں اور اسلامی نظریۂ حیات کو عملاً
اپنی روزمرہ زندگی سے مربوط اور ہم آہنگ کرنے سے ہم جس قدر گریز کرتے ہیں، اسلامی معاشرے
میں اتنا ہی انتشار پھیلتا جاتا ہے اور اس معاشرتی انتشار نے اسلامی نظریۂ حیات میں بھی تفرقہ انگیزی اور
الجھاؤ پیدا کر دیا ہے حتیٰ کہ ان ملکوں کی نوے فی صدی آبادی کو اپنی بے مائگی اور پستی کا پورا پورا احساس
ہو گیا، اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہ نہایت ذلت و رسوائی سے یا اپنی زندگی اپنے سیاسی آقا کی خدمت میں
بسر کر دیتے ہیں یا بے جبل و حجت اپنے دینی پیشوا کی پرستش کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

جب تک اسلامی معاشرے میں اس قسم کی تقسیم موجود ہے ہم اپنی اس کھوئی ہوئی زندگی اور اس
کھوئی ہوئی قوت کو از سر نو حاصل نہیں کر سکتے، جسے انسانیت کے عظیم الشان رہنما ہونے کی حیثیت سے
رسول کریمؐ نے دنیا کے سامنے ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کیا تھا، اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کیا ہماری تاریخ کے اس نازک دور میں اس کا کچھ مداوی ہو سکتا ہے، کیا سماج کی اس کوتاہی اور
اس انتشار اور اس تفرقہ انگیزی کو دور کیا جا سکتا ہے، اور کیا پورے اسلامی معاشرے کو دوبارہ ایک
"مربوط کل" کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

جب میں اپنے گرد و پیش دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اس سوال کا بہترین جواب
اقوام مغرب کے پاس ہے: جواب، فی الحقیقت یہی ہے۔

ان اقوام کے تعلیمی نظام کا غائر مطالعہ کیجئے، انھوں نے اپنے مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو
کس طرح منظم کیا ہے، اور تعلیم گاہوں پر کیا موقوف انھوں نے اپنے پورے معاشرے کو کس طرح مضبوط
بنیادوں پر استوار کیا ہے، اگر آپ انھیں نزدیک سے دیکھنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ

ن سب کے پورے نظامِ کار میں ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور
جذبہ کا دیہ ہے کہ اپنے فلسفۂ زندگی کو بطریقِ احسن اپنی روزمرہ زندگی سے مربوط کیا جائے تاکہ سب کے
تراک اور تعاون سے ایک ایسے معاشرے کی تنظیم کی جا سکے جس میں ہر رکن اسی فلسفۂ حیات کے
مطابق اپنی زندگی کو مربوط اور ہم آہنگ بنا سکے۔

میں اس وقت جرمنی یا انگلستان کی مثال پیش نہیں کروں گا۔ بلکہ دو ایسے ملکوں کی مثالیں
پیش کروں گا جن سے اس وقت لوگ سب سے زیادہ متاثر ہیں یعنی امریکہ اور روس۔ امریکہ میں تعلیمی
طریقوں کے ارتقا اور نصابِ تعلیم کے مندرجات کا بنیادی نظریہ امریکی "طریقِ زندگی" ہوتا ہے۔ جہاں تک
امریکی نظامِ تعلیم کے طریقِ تدریس اور اس کی تعمیر و تشکیل کا تعلق ہے، اقدارِ حیات اور امریکی نظریۂ جمہوریت ہی
ان کے نئے فیضان کے سرچشمے ہوتے ہیں۔

روس میں اشتراکیت امریکی طریقِ زندگی کی جگہ لے لیتی ہے اور روسی حکومت تدریسی طریقوں
اور تعلیمی اداروں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے کہ جو شخص ان تعلیمی اداروں میں
تعلیم پاتا ہے اور انہیں مخصوص تدریسی طریقوں کے زیرِ اثر تربیت پاتا ہے تعلیم سے فارغ ہونے
کے بعد اسے اپنی معاشرتی زندگی کا پورا پورا احساس ہوتا ہے اور وہ ان معاشرتی تقاضوں کا احترام کرتا ہے۔
اسے اور زیادہ واضح اور معین الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مغربی ممالک نے حسبِ ذیل طریقِ عمل پر
انی غور و فکر سے کام لیا ہے اور مزید غور و فکر کے لئے اپنے بہترین ذہنوں کو ان امور کے تجزیئے پر مامور کر دیا ہے

۱۔ سماجی رابطہ
۲۔ انفرادی تعلقات
۳۔ اجتماعی قوتِ محرکہ
۴۔ ثقافتی رابطہ
۵۔ موثر قیادت

ان محققین کا کام ان بنیادی مگر سادے طریقوں کی ماہیت معلوم کرنا ہوتا ہے یعنی کسی مسئلے کو

الفاظ کا جامہ کس طرح پہنایا جاتا ہے اور پیش کرنے والا اسے کس انداز میں پیش کرتا ہے کس طرح اس مسئلے کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے، اور پھر کس طرح اسے متعلقہ افراد کے سامنے عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

میں یہاں سماجی علوم کے مغربی ماہروں کے طریق کار کی تفصیل بیان نہیں کروں گا کہ انہوں نے اپنے قومی نظریات کو عوام کی روزمرہ زندگی سے کس طرح ہم آہنگ اور مربوط کر لیا ہے بلکہ یہاں پر صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ مغربی ماہرین آج اسی صبر واستقامت، ہمت اور دھن دہی سے کام لے رہے ہیں جس طرح ہمارے رسول پاکؐ نے صدیوں پہلے اپنے روحانی اور وجدانی انداز میں صبر واستقلال سے کام لیا تھا۔

اگر ہم اسلامی نظریۂ حیات کو پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری کرنا چاہتے ہیں اور اسے ہر شخص کی زندگی کا ضروری جزو بنانے کے آرزومند ہیں تاکہ ہم ایک مربوط اور ہم آہنگ معاشرے کی بنیاد ڈال سکیں تو اس کے لئے ہمیں ایک غیر مبہم طریق عمل اختیار کرنا ہوگا۔

ین کماون اللہ قیاما وقعوداً وعلی جنوبہم

(اٹھتے بیٹھتے اور کھڑے ہوتے ہوئے اللہ تعالےٰ کا ذکر کیا کرو)

اور جس میں ہر رکن دیانت داری سے کہہ سکتا ہو۔

انّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین

(بے شک میری عبادت، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو جہانوں کا پالنے والا ہے)

اور جس میں ہر رکن کے پیش نظر ایک بلند مقصد ہو اور وہ خدا کے حضور میں کہہ سکے۔

واجعلنا للمتقین اماما

(اور ہمیں ان سب کے لئے ایک نمونہ بنا جو نیک اور صالح ہیں)

دین اور اسلامیات کی تدریس کا مقصد اگر محض معلومات ہی بہم پہونچانا ہے تو یہ ہمیں کسی

ت تک نہیں پہونچا سکتا اور مغرب کے لباس اور معاشی نظام کی تقلید بھی ہمیں منزل کے قریب
لا سکتی۔ اس کے حصول کے لئے تو

۱۔ ہمیں سنن نبوی کا مطالعہ کرنا ہوگا اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ رسول پاکؐ ارشادات الٰہیہ
اپنے صحابہ تک کس طرح پہونچاتے تھے، کس طرح وہ ان الہامی حقائق کو اپنے پیرؤں
کی زندگی سے ہم آہنگ کرتے تھے اور کس طرح انھوں نے ایک معاشرے کی بنیاد
ڈالی جس کا ایک ایک فرد ہر شعبۂ زندگی میں قیادت کا بار سنبھال سکتا تھا خواہ وہ
دینی ہو یا فوجی، معاشی ہو یا سیاسی۔

۲۔ ہمیں پاکستان میں سماجی علوم (SOCIAL SCIENCES) کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنا
ہوگا جہاں سماجی تعلیم، انفرادی تعلقات، اجتماعی قوت محرکہ، ثقافتی روابط اور قیادت
وغیرہ کے مطالعے کا اہتمام جدید ترین مغربی تکنیک کی روشنی میں کیا جا سکے۔

ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالنے اور اسے مناسب طریقوں پر چلانے کے لئے ہمیں مغرب سے
ترین علوم مستعار لینے پڑیں گے، لیکن اس سے جو فائدے مجموعی طور پر ہمیں حاصل ہوں گے
دوسرے امور پر بھاری ہیں، مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ سماجی علوم کے اس ادارے کے
م کے لئے ہمیں فوری اقدام کرنا چاہیئے، خواہ اس کی تعمیر میں زر کثیر ہی خرچ کرنا پڑے، میرا
ال ہے کہ اس قسم کے ادارے پر جو لاگت آئے گی وہ کسی تکنیکی ادارے کی لاگت سے کم ہوگی۔
رسول پاکؐ کی تعلیمات اور ان کے طریق عمل کے مطالعے کو اپنے طریق کار کی بنیاد قرار دے کر
ور جدید سماجی علوم کے ماہروں کی تکنیک سے فائدہ اٹھا کر ایک کارآمد، صحت مند اور موثر ادارہ
ائم کیا جا سکتا ہے جس میں انسان کی جملہ تخلیقی اور روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا
ہے، اس سے میری مراد وہی صلاحیتیں ہیں جنھیں امریکہ والے انسانی نقشہ بندی
(HUMAN ENGINEERING) سے تعبیر کرتے ہیں، اگر ہم بھی اپنے نوجوانوں کو اس نظام کار کے
یراثر تعلیم و تربیت دینا شروع کریں تو مجھے امید ہے کہ انسانی نقشہ بندی کے لئے ہم جلد ایک دست

ماہرین پیدا کر سکتے ہیں، اور ماہروں کی اس جماعت سے صرف ہمارے تعلیمی ادارے ہی متمتع نہیں ہوں گے، بلکہ انتظامی دفتروں، قانون ساز مجلسوں، تجارتی ایوانوں، کارخانوں، عدالتوں، تفتیش و تحقیق کے محکموں، مسجدوں، خانقاہوں اور بازاروں میں وہی لوگ نظر آئیں گے جو صرف اسلامی نظریۂ حیات کے حامل ہی نہیں ہوں گے بلکہ ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ اسلامی نظریۂ حیات ان کی رگ رگ میں سرائت کر چکا ہے۔

اگر ہم کسی ایسے نظام حیات کی تعمیر و تشکیل میں کامیاب ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ ایسے عظیم الشان کام میں ہمیں خسارہ نہیں ہوگا، اس سے ہم صرف پاکستان میں ہی سماجی، اقتصادی معاشی اور ثقافتی انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوں گے، ہماری یہ مثال دوسرے اسلامی ممالک کے لئے بھی چراغ راہ بن جائے گی اور لوگوں کو معلوم ہو سکے گا کہ ہم اپنے اسلامی اور مشرقی ورثے کو بطریق احسن مصرف میں لا سکتے ہیں، اور انسانی تعلقات کے خزاں رسیدہ خطوں کو مفید اور سوچی سمجھی انسانی کوششوں کے لہلہاتے ہوئے مرغ زاروں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

اگر ہم اپنی اس مہم میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ عرب ایشیائی اقوام کے رکن ہونے کی حیثیت سے ہم ادارہ اقوام متحدہ کے کاروبار میں کہیں زیادہ اہم حصہ لے سکتے ہیں، اس وقت ہم محض موہوم اور خیالی باتیں کرنے والے متصور نہیں ہوں گے، آج چونکہ مختلف مسائل کے مافیہ سے ہم خود واقف نہیں ہوتے اور مسئلے کی معقولیت کا خود ہمیں بھی پورا پورا احساس نہیں ہوتا اس لئے ہماری باتوں میں نہ زور بیان ہوتا ہے اور نہ قوت استدلال اور نہ ہم دوسروں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، لیکن جب ہم مختلف مسائل کو حل کر کے اپنے نظریۂ حیات کی روح اپنی معاشرتی زندگی میں پھونک دیں گے، اور اسے ایک زندہ حقیقت بنا دیں گے تو ہم اپنے مافی الضمیر کو نہایت اعتماد اور وضاحت کے ساتھ دوسروں کے سامنے بیان کر سکیں گے، اس وقت ہماری حیثیت ہی کچھ اور ہو گی، ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو نظریاتی خلا میں معلق نہیں، بلکہ اپنے نظریات کو زندگی کے حقائق میں تبدیل کر چکے ہیں۔

جامعۂ لندن

ناظر حسن سلیم

برطانیہ کی مختلف درس گاہیں اپنی جداگانہ خصوصیتوں کے لیے ممتاز ہیں، ان میں گلاسگو اور ایڈنبرا جیسی قدیم یونی ورسٹیاں بھی ہیں، جن میں عین اُس دور کے بعد تعلیم و تعلم کا آغاز ہوا تھا، جو یورپ میں "نشاۃ ثانیہ" کے نام سے معروف ہے اور جن میں درس و تدریس کا سلسلہ کم و بیش چھ صدیوں سے قائم ہے۔ ان ہی میں آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات ہیں جن کا نام لیتے ہی ذہن میں اس شائستگی متانت اور پروقار علمیت کا تصور آتا ہے جو ایک امیرانہ لیکن سخت گیر اور باضابطہ نظام کے سائے میں نشو و نما پاتی ہے، اسی سلسلے میں جامعۂ لندن کا بھی نام لیا جاتا ہے اور یہی آج مضمون کا موضوع ہے۔

جامعۂ لندن کا نام آکسفورڈ یا کیمبرج کی سی جذباتی کشش یا روایتی عظمت نہیں رکھتا۔ تاہم برطانیہ کی یہ عظیم ترین درس گاہ اپنی ہمہ گیری اور افادیت کے اعتبار سے تمام جامعات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اس کے فارغ التحصیل طلبا نہ صرف ادبی اور تعلیمی دائروں میں بلکہ صنعتی تجارتی، اقتصادی، طبی اور فنی اور سائنسی حلقوں میں دنیا کے ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، یہاں علوم و فنون کی اتنی رنگارنگی ہے کہ ہر علم و فن کے ابتدائی اور انتہائی مدارج طے کیے جا سکتے ہیں اور اس جامعیت میں دنیا کی کوئی اور درس گاہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جامعۂ لندن کی تاریخ مختصر ہے، اس کا قیام فرمان شاہی کی رو سے ۱۸۳۶ء میں ہوا۔ اور اس وقت یہ دو تعلیمی اداروں یعنی یونیورسٹی کالج اور کنگز کالج پر مشتمل تھی، فرمان کی رو سے یہ "ارباب علم و دانش کی ایک جماعت" تھی جو امتحان لینے اور ڈگریاں عطا کرنے کے لیے

قائم ہوئی تھی، اسی سال سے اس میں باقاعدہ طالب علموں کے دوش بدوش بیرونی طلبہ کا سلسلہ بھی قائم ہے یعنی ایسے طلبہ جو بیرونی ذرائع سے تعلیم حاصل کر کے مختلف مرکزوں میں یونی ورسٹی کے امتحانات میں شریک ہوتے ہیں اور ڈگریاں حاصل کرتے ہیں، اس کے علاوہ دو باتیں اور بھی ہیں جن میں اس جامعہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے، یعنی سائنس کے شعبے کا قیام اور عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش شریک تعلیم ہو کر ڈگریاں لینے کا حق جو ۱۸۷۸ء میں دیا گیا۔

اس جامعہ کی عظمت کا کچھ اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کے اعلیٰ مدرسین یعنی پروفیسروں اور ریڈروں کی تعداد پونے پانچ سو اور مستند اساتذہ کی تعداد نو سو سے متجاوز ہے۔ ہر سال اوسطاً اٹھارہ ہزار باقاعدہ اور تیئیس ہزار بیرونی طلبہ اس سے مستفید ہوتے ہیں، اس کے بعض ادارے مثلاً یونی ورسٹی کالج بجائے خود بعض یونی ورسٹیوں سے بڑے ہیں، اس کے عظیم الشان کتب خانے میں پانچ لاکھ کے قریب کتابیں، یادداشتیں، مسودے اور مخطوطات محفوظ ہیں۔

جامعۂ لندن کے قیام کے بعد سے اب تک اس کے فرائض اور ذمہ داریوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے، اس لئے اس کے قواعد و ضوابط میں بھی تبدیلیاں ہونا لازمی تھا، چنانچہ موجودہ ضابطہ مختلف مدارج طے کرتا ہوا دسمبر ۱۹۲۶ء میں "قانونِ جامعۂ لندن" کے نام سے پاس ہوا۔ اور دو سال بعد یعنی مارچ ۱۹۲۹ء میں شاہی منظوری کے بعد نافذ ہوا۔ اس قانون سے ایک خاص تبدیلی یہ ہوئی کہ ایوان (COURT) کا قیام عمل میں آیا، اب تک یونی ورسٹی کا مالی انتظام سینٹ کے ہاتھ میں تھا جو یونی ورسٹیوں کے لئے سرکاری عطیات کی مجلس (UNIVERSITY GRANT COMMITTEE) سے امداد وصول کرتی اور اسے مختلف کالجوں میں تقسیم کرتی تھی، اب یہ کام بھی ایوان سے متعلق ہے۔

یونی ورسٹی کے نظم و نسق کی موجودہ صورت بہ تشریح ذیل ہے۔

۱۔ چانسلر۔ یونی ورسٹی کے جملہ امور کا مختارِ مطلق ہے اور تعلیمی نیز دیگر اہم امور میں جو زیرِ دست مجالس میں طے ہوں۔ اس سے رجوع کیا جاتا ہے۔

۲۔ ایوان (COURT) یہ سولہ ارکان پر مشتمل ہے، چانسلر، وائس چانسلر، صدر کا نووکیشن منتقل

ر پراندروئے عہدہ اس کے رکن ہوتے ہیں، باقی تیرہ ارکان میں سے چھ سینیٹ کے۔ چار شاہی
م زد۔ دو لندن کاؤنٹی کونسل کے اور باقی ایک ان سب کا باہم تجویز شدہ ہوتا ہے۔ ایوان
نی ورسٹی کی جائداد اور مالیات کا منتظم ہے۔ سرکاری مجلس عملیات، لندن کاؤنٹی کونسل، قریبی
ضلاع کی کونسلیں اور یونی ورسٹی کے نجی ذرائع آمدنی مثلاً فیسیں وغیرہ وغیرہ یہ سب وہ ذرائع
یں جن سے جامعہ کی اقتصادی بنیاد استوار رہتی ہے، ایوان مختلف کالجوں کو جو رقم دیتا ہے۔ وہ
سینیٹ یعنی عاملہ کے توسط سے ہی دی جاتی ہے، اور اس معاملے میں ایوان و عاملہ کے درمیان
بھی کوئی حریفانہ کشاکش نہیں ہوتی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایوان میں عاملہ کے جو چھ ارکان
ہوتے ہیں اُن کا انتخاب عاملہ کافی ہوش مندی سے کرتی ہے اور یہ ارکان نہایت تدبر سے عاملہ کے
مفاد اور وقار کا خیال رکھتے ہیں۔

۔ عاملہ (سینیٹ) تعلیمی اور انتظامی امور کا انضباط اس سے متعلق ہے، وائس چانسلر اور پرنسپل کا انتخاب
بھی یہی کرتی ہے، اس کے ارکان پچاس یا پچپن کے قریب ہوتے ہیں جن میں سے سترہ کانووکیشن
کے نمائندے، سترہ یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں کے صدر، چار باہم منتخب کردہ اور باقی چند اسکولوں[1] کے
صدر ہوتے ہیں۔ کانووکیشن کے نمائندوں کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

۶۔ کانووکیشن جامعہ کے رجسٹر شدہ گریجویٹ اس کے ارکان ہوتے ہیں، یہ ضابطے کے تحت یونی ورسٹی کے
مختلف امور پر بحث کرنے اور اپنی تجاویز ایوان اور عاملہ کو پیش کرنے کی مجاز ہے۔

۵۔ سینیٹ۔ اس کی ۲۵ کمیٹیاں ہیں جن سے مختلف امور متعلق ہیں۔

جامعۂ لندن کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے، اس کے بعض ادارے مثلاً امپیریل کالج آف
سائنس اینڈ ٹیکنالوجی۔ اسکول آف اکانومکس، مدرسۂ السنۂ شرقیہ و افریقیہ، مدرسۂ امراض حارّہ۔
ادارۂ آثارِ قدیمہ۔ ادارۂ عمرانیات وغیرہ وغیرہ عالم گیر شہرت کے مالک ہیں۔

---

[1] اسکول عجیب سی اصطلاح ہے، اس سے یونی ورسٹی کے نہایت اہم ادارے اور کالج مراد لئے جاتے ہیں
ہماری زبان میں اس کے لئے مدرسہ، ایک مناسب متبادل لفظ ہے۔

اس عظیم الشان کام کے باوجود جو جامعہ کے مختلف اداروں میں ہوتا ہے، علوم و فنون کے روز افزوں مسائل اور سائنس کی متفرق شاخیں یا اس بات کی متقاضی ہیں کہ جامعہ کے اداروں میں مزید اضافہ کیا اور مدرسوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ یہ سوال جتنا دلکش اور دلچسپ ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے، جامعۂ لندن کا کام پہلے ہی اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے اور انتظامی امور پہلے ہی انتہائی حدود سے گذر چکے ہیں، اب مزید اضافہ بدنظمی اور پراگندگی پیدا کردے گا۔

ان دقتوں کا ایک حل یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ جامعۂ لندن کو دو علیحدہ علیحدہ یونی ورسٹیوں میں تقسیم کردیا جائے۔ تجویز بادی النظر میں کافی سہل معلوم ہوتی ہے لیکن غور و فکر کے بعد یہ اندازہ کرنے میں دقت ہوگی کہ ایسا کرنے سے وہ روایتی مرکزیت جو دنیا کے گوشوں سے طلبہ کو کھینچ لاتی ہے تقسیم ہوتے ہیں ختم ہو جائے گی، مختلف ادارے جو اپنے تئیں ایک کل کا جزو سمجھتے ہیں اور باہمی تعاون کرتے ہیں رقابت اور کشاکش میں مبتلا ہو جائیں گے اور جامعۂ لندن کی مرکزیت کا طلسم ٹوٹ کر رہ جائے گا، یہ درست ہے کہ دوسرے ملکوں بلکہ خود برطانیہ میں ایسی مثالیں ہیں کہ ایک شہر میں دو مختلف جامعے یا ادارے مصروف ہیں، مانچسٹر میں جامعے کے ساتھ ساتھ وہاں کا کالج آف ٹیکنالوجی مصروف عمل ہے، نیویارک میں بڑے دو جامعے کولمبیا یونی ورسٹی اور نیویارک یونی ورسٹی موجود ہیں، جن کے طلبہ کی تعداد تیس تیس ہزار ہے اور جن کے اساتذہ دو ہزار سے لے کر تین ہزار تک ہیں لیکن ان سب کی مرکزیت پہلے سے ہی جدا گانہ ہے۔ جامعہ لندن کو اگر دو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا جائے تو یہ تجربہ نہ صرف بے نتیجہ بلکہ سخت مضر ہوگا۔

ان سب موانع کے باوجود اور یہ تسلیم کرنے کے باوصف کہ نچلی جماعتوں (UNDERGRADUATE) میں طلبہ کا اضافہ یا ان کے اداروں کی تعداد بڑھانا ممکن نہیں رہا، یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ جماعتوں (POSTGRADUATE) کی تعلیم نیز تحقیقی سرگرمیوں کے لئے جامعۂ لندن کی آغوش ابھی کافی وسعت رکھتی ہے۔ اگر کبھی یہ فیصلہ کرنا ناگزیر ہوا کہ یونی ورسٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو غالباً اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور تحقیقی مرکزوں کو اس سے تعلق نہ ہوگا، اور یہ تقسیم محض نچلی جماعتوں کے طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ دینے کا فرض ادا کرے گی ۰

مدرسۂ عمل میں عملی مشاغل

نذیر احمد شیخ

عملی مدرسہ کا پہلا مقصد یہ ہے کہ بچے کی قوتِ تخلیق کو متحرک کرے، روایتی طریقۂ تعلیم کا نقص یہ ہے کہ یہ طلباء کی دماغی قوتوں کو متحرک کرنے میں بری طرح ناکام رہتا ہے، خوابیدہ قوتوں کو بیدار نہیں ہونے دیتا، معلم اپنے علم اور اپنی معلومات کے نشہ میں سرشار سب کچھ بتائے چلا جاتا ہے، اور طلباء کا اکثر و بیشتر حصہ سویا کا سویا رہ جاتا ہے، کامیاب طرزِ تعلیم وہ ہے جو تلامذہ کی دماغی اور جسمانی قوتوں کو اجاگر ہونے کا موقع دے اور اُس جذبۂ آزادی کے کارفرما ہونے کے مواقع بھی فراہم کرے، جو ہر فرد کی فطرت میں مضمر ہے۔ فطری طور پر ہر طالب علم چاہتا ہے کہ اکتساب علم میں اپنی راہ اختیار کرے، جو معلومات طالب علم کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہوں گی، بہت عرصہ تک دل و دماغ پر نقش رہیں گی، وہ ان کے حصول پر ایک گونہ خوشی محسوس کرے گا اور ہمیشہ فخر و مباہات کا اظہار کرتا رہے گا، ہر انسان میں ایک قوتِ عمل موجود ہے، اگر موزوں ماحول پیدا کر دیا جائے تو یہ قوت خود بخود سرگرم عمل ہونے کی کوشش کرتی ہے معلم کا فرض سازگار ماحول پیدا کرنا ہے جس میں بچہ اس قوت کو بروئے کار لا سکے۔

بظاہر بچہ سادہ اور معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن معلم کے لئے ایک پُرپیچ گتھی ہے، جسے اس کو اپنی حُسنِ تدبیر سے سلجھانا ہے، اگر وہ اس کا بنظر غائر مطالعہ کرے گا تو اسے ان میں بے ساختہ قوتِ عمل کا ایک سرچشمہ مل جائے گا، جہاں کوئی زندہ دلچسپی اسے سرگرم عمل ہونے پر مجبور کرتی ہے اسی سرچشمے میں وہ مرکزی قوت ہے جس سے کل چلے گی، یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے معلم کو اپنی تعلیم کا آغاز کرنا ہے۔ اسے ہم بے ساختہ دستی تعمیری یا ذہنی مشاغل کہہ لیں یا فطری رجحانات سے تعبیر کریں یا قدرتی وابستگیاں!

دل چسپیاں ٹھہرالیں، بہر حال انہیں رجحانات سے تعلیم کی ابتدا نفسیاتی لحاظ سے مؤثر ترین ثابت ہوگی، یہ بچہ ایک قسم کا بیج ہے جس میں بڑھنے والے پودے یا پھلنے والے درخت کے تمام خواص موجود ہیں جس طرح مالی بیج بو کر پودے کی پرورش کے لئے سازگار ماحول مہیا کرتا ہے، اسی طرح معلم کا فرض ہے کہ بچے کی صحیح نشوونما کے لئے موافق ماحول پیدا کرے۔

فلارنس نائیٹ انگیل بچپن میں اپنی گڑیوں کو بستر استراحت پر لٹا کر ان کی تیمارداری اور علاج معالجہ میں مشغول رہا کرتی تھی، ایک دن سیر کرتی ہوئی ایک پہاڑی پر سے گذر رہی تھی، جہاں اسے ایک کتے کے درد سے کراہنے کی آواز سنائی دی، وہاں پہونچ کر اس نے دیکھا کہ اس کی ٹانگ بری طرح مجروح ہوگئی ہے، فوراً اس نے پٹی باندھی اور اس کا زخم مندمل ہونے تک اس کی باقاعدہ دیکھ بھال جاری رکھی، آخرالامر یہ بچپن کی نرس جنگ کریمیا کے کراہتے ہوئے زخمی سپاہیوں کے لئے سقوطری کے ہسپتال میں رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی، حقیقت میں اس کا یہ سنہرا کارنامہ اسی جذبۂ عمل کا ظہور تھا جس کا ظہور عالم طفولیت میں ہوچکا تھا، کلائیو جیسے ہندوستان میں فاتح پلاسی کہلانے کا فخر حاصل ہوا حقیقت میں وہی طفل مکتب تھا جو اپنی جماعت کو گروہوں میں منقسم کر کے میدان کارزار گرم کیا کرتا تھا، مختصر یہ کہ فطری رجحانات اور دل چسپیاں ہی کتاب زندگی کی آئینہ دار ہیں، یہ دل چسپیاں عملی مشاغل کی صورت اختیار کرتی ہیں جن کی نشوونما کے لئے مدرسۂ عمل ایک آماجگاہ ہے۔

عملی اور دستی کام حقیقی تعلیم کا ابتدائی قفل ہے، پسٹالوزی (PESTALOZZI) نے باقاعدہ طور پر دستی مشاغل کو اپنے مدرسہ کے نصاب میں شامل کیا، اس کا عقیدہ تھا کہ یہ عملی کام بچے کی ذہنی اور جسمانی قوت کی ترقی، اخلاقی اور اجتماعی تربیت اور نفسیاتی نشوونما کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ لہٰذا اس نے انہیں حقیقی تعلیم کے مبادیات تسلیم کرتے ہوئے ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔

عملی کام سے ذہنی تربیت ۱۔ دستی کام بچے میں غور و فکر کو فروغ دیتا ہے، اشیاء کی ماہیت سمجھنے انہیں غور سے دیکھنے تفصیلات کا بغور مطالعہ کرنے اور مختلف پہلوؤں کے باہمی تعلق کو جانچنے میں مدد و معاون ہوتا ہے، غور و پرداخت کے بعد اشیاء کی اصلیت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے

۲- دستی کام بچے کے ذہنی اتحاد کی تکمیل کرتا ہے اور اُس کی نظر میں وسعت اور خیالات میں پختگی پیدا ہوتی ہے، وہ مختلف طبیعی طاقتوں اور اپنے ذریعوں کا مقابلہ کرتا ہے، اس کے پٹھے اور دماغ یک وقت معروف عمل ہوتے ہیں جس سے ایک متوازن شخصیت کا ظہور ہوتا ہے۔

۳- دستی کام اس کے تخیل کو فروغ دیتا ہے جس چیز کو بناتا ہے وہ اسے پہلے اپنے دماغ میں مکمل کرتا ہے، پہلے تصویر پھر محسوس پیکر، اس طرح اُس کے تصور میں تنوع پیدا ہوتا ہے، یہ اور نئے پیمانے پر ایک مکمل دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے، یہ اصول اور عمل کا اتحاد ہے کہ تجربے اور عمل سے اصول وضع کئے جاتے ہیں اور پھر عمل اصول کے ماتحت آجاتا ہے۔

عملی کام سے جسمانی قوت کو فروغ | عملی مشاغل سے بدن قدرتی طور پر جفاکشی کا عادی ہو جاتا ہے مشکلات برداشت کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، زندگی میں کٹھن منزلیں بھی آتی ہیں ان کے عبور کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، زندگی کی شاہراہ پر مستقل مزاجی اور بردباری سے چلنے کی عادت پڑتی ہے، گنتی مساحت اور ڈرائنگ کے مبادیات بچے میں غور و پرداخت سے دیکھنے کی قوت پیدا کرتے ہیں، آنکھ میں تیزی اور ہاتھ میں صفائی آتی ہے۔

دستی مشاغل سے علمی ترقی | دستی کام بچے کو ایک طبعی نظام کا علم سکھاتا ہے اور اسے مادے کے قریب تر لاکر اس کے خواص سے روشناس کراتا ہے، اس سے وہ ایک ابتدائی صنعتی نظام کی واقفیت حاصل کرتا ہے، قدرت کی پیدا کردہ خام اشیاء کے سود بخش استعمال پر غور کرنے لگتا ہے، اور اس میدان میں اپنی دلچسپی کے دائرے کو وسیع کرتا جاتا ہے۔ یہ کام اسے صرف صنعتی مقاصد اور سود بخش اشیاء سے ہی آشنا نہیں کراتا بلکہ صنعتی آلات سے بھی پوری طرح واقف کر دیتا ہے، جن آلات کو خود استعمال میں لایا جائے انہیں صاف کیا جائے اور قرینے سے رکھا جائے، دل میں ان کی عزت سی پیدا ہو جاتی ہے، اگر بچہ مختلف آلات کی عزت کرنا سیکھ جائے تو وہ مزدور اور دستکار کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے، عملی امور اور دستکاری کے مسائل کے متعلق اس کا رویہ منصفانہ اور ہمدردانہ ہوگا۔

عام نفسیاتی اوصاف کی تکمیل

(۱) دستی کام تمام قوتوں میں اشتراک عمل پیدا کرتا ہے یہ تمام حواس اور اعضا کی تمام قوتوں کو معروف عمل رکھتا ہے، کسی خاص قسم کا دستی کام کرنے سے یہ منظم اور مرتب طریقے پر کام کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

۲- دستی مشاغل بچے کی قوت ایجاد کو ابھارتے ہیں، خواہ وہ عمل ایجاد میں مشغول ہو خواہ مستقبل قریب میں پیش آنے والی مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے ذرائع سوچ رہا ہو ہر حالت میں وہ ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بچے میں اپنی خیالی تصویروں کو عملی صورت میں لانے کا شوق بے پناہ ہوتا ہے۔ اس کے اس شوق کو اگر پوری جولانی کے مواقع میسر آجائیں تو یقیناً وہ اپنی زندگی کو زیادہ قابل قدر بنا سکے گا۔

۳- احساس جمال۔ اپنے ہاتھ سے پیدا کردہ اشیاء میں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے انہیں سنوارنے اور بہتر بنانے کا خیال ہر وقت دامن گیر رہتا ہے اس سے اس کا احساس جمال جاگ اٹھتا ہے اور اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

اخلاقی تربیت

۱- اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہ طریق تعلیم۔ احساس دل کی تکمیل کے لئے بڑا کامیاب ہے یہ بچے کو اس امر کا احساس دلاتا ہے کہ کس طرح تقسیم کار۔ امداد باہمی اور متحدہ کوشش ہر شعبۂ زندگی میں موثر لائحہ عمل ہے، اور مجلسی کل میں کس طرح ہر جزو کے لئے دوسرے کی مدد ضروری ہے۔

۲- دستی کام خلوص کو ترقی دیتا ہے، ٹھوس کام کے لئے مکروریا اور دروغ کو چنداں دخل نہیں حقیقت پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی۔ بچے کے اخلاقی پہلو کو جانچنے کے لئے استاد کے سامنے دستی کام سے بہتر کوئی حربہ نہیں۔

۳- دیگر افراد جماعت کے ساتھ مقابلہ یا اپنے سابقہ طریق کار کے ساتھ موازنہ سے بچے میں تساہل پیدا نہیں ہو سکتا، غرور اور نخوت کے پیدا ہونے کے لئے بھی چنداں گنجائش نہیں۔

۴- اچھا کام کرنے کی صورت میں خود اعتمادی حاصل ہوتی ہے، جو زندگی میں مزید کامیابیوں

کے لیے زینہ بن جاتی ہے، کسی سودمند چیز کو وجود میں لانے سے جو اطمینان بچے کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کی آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے، دستی کام جہاں تکبر کو توڑتا، بحران کا صحیح مداوا، منتشر خیالات کو ...

۵۔ جبلی طبیعی ترین دعاوی سے بہت بلند و بالا ہے، عملی کام زبانی جمع خرچ کی بجائے ٹھوس کام کا عادی بناتا ہے، دکھاوے کا کام حقیقی کام نہیں، حقیقی کام وہ ہے جو خاموشی سے دوسروں کی نظروں سے اوجھل با حسن وجوہ انجام دیا جائے۔

اس ضمن میں مسٹر آرک رائیٹ ایک انگریز ماہر نفسیات کے خیالات قابل ذکر ہیں وہ کہتا ہے۔

۱۔ دستی کام اور دماغی ساخت میں ایک یقینی رشتہ ہے

۲۔ دماغی ارتقا کی تکمیل کا دارومدار اعصابی مراکز کے درمیان رشتہ قائم کرنے پر ہے اور دستی کام ان رشتوں کو قائم کرنے میں بڑا معاون ہے۔

۳۔ چار سال سے پندرہ سال کی عمر تک بچے کی قدرتی نشوونما کا واحد ذریعہ دستی کام ہے، اسے تازہ قوتیں عطا کر کے قدرت خود اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔

تعلم بالعمل سے آغاز تعلیم

جس معلم نے بچے کی دلچسپیوں کو بیدار کر کے خود فعلی پیدا کرنے اور قانون ترقی کی آزادانہ نمائش کے بنیادی اصول کو سمجھ لیا، وہ آنکھ کی بجائے زبان پر تعلیم کی بنیاد نہیں رکھے گا، اس کا طریقہ منطقی نہیں نفسیاتی ہوگا، وہ باہر سے اندر کو نہیں اندر سے بیرونی اظہار پر شروع کرے گا، صرف ماحول کو درست کرے گا، ضروری آلات مہیا کر کے نشیب و فراز سے بچا کر صحیح راہ پر لگا دے گا، غیر طریق تعلیم جو وقت سے پہلے شروع کرنے سے بے دلی اور نفرت پیدا کرتا ہے، صحیح وقت پر بچے کی خوشنودی اور دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے، اکثر دیکھا گیا ہے بچہ کھیل کود تقلید سے شروع کرتا ہے، پھر کوئی سودمند چیز وجود میں لانا چاہتا ہے، ہمیں اسے تمام جائز خواہشات پورا کرنے کا موقع دینا چاہیے، بچے کو اجازت دیجیے کہ اس کا تخیل اپنے مقاصد کو سامنے لائے اور پھر ان کے حصول کے وسائل پیدا کرے۔ آٹھ یا دس سال کی عمر تک اسے جستجو کرنے دیجیے اور مشکلات سے دست و گریباں ہونے کے مواقع فراہم کیجیے، تجربہ اسے سکھا دے گا

کہ کیا ممکن اور کیا ناممکن ہے۔ باہر سے ایک طریقہ بچے کے سر ٹھونس دینے کا یہ مطلب ہے کہ بچے میں ہم قوتِ تصور، غور و فکر اور قوتِ استدلال فرض کر لیتے ہیں جو ابھی اس میں موجود نہیں، اور صرف تجربات سے حاصل ہوں گے، بہت کم بالغ ایسے ہیں جو اپنی غور و تامل عقل سے کسی اصول کو استعمال کر سکتے ہیں، ہمارے جیسے سن رسیدہ لوگوں سے ایسی توقع کرنی ممکن نہیں تو پھر کم سن بچوں سے ایسی امید کیوں کر کی جا سکتی ہے؟ ایسا کرنے سے ہم کند ذہن بچوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں راہِ صواب یہ ہے کہ بچے کو پورا موقع دیجئے کہ اصول و فروع خود وضع کرے، ایسا کرنے سے وہ ان کی اصلیت اور حقیقت سے پورا واقف ہوگا اور اُن کے استعمال سے کما حقہٗ آگاہ۔

کیا بچوں کو استاد کی رہنمائی کی ضرورت نہیں؟ جو جی میں آئے کرتے رہیں، نہیں یہ دوسری حد ہے، اگر استاد میں جوہرِ قابل موجود ہے تو وہ ان کے ذوقِ تجسس کو پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، وہ ان کے سامنے اپنی ذاتی مثال پیش کرے گا، ان کے لئے سازگار ماحول پیدا کرکے اپنی ذاتی محنت کی طرف مائل کرے گا۔

عملی سلسلے میں کن مشاغل پر زور دیا جائے

ان کا انتخاب مقامی حالات پر چھوڑا جائے، استاد کی ذاتی قابلیت اور مقامی مخصوص دستکاری اس ضمن میں راہ دکھا سکتی ہے، بہت کچھ خام اشیا کے مہیا ہونے پر موقوف ہے، مثلاً سیالکوٹ میں کشمیر کی لکڑی کی بہم رسانی سے کھیلوں کے سامان کی دستکاری زوروں پر ہے، وزیرآباد اور گوجرانوالہ میں آہنگر خاندانوں کی وجہ سے لوہے اور پیتل کی اشیا تیار ہوتی ہیں، ملتان میں چکنی مٹی دستیاب ہونے سے مٹی کے برتن اچھے بن تے ہیں۔

میڈم مانٹیسوری بچوں کے لئے مٹی کے برتن بنانے کی حامی ہے، وہ بچوں کی جبلت میں کھلونوں سے کھیلنے اور انہیں بنانے میں ایک خاص جذبہ دیکھتی ہے، وہ اسے ماڈل وغیرہ بنانے سے بہتر سمجھتی ہیں، ان سے بچے کے اعصاب عضلی کو ترقی ہوتی ہے، وہ بچوں کے تعمیری شوق کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں، البتہ جہاں ممکن ہو پودے لگانا اور چھوٹے جانور پالنا مفید ثابت ہو سکتے ہیں بہت سے تعلیمی مضامین کو دستی کام سے مدد حاصل ہو سکتی ہے، مثلاً فن تحریر سکھانے کے لئے آزاد ڈرائنگ

ست حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ کینیڈا سوئٹزرلینڈ- آسٹریا نیوزی لینڈ
پیکوسلوویکیہ اور ارجنٹائنا میں مبتدیوں سے آزادانہ اشکال بنانے کی مشق کرائی جاتی ہے اس سے
ان کے پٹھوں کی ورزش ہوتی ہے، باقاعدہ تحریر سیکھنے سے پیشتر یہ تیاری کی منزل آئندہ طریق کار میں
بیش از بیش سہولت کا باعث بنتی ہے، ڈالٹن کا خیال ہے کہ اس سے پہلے کہ بچے کو حروف ذاتی کاوش
سے لکھنے کے لئے کہا جائے، اُسے ان حروف کو ٹریس کرنا سکھانا چاہیئے، تاکہ اس کے پٹھوں میں اُن
حروف کی باقاعدہ حس پیدا ہو جائے۔ میڈم مانٹیسوری داعی ہیں کہ اگر بچوں کو ریگ مال یا گتے کے
کٹے ہوئے حروف پر انگلی پھیرنے کی مشق کرائی جائے تو اس سے ان میں حروف کی شناخت پیدا ہو جاتی ہے
اور جلد ہی وہ انہیں لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں، قصہ مختصر یہ کہ دستی کام تعلیمی مضامین کے لئے بیش قیمت
مدد مہیا کرتا ہے، پسٹالوزی کا خیال ہے کہ جو شکلیں بچے تیار کرتے ہیں، ان میں وہ اپنے رجحانات اور
فطرت کو بے ساختہ واضح کرتے ہیں، ماہرین نفسیات کا یہ بھی کہنا ہے کہ تحت الشعور خیالات کا پتہ بھی
آزادانہ ڈرائنگ سے کیا جا سکتا ہے، اس سے البتہ بہت سی نفسیاتی اور جنسی بیماریوں کا آسانی سے
علاج کر سکتے ہیں۔ ان اشکال سے نونہال بچوں کے چلن کا رُخ بھی معلوم ہو جاتا ہے، کیوں کہ یہ شکلیں
ان کے تخیل اور مذاق کا بے ساختہ مظہر ہوتی ہیں۔ جولیئن کہتا ہے بچے کا صحیح چلن ڈرائنگ میں سب سے
زیادہ ظہور پذیر ہوتا ہے، وہ اپنی فطرت اور رُجحان کے مطابق کام کرنا اور خوبصورت چیزیں بنانا چاہتا
ہے، وہ ایک آزاد جذبے کے تحت شکلیں کھینچتا ہے اور جو کچھ بناتا ہے اس سے لطف اندوز ہوتا ہے
اور اطمینان قلب حاصل کرتا ہے، معلم صرف ایک شاہد ہے اور کبھی کبھی راہبر، طالب علم اپنی مرضی سے اپنے ذاتی
اپنے رجحان- طاقت اور فطرت کے مطابق کام کرتا ہے، نقاشی بھی ڈرائنگ کی طرح مفید ہو سکتی ہے۔ یہ
طریق کار محض طفلانہ کھیل نہیں، بارہ برس کی عمر تک چیزوں کا بغور مشاہدہ۔ ان کی اشکال کھینچنا اور ان کے
مٹی وغیرہ کے ماڈل تیار کرنا، تصور اور تخیل کے ارتقا میں بہت مدد دیتے ہیں، فرض کیجئے بچے پرانے
زمانے کے گاؤں کا نمونہ تیار کرتے ہیں، وہ یقیناً گاؤں کے فن تعمیر اور گاؤں کے رہنے والوں کے اخلاق و
اطوار بود و باش کے متعلق سوچیں گے، اور اُن اسلاف کی زندگی کا موازنہ اپنی زندگی سے کریں گے

"۱۹۰۸ء میں لندن کی نمائش میں میں نے نپولین کروسو کی زندگی کے واقعات۔ لکڑی۔ مٹی ریت اور کاغذ گتے کی مدد سے واضح اشکال میں دیکھے، مجھے خیال پیدا ہوا کہ جن بچوں نے اس کام کی انجام دہی میں حصہ لیا ہوگا، انہیں دوران کار میں ذہنی اور دلی خوشی محسوس ہوتی ہوگی۔"

بڑے بچوں کے لئے تاریخ و ادب کی تعلیم میں ڈرامہ مفید ثابت ہو سکتا ہے تیار ڈرامہ انہیں اسٹیج پر دکھانے میں چنداں فائدہ نہیں حقیقی فائدہ کی صورت یہ ہے کہ زمانہ سلف کی کسی بڑی شخصیت کی زندگی کے واقعات وہ خود ایک کھیل کی صورت میں پیش کریں، خود ہی اس زمانہ کے لباس مہیا کرنے کی کوشش کریں، وہ منظر تیار کریں گویا اپنی ہی کوششوں سے اس گزرے ہوئے زمانہ کو حیات تازہ سے آشنا کریں، جب بھی بچے ایسا کارنامہ ذاتی کاوش سے انجام دیتے ہیں، پیش کردہ زمانے کی تاریخ اور ادب میں بے حد دلچسپی محسوس کرتے ہیں، اگر یہ تمثیل کسی بڑے پایہ کے مصنف کا شاہکار ہو تو ادبی لحاظ سے مفید تو ضرور ہو سکتا ہے مگر بہتر یہی ہوگا کہ اساتذہ اور تلامذہ مل کر اسے تیار کریں، کہانی اور اس کے اجزا کسی حد تک معلم کی راہ نمائی کے مرہون منت ہیں، مگر اس کے کردار طلبا کے تخیل کی تخلیق ہوں، استاد کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ ڈرامہ زندگی کو صحیح رنگ میں پیش کرتا ہے اور ادبی اغلاط سے پاک ہے، اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ہر معلم میں یہ قابلیت نہیں ہوتی، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر ثانوی مدرسے میں ایسے اساتذہ موجود ہوتے ہیں کہ اگر انہیں روزمرہ کی گوناں گوں مصروفیتوں سے کچھ فرصت دی جائے تو وہ بہت شوق سے اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں، ایسے ڈرامے پیش کرنے سے مراد کوئی شاہکار پیش کرنا نہیں ہوتا۔ صرف مذاق سلیم کے مظاہرے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر بچوں میں دلچسپی اور دلی خوشی پیدا ہو جائے تو مقصد پورا ہو جاتا ہے، اسکول میں ایسے مشاغل کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے بے روح اور بے کیف مردہ اوراق تاریخ کی بجائے زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی جائیں، جنہیں زندگی بخشنے میں انہیں بھی دخل ہو۔

بہت چھوٹی عمر میں سطح کے نقشوں اور گڑیوں کے کھلونوں سے شروع کر کے درمیانی عمر میں پکانے بُننے اور اسی طرح کی ابتدائی صنعتوں کے تجربے کرتے ہوئے بڑے بچوں کو ڈرامہ نویسی اور

ف آلات کے تیار کرنے میں معلم کو رہنمائی کرنی چاہیے۔ ہر حالت میں استاد کو ایک بات نہیں بھولنی چاہیے
ر منزل پر وہ اجتماعی کام کی اہمیت کو فراموش نہ کرے، اور بچوں کے دل و دماغ میں باہمی تعاون کے نقد درس
نتائج نقش کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہے، کیونکہ زندگی کی کش مکش میں یہ درس ان کا حقیقی مونس
ار ہوگا، جب وہ خود دوسروں کی جانب ہمدردی کا ہاتھ بڑھائیں گے، دیگر افراد جماعت بھی ان کے ساتھ
سلوک کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

موجودہ درسی کمروں میں اور آرائشی سامان کی موجودگی میں جو کتابی تعلیم کے لئے بنائے گئے ہیں، ہم
ی کام نہیں کرسکتے، عملی مدرسے، کلاس روم ورک شاپ، قائم کرتے ہیں، بڑے بڑے تختوں کے ڈیسک
ر میز بنائے جاتے ہیں، دیواروں کے ساتھ اوزاروں کے لئے الماریاں مہیا کی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی
اختہ اشیاء کے رکھنے کی جگہ بھی تیار کی جاتی ہے، غرض کچھ اس قسم کا زندہ ماحول تیار کیا جاتا ہے جس میں
بچے دلی خوشی سے کام کرنے میں راحت محسوس کرتے ہیں، اس میں مردہ اور بے حس دیواروں کے سامنے
کھڑے ہو کر تقریر کرنے والے اساتذہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں، زبانی تعلیم اور غور و فکر کے اوقات میں ہی
کرے خاموش اور پاکیزہ سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

ٹیکنیکی نقطہ نظر سے دستی کام کے متعلق دو باتیں ضرور ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں، پہلے یہ کہ بچہ خود بخود
اس کام کی طرف مائل ہو، اگر بچے کا ذاتی رجحان اس طرف نہیں ہوگا تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا
اور اس کی بے ساختہ قوت تخلیق کے اظہار میں بہت دیر ہو جائے گی یا اس کی وہ قوت بالکل فنا ہو جائے گی
دوسرے یہ کہ اس دستی کام کا مقصد پیشہ ورانہ نہ ہو۔ ابتدائی مدرسے میں روٹی کمانے کا خیال بچے سے
بہت دور رہنا چاہئے، اس تنگ مادی نظریے سے وہ روحانی مقصد فوت ہو جاتا ہے جو تعلیمی اداروں
کے پیش نظر رہنا ضروری ہے، ابتدائی تعلیم میں ایک کسب معاش کا فکر بہت حد تک نقصان دہ ہے۔
نیچی نگاہیں بلندیوں کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اگر افلاس کی وجہ سے ایک بدنصیب بچہ اسکول میں کسب معاش
کے وسائل کی تلاش پر مجبور ہے تو پھر بھی اسے کوشش کرنی چاہئے کہ مدرسہ میں اسے کچھ چین نصیب ہو
جہاں راحت بخش مشاغل میں وہ دنیا کی الجھنوں کو کچھ وقت کے لئے فراموش کر دے، جہاں اس کو

فطری جستجو کی پرورش ہو سکے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے، آیا اسکول کے احاطہ میں آئندہ زندگی کے پیشے کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے؟
کیا بچے کے انفرادی دستی مشاغل اس کے فطری رجحان کا پتہ نہیں دیتے؟ کیا اس کے پیشے کا انتخاب
اس کی ابتدائی دلچسپیوں سے نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ بہتر ہوگا کہ چودہ سال کی عمر تک پیشہ ورانہ خیال
تعلیم نہ ہو لیکن اس اہم زندگی کے مسئلے کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اکثر طالب علم ایسے بھی ہوتے
ہیں کہ ان کے صحیح مذاق اور ان کی صحیح قابلیت کا اندازہ ان کے دستی کام سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے
اس کے پیشے کا انتخاب کرتے ہوئے روسو کہتا ہے کہ ہمیشہ معزز اور سود مند ہو، اس کے انتخاب میں ہما
راہبر روح ہونی چاہئے، جب ہم بچے کی جستجو کو اس کے اپنے قدرتی اور فطری راستے پر چلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے
ہیں تو بچے کے مذاق اور رجحان کا مطالعہ کرنے کا ہمیں کافی موقع مل جاتا ہے، اور ہم اچھی طرح دیکھ سکتے
ہیں کہ اس میں جوہر قابل موجود ہے یا نہیں، صحیح مذاق کا اندازہ ہم ہنگامی اور وقتی حالات سے نہیں لگا سکتے
ایک ہنگامی اثر کو مستقل جوہر نہیں سمجھ لینا چاہئے، محض تقلید کو صحیح قابلیت سمجھ لینے کی غلطی نہیں کرنا
چاہئے، دنیا ایسے کاریگروں اور دستکاروں سے بھری پڑی ہے، جن میں حقیقی قابلیت کا شائبہ تک
نہیں اور انہوں نے موجودہ پیشہ محض اس لئے اختیار کیا ہے کہ بچپن میں وہ اس میں ڈال دیئے گئے
کیونکہ بزرگوں نے ان کے لئے یہی بہتر سمجھا، اپنے موجودہ پیشے کی طرح کوئی اور پیشہ بھی ایسی آسانی سے
اختیار کر لیتے، اگر ان کی تکمیل اس طرف موڑ دی جاتی، ایک بچہ فوجی کوس وطبل کا پرشکوہ ہنگامہ
سن کر فوجی افسر بننے کی طرف مائل ہو جاتا ہے، ایک خوبصورت عمارت دیکھ کر معمار بننے کا شوق دل میں
پیدا ہو جاتا ہے، غرض جو منظر بچوں کے لئے وقتی کشش کا موجب بنتا ہے وہ اسے اختیار کر لینا چاہتے ہیں
مگر کسی کام میں وقتی خوشی محسوس کرنے اور پائدار رجحان کے درمیان بڑا فرق ہے بچے کی صحیح
قابلیت اور مذاق کا اندازہ لگانے کے لئے بہت غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کی ہنگامی
دلچسپیاں اس کے صحیح مذاق اور قابلیت سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں، اور ہم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے
اس کی ہنگامی دلچسپیوں کو صحیح مذاق سمجھ لیتے ہیں، اس ضمن میں روسو نفسیاتی امتحانات پر زور دیتا ہے،

یں چاہتا ہوں کہ کوئی سمجھدار انسان ہمیں بچوں کے سمجھنے کا علم سکھائے، یہ علم بہت ہی مفید
اساتذہ ابھی اس کے مبادیات ہی جانتے ہیں۔"
بچہ اپنے دستی مشاغل کے ذریعہ اُس مذاق کا اظہار کرتا ہے جو اس کے پیشے کے انتخاب میں مدد
کتا ہے، وہ اپنے والدین اور معلّمین کو صاف صاف بتا دیتا ہے کہ وہ کس میدان کا شاہسوار بن سکتا
اور بنی نوع انسان کی بہترین خدمت کس طرح بجا لا سکتا ہے، یہی طریقہ ہے جس سے وہ اپنی
دنیا کی خوشی میں اضافہ کر سکتا ہے۔
جولیئن کا خیال ہے کہ کسی فن یا پیشہ کے اختیار کرتے وقت نوجوانوں کو چاہیئے کہ اس کا تعلّق
انیت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرے، پھر فیصلہ کرے کہ اپنی قوت اور صلاحیتوں کو اپنی اور سوسائٹی
بہتری کے لئے کیسے استعمال میں لا سکتا ہے، یہ معاشیات کے سلجھاؤ کا راز ہے اور دنیا کے امن۔
قوموں کے استحکام، اور فرد کی راحت کے لئے بہت ضروری ہے۔
ہر انسان سے وہاں کام لو جہاں وہ اپنی قابلیتوں کو بہترین طریقے سے استعمال کر سکے، بالفاظ دیگر
صحیح آدمی صحیح جگہ" ایسا شخص تعلیم کے اختتام پر دوسروں سے زیادہ خوش، بہتر کاریگر، ذہین، محنتی
قابل اور ایمان دار ہوگا۔

ہومرلین اور اس کی تعلیمی خدمات

قسط نمبر ۲

انتصار مہدی

ہومرلین کے تجربات

ذیل میں چند دلچسپ واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔ ان واقعات سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ بگڑے ہوئے بچوں کی اصلاح میں ہومرلین کو کتنا کمال حاصل تھا مگر یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ محض ان مثالوں کے بل بوتے پر کسی بے راہ رو بچے کی اصلاح ویسی ہی خطرناک ہوگی جیسے کسی طبیب کے چند نسخے رٹ کر طبیب بن جانا، ان مثالوں میں جا بجا بچوں کی آزادی کا ذکر آئے گا، اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ بچہ شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے بچہ ایک مسافر ہے اور والدین یا استاد راہبر۔ اس کی منزل شخصیت کی تکمیل ہے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ راہ کافی پیچیدہ اور دشوار ہے راہبر کا فرض ہے کہ راستہ کی پیچیدگیوں کو اس طرح سمجھائے کہ راہ کا ایک ایک پیچ و خم پورے طور سے ذہن نشین ہو جائے، ساتھ ہی ساتھ اس انداز سے سمجھائے کہ راستہ کی دشواریاں مسافر کی ہمت پست نہ کر دیں۔ اگر زندگی کی شاہ راہ سے اسے پوری واقفیت نہ ہوگی تو مسافر کے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ اور اگر ان دشواریوں سے مسافر ہمت ہار گیا تو پیچھے کی طرف پلٹ پڑنے کا اندیشہ ہے، دونوں کا نتیجہ ایک ہے، اور اسی کو قانون کی زبان میں جرم اور شریعت کی اصطلاح میں گناہ کہتے ہیں۔

آگ اور بچہ

اس بچی کا تعلق ایک خوش حال خاندان سے تھا، عمر بھی کوئی سات سال کے لگ بھگ اس کی طبیعت میں ایک انوکھی لگن پیدا ہو گئی، اور ہر وقت وہ آگ سے کھیلنے کے لئے

ن رہنے لگی، والدین کو ایسی (ELGTE) کے جل مرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ بچی کو آگ سے دور رکھنے
کی کوشش ہونے لگی، نگرانی نے آگ پر تیل کا کام کیا، آخر والدین نے مجبور ہو کر سزا کا سہارا لیا۔ مگر
سے مرض کی شدت میں اور اضافہ ہوتا گیا اور سزا کی شدت کے ساتھ ساتھ آگ سے کھیلنے کی لگن بھی بڑھتی
گئی۔ اب آگ کا شوق جنون کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ سوتے جاگتے دیا سلائی کی تلاش اور اپنا شوق پورا
کرنے کے لئے موقع کی جستجو۔ اس سے کچھ ایسی ناگوار حالت پیدا ہو گئی کہ اب صرف لڑکی کی جان ہی کا سوال
نہ تھا بلکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر کسی دن بچی کو اپنا شوق پورا کرنے کا موقع مل گیا تو سارا گھر راکھ کا ڈھیر
ہو جائے گا۔ والدین سخت گھبرا گئے، آخر تنگ آکر ہومرلین کی طرف رجوع کیا، ہومرلین نے تمام
حالات معلوم کرنے کے بعد پورے وثوق کے ساتھ یہ مشورہ دیا کہ لڑکی کو کوئی غیر آتش گیر لباس پہنا دیا
جائے، اور تقریباً ایک درجن دیا سلائی کی ڈبیاں اور چند دوسرے کھلونے دے کر تنہا چھوڑ دیا جائے
والدین نے ایسا ہی کیا، دیا سلائی پر نظر پڑتے ہی لڑکی نے کروٹیں بدلنا شروع کر دیں مگر جب ماں
یہ کہہ کر چلی گئی کہ دل کھول کر اپنا شوق پورا کر لو۔ تم بالکل آزاد ہو تو کھلی آزادی مل جانے سے بچی کے
دل میں وہ جنون تو باقی نہ رہا، پھر بھی جلد جلد یکے بعد دیگرے چند تیلیاں جلائیں، جب دیکھا کہ اس
کھیل میں نہ کوئی انوکھاپن ہے اور نہ کوئی دلچسپی تو دوسرے کھلونوں میں مشغول ہو گئی، اس طرح
آگ کے جنون سے ہمیشہ کے لئے نجات پا گئی۔

ہومرلین کو اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی پیش آیا، ایک چھ سالہ لڑکے کو آگ سے دلچسپی پیدا
ہو گئی، سُرخ سُرخ انگارے اور لہراتے ہوئے شعلے اس کی توجہ کا مرکز بن گئے، بچے کی ماں وہمی
واقع ہوئی تھی اسے یہ وہم ہو گیا کہ اگر بچہ تنہا چھوڑ دیا گیا تو جل کر جان دے دے گا، نتیجہ یہ ہوا
کہ ماں کسی وقت بچے کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی، یہ صورتِ حال ایک طرف
ماں کے لئے مصیبت تھی تو دوسری طرف بچہ کے لئے قید کا سامان، اصل میں بچے سے زیادہ ماں کا علاج
ضروری تھا مگر بغیر بچے کی اصلاح کے ماں کا وہم کبھی دور نہیں ہو سکتا تھا، ادھر بچے پر چونکہ سخت
پابندیاں عاید تھیں، اس لئے آگ کی خواہش میں شدت پیدا ہوتی گئی، ہومرلین کی امداد طلب کی گئی

تو وہ خود بچے کے گھر پہونچا، اور انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر بچے کے ساتھ کھیلنے لگا، اسی دوران میں ایک سرخ سرخ انگارا نیچے گرا، بچہ فوراً انگارے کی طرف جھپٹا، مگر اس سے پہلے کہ بچے کا ہاتھ انگارے تک پہونچے ہومرلین نے پھرتی سے اپنا ہاتھ انگارے پر رکھ دیا، انگلی پر ایک چھوٹا سا آبلہ نمودار ہوگیا ہومرلین ہاتھ پکڑ کر درد سے چیخنے لگا، بچہ بڑی دل چسپی سے کچھ دیر تک ہومرلین کی حالت اور ہاتھ کا چھالا دیکھتا رہا، پھر بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ انگارے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، ہاتھ کا انگارے سے لگنا تھا کہ ایک معمولی سا چھالا پڑ گیا اور بچہ بھی درد سے چیخنے لگا، اب بچے کو ایک ساتھ آگ کے دو تجربے ہو چکے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ چھے برس کی سخت سے سخت پابندیاں جو کام نہ کر سکیں وہ اس ایک معمولی سے واقعہ سے انجام پا گیا اور بچہ ہمیشہ کے لئے آگ سے محتاط ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آگ سے بچے کو دل چسپی پیدا ہی کیوں ہوتی ہے، بات بالکل سیدھی سادھی ہے، آگ کی گرمی سردیوں میں آرام دہ ہوتی ہے، اس کی روشنی مونس تنہائی ہے، آگ کا رنگ نظر فریب ہے اور ناچتے لہراتے ہوئے شعلے جاذب توجہ ہیں، دوسری چیزوں کے چھونے اور ان پر قابو پانے سے بچے کو روکا نہیں جاتا تو آگ جیسی دل فریب چیز کو بچہ کیوں نہ اپنانے کی کوشش کرے لہٰذا بچہ فطری طور سے آگ کو چھونے اور اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے، اب بچے کی تعلیم و تربیت ماں کے صحیح یا غلط طرز عمل پر موقوف ہے، ماں اگر صحیح راہبر ہوتی ہے تو بچے کو آگ کی خاصیت سمجھنے کا موقع بہم پہونچاتی ہے، جب بچہ آگ کی طرف بڑھتا ہے تو ماں آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ آگ کے قریب سے قریب تر لے جاتی ہے، یہاں تک گرمی ناقابل برداشت ہو جائے اور جلنے کی سی کیفیت پیدا ہو جائے، بچہ درد سے چیخنے لگتا ہے تو ماں اس کا ہاتھ چھوڑ دیتی ہے، اب بچے کو پورے طور معلوم ہو گیا کہ آگ دور سے تو ضرور دیدہ زیب ہے۔ مگر قریب سے سخت تکلیف دہ ہے اچوں کہ بچے کا تجربہ مکمل ہو چکا ہے، اس لئے آگ کے قریب جانے میں اب اس کے لئے کوئی دل چسپی نہیں رہی لہٰذا اب صرف اسی ایک تجربہ پر اکتفا نہیں کرے گا۔ بلکہ دوسرا نیا تجربہ شروع کر دے گا۔ لیکن بدقسمتی اگر بچے کو ماں ایسی ملی ہے جو بچے کی فطرت سے بے خبر ہے تو آگ کی طرف بچہ کے بڑھتے ہوئے ہا

نیچ لیتی ہے، بچہ اگر ضد کرتا ہے تو سزا دیتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے تجربات کی راہ پر آگے بڑھنے کی
ے بچہ راستے کے گھاؤ پھراؤ میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے، اور اس کی تمام تر توجہ صرف اسی ایک تجربہ کی
ل پر مرکوز ہوتی ہے جس قدر سختی بڑھتی ہے اسی قدر آگ میں اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک
دن اسے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع مل ہی جاتا ہے، اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلتا ہے، بچہ
ف خود ہی نہیں جل مرتا بلکہ اکثر حالات میں سارا گھر پھونک دیتا ہے، اگر خوش قسمتی سے جل جلا کر
چے کی جان بچ بھی جاتی ہے تو سخت ڈرپوک ہو جاتا ہے، بچے کو اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہتا جب
ل پاس نہیں ہوتی تو اسے یہی خطرہ دامن گیر رہتا ہے کہ کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائے، جس طرح
ل کی عدم موجودگی میں ہی تو وہ آگ کا شکار بن چکا ہے، یہ احساس پستی بچے کو ہمیشہ کے لئے ناکارہ
ا دیتا ہے اور آگے چل کر وہ اپنی زندگی میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

تمباکو نوشی اور بچہ

بعض بچوں کو چھوٹی عمر میں سگریٹ اور حقہ پینے کی بری عادت پڑ جاتی ہے، یہ بات بات پر قسمیں کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں، آگ سے جمالیاتی ذوق پورا ہو جاتا ہے
اور مٹھائی سے زبان کا چٹخارہ حاصل ہوتا ہے، مگر تمباکو نوشی میں نہ کسی جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے
اور نہ کسی جسمانی خواہش کی تکمیل، بلکہ شروع شروع میں سخت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے، کھانستے کھانستے
آنتیں الجھ جاتی ہیں، سر چکرانے لگتا ہے اور طبیعت بے کیف ہو جاتی ہے، پھر حیرت ہوتی ہے کہ آخر بچے کو
تمباکو نوشی کا شوق کیوں پیدا ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب بدقسمتی سے بچہ ایسے ماحول میں پھنس
جاتا ہے جہاں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بات بات پر اسے جھڑکا جاتا ہے اور ہر فعل پر اسے سزا
ملتی ہے تو وہ لازمی طور سے اس عذاب سے نجات پانے کے لئے آزادی اور خود مختاری حاصل کرنا
چاہتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ بڑی عمر کے افراد پر نہ سختیاں ہوتی ہیں نہ بات بات پر انہیں جھڑکا جاتا ہے
وہ اپنے کاروبار میں آزاد ہیں۔ اور ہر شخص ان کا لحاظ کرتا ہے، بچہ بھی اسی قسم کے طرز عمل اور آزادی کا
خواہش مند ہوتا ہے، اپنی عمر تو وہ فوراً بڑھا نہیں سکتا، لہٰذا آزادی اور عزت کے اشتیاق میں بڑوں کی
نقل اتارنا شروع کر دیتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ بڑے حقہ اور سگریٹ پیتے ہیں، دوران کلام میں قسمیں کھاتے

ہیں۔ لہٰذا وہ بھی بات بات پر قسمیں کھاتا ہے اور تمباکو نوشی شروع کر دیتا ہے، اب اگر اس بری عادت کو لڑکپن کے لئے سزا دی جاتی ہے تو عادت اور پختہ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عادت سزا ہی کا ردِ عمل ہے لہٰذا جتنی سزا بڑھتی جائے گی اسی قدر بچہ کا شوق ترقی پذیر ہوگا۔ اگر والدین یا اساتذہ میں سے بچے کو کسی ایک پر ہی بھروسہ ہو یعنی جس نے بچہ کو کبھی سزا نہ دی ہو اور اسے حقیر نہ سمجھا ہو تو اس کا صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ بچوں کے لئے تمباکو مضر ہے، بچہ قطعاً اس عادت کو ترک کر دے گا، لیکن بدقسمتی سے اگر بچے کے گرد و پیش کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر بچہ کو مکمل بھروسہ ہو تو اس عادتِ بد کا چھوٹنا دشوار ہے۔

طاقت کا غلط تصور

جلین (GASANE) سولہ برس کا نوجوان تھا، نقب زنی کی سنگین واردات میں گرفتار ہوا اور مجسٹریٹ کی عدالت سے اصلاح کے لئے بچوں کی دولت مشترکہ میں بھیج دیا گیا۔ گٹھا ہوا جسم مضبوط ہاتھ پاؤں۔ مگر سماج کے لئے مستقل عذاب اور پولیس کے لئے دردِ سر۔ اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر اکھاڑوں میں خاصا نام پیدا کر چکا تھا۔ وحشیانہ طاقت آزمائی کو سرمایۂ فخر سمجھتا تھا اور تہذیب و تمدن کی تمام نشانیوں سے متنفر تھا۔ ٹائی باندھنا یا اپنے جوتے صاف رکھنا نسائیت تصور کرتا تھا، اور صاف ستھرے اچھے کپڑے اور خوبصورت برتن نزاکت کی نشانی سمجھتا تھا۔ یہ دولت مشترکہ کا ابتدائی دور تھا، یہاں کی فضا جلین کو پسند نہ آئی، بار بار بھاگ نکلا مگر ہر بار گرفتار ہو کر پھر دولت مشترکہ میں واپس آ گیا، ہومر لین نے اس کو فرحت گیری اور معماری کی طرف بار بار متوجہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کاموں کو وہ اپنی طاقت اور قوت کی توہین سمجھتا تھا، اپنے اخراجات کے لئے ایسے چھوٹے چھوٹے سخت کام کر لیا کرتا تھا جن کے لئے طاقت آزمائی کی ضرورت ہوتی تھی اس کی وحشت اور طاقت آزمائی سے مرعوب ہو کر اس کے کچھ ساتھی بھی پیدا ہو گئے تھے، آگے چل کر وہ اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ دولت مشترکہ کے قوانین توڑنے میں فخر محسوس کرنے لگا، مجبوراً یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ جلین بچوں کی دولت مشترکہ کے بس کا نہیں ہے، اس کا اصلی مقام جیل ہے، مگر فطرتاً لڑکا رحم دل تھا چھوٹے بچوں اور حیوانوں کے ساتھ اس کا سلوک بڑا رحم دلانہ تھا، اس کی وحشت اصل میں ایک

ل تھا جلین نے حالات سے مجبور ہو کر یہ خول پہن لیا تھا جس سے اس کی اصلی شخصیت چھپ گئی تھی
س خول کو توڑنے کی ضرورت تھی، تاکہ اس کی اصلی شخصیت عریاں ہو جائے۔ آخر ایک دن ایسا موقع
اہی گیا کہ جلین کا مصنوعی خول چور چور ہو گیا۔

چائے کی میز کے گرد دولت مشترکہ کے شہری (ادارہ کے طالب علم) بیٹھے ہوئے ہیں، ایک سرے پر
جلین اور ہومرلین پہلو بہ پہلو بیٹھے ہیں۔ جلین سخت رنجیدہ اور اکتایا ہوا نظر آتا ہے، اگلے دن بھاگ نکلنے کی
ایک اور کوشش ناکام ہو چکی ہے، یکایک ہومرلین جلین کی طرف متوجہ ہو کر بولا:۔

"کیوں جلین کیا بات ہے؟ اتنے سست کیوں ہو؟ یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے
اور اگر بھاگ بھی جاتے ہو تو پھر گرفتار ہو جاتے ہو، اور یہاں کا ماحول تمھیں پسند نہیں اس لئے پریشان رہتے
ہو، مگر یہ مردوں کی شان نہیں، مرد ناسازگار حالات سے کبھی گھبراتے نہیں، بلکہ حالات کو اپنے منشا کے
مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، تم تو ماشا، اللہ یہاں بااثر بھی ہو، تمہارے کچھ ساتھی بھی
ہیں، آئندہ انتخاب میں اپنے ساتھیوں کو منظم کر کے دولت مشترکہ کی حکومت پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتے
تاکہ یہاں کی فضا اپنے مزاج کے مطابق ڈھال سکو۔"

جلین نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد آمادگی کا اظہار کیا تو ہومرلین نے ایک اور سوال پوچھا۔
"یہ بتاؤ کہ تمہارا پہلا اصلاحی قدم کیا ہو گا؟"

اس سوال پر پہلے تو جلین گھبرا گیا اور کوئی مناسب جواب سمجھ میں نہ آیا، ادھر ادھر دیکھنے کے بعد
جب اس کی نظر اپنے سامنے پڑی ہوئی چائے کی پیالی پر پڑی تو فوراً چیخ اٹھا "میں سب سے پہلے ان نزاکت کی
نشانیوں کو چور چور کر ڈالوں گا، یہ عورتوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔"

ہومرلین نے فوراً آگ کریدنے کا لوہا اس کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا:۔ "یہ لو اور ابھی اپنا
شوق پورا کر لو۔"

لوہا ایک بار اوپر سے نیچے آیا اور پیالی چور چور ہو گئی، اسی طرح دوسری اور تیسری، مگر جب چوتھی مرتبہ
ہومرلین نے اس کے سامنے ایک پلیٹ بڑھا دی تو اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے

آثار ظاہر ہونے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سخت مشکل میں پھنس گیا ہے اور اس مشکل سے بچنے کے لئے سہارا تلاش کر رہا ہے۔ مگر مجبور تھا کرتا کیا۔ پلیٹ توڑ ڈالی۔ مگر اب نہ وہ پہلا سا جوش تھا نہ پہلی سی پھرتی بلکہ ضرب ہلکی اور سست ہو گئی تھی، اس موقع پر اس کے ساتھی اس کے کام آئے اور انہوں نے جبین کو پکڑ لیا۔ جبین اس مشکل سے تو نجات پا چکا تھا۔ مگر کام ادھورا تھا، لہذا ہومرلین نے آگے بڑھ کر اپنی گھڑی جبین کے ہاتھ میں دے دی مگر اب اس کی وحشت ختم ہو چکی تھی، ہومرلین نے بہت کچھ ابھارا۔ اکسایا اور نرم نرم تھپکیاں دیں مگر جبین گھڑی نہ توڑ سکا۔ بلکہ توڑنے کی بجائے گھڑی میز پر رکھ دی۔

دوسرے دن جبین از خود بڑھئی خانہ پہونچا اور کام سیکھنے کی خواہش کی۔ اب نہ اس کے چہرے پر خشونت تھی نہ وحشت بلکہ اپنی حرکت پر وہ آپ پشیمان نظر آتا تھا، اپنی کمائی سے توڑی ہوئی چیزوں کی قیمت بھی ادا کر دی اور آگے چل کر بدمعاش جبین معاشرے کا بہترین فرد ثابت ہوا۔

سوچنا پڑتا ہے کہ آخر جبین میں یہ وحشت اور بے جا اظہار طاقت کا مرض پیدا کیسے ہوا؟ اور صرف چند منٹ میں برسوں کا پرانا مرض زائل کیسے ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بچہ کبھی پُر سکون نہیں رہ سکتا، ہر وقت وہ نئے نئے تجربات کرتا ہے۔ اور نئی نئی معلومات حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے۔۔۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے، بچے کی یہ حرکات اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے ہوتی ہیں، لیکن جب ان حرکات کی راہ میں کوئی دیوار حائل ہو جاتی ہے تو نتیجہ وہی ہوتا ہے جو پوری طاقت سے پھینکی ہوئی گیند کی راہ میں کسی دیوار کے آجانے سے ظاہر ہوتا ہے، کسی کے ہاتھ سے جو طاقت گیند نے حاصل کی ہے وہ دیوار سے ٹکرانے کے بعد فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی طاقت سے گیند پیچھے کی طرف پلٹ پڑتی ہے۔ جبین کے ساتھ بھی بچپن میں کچھ ایسا ہی المیہ پیش آیا تھا، اس کے افعال اور حرکات کی راہ میں سزا اور سختی کی ٹھوس دیوار حائل کر دی گئی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حرکات اچھائی کے رُخ سے برائی کی طرف مڑ گئیں، یعنی اس کی وہ طاقت جو شخصیت کی تکمیل کے لئے صرف ہو رہی تھی اب شخصیت کی تخریب پر صرف ہونے لگی، جو دیوار اس کی راہ میں حائل تھی اسے وہ چور چور کر دینا چاہتا تھا، مگر اس میں اتنی طاقت نہ تھی لہذا لاف زنی پر اُتر آیا۔ اور چونکہ اس کا مقصد طاقت و اقتدار سے ہی حاصل ہو سکتا تھا، محض اظہار طاقت کو اس نے اپنا مطمح نظر بنا لیا۔ اب

اس کے افعال اور حرکات کا مقصد نئے تجربات اور معلومات حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ہر اس چیز کی تباہی اور بربادی تھی جس کی حفاظت کے لئے اس کی راہ میں دیوار حائل کی گئی تھی، لہٰذا وہ توڑ پھوڑ پر اتر آیا تھا، لیکن جب ہومرلین نے مناسب موقع پر یہ دیوار ڈھا دی اور اسے صرف اظہار جذبات کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ پوری ہمت افزائی اور مدد بھی کی تو اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جب چیزوں کے توڑنے پھوڑنے کی اجازت مل جائے تو یہ کام سخت بے مزا ہو جاتا ہے، اب چوں کہ جلین کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لہٰذا اس رکاوٹ کا ردعمل بھی ختم ہو گیا، اب بجائے پیچھے پلٹنے کے اس کی قوت ارادی اسے آگے بڑھا رہی تھی، یہی وجہ ہے کہ جلین اپنی اصلی حالت پر ایک بار پھر پلٹ آیا اور اس کا نفسیاتی مرض زائل ہو گیا۔

آموزش

امیل یا روسو کی تعلیم

—— توقیر مرزا رزقی

مسلسل عن۲

آپ یہ نہ خیال فرما بیٹھیں کہ میں ٹیکہ اندازی ہی کی مخالفت کر رہا ہوں، اس لئے کہ میرے شاگرد کو منتشر
رکھنے کے دلائل آپ کے شاگرد پر بالکل عائد نہیں ہو سکتے ہیں، آپ کی تربیت، جوں ہی آپ کا شاگرد متاثر
ہونے والا ہو اسے سینلا میں مبتلا ہونے سے بچنا نہیں سکھاتی ہے، اگر آپ اسے سینلا میں مبتلا ہو جانے
دیں تو شائد وہ مر ہی جائے گا، میں دیکھتا ہوں کہ مختلف ممالک میں ٹیکہ اندازی کی مخالفت کا نتا سبب حسب فرود
ہوتا ہے اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے پس اسمٰعیل کے متعلق میں اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے تیار نہیں
ہوں، وقت مقام اور حالات کے لحاظ سے جیسی بھی ضرورت ہوگی اسے ٹیکہ لگوا بھی دیا جائے گا اور نہ بھی
لگوایا جائے گا، اس لئے اسمٰعیل کی حد تک یہ معاملہ بالکل غیر اہم ہے پس اگر ٹیکے سے اسے سیتلا نکلے گی
تو اسے یہ معلوم کرنے کا موقع ملے گا کہ توقع کیا رکھنی چاہئے اور یہ بیماری کیسی ہوتی ہے، اور یہ ایک اچھی بات
اور اگر وہ قدرتی طور پر سیتلا سے متاثر ہوگا تو اس کی وجہ سے وہ ڈاکٹروں کی دست درازیوں سے محفوظ رہے
جو اور بھی زیادہ اچھی بات ہے۔

سواری اور تیراکی

ایک طالب علم کی خصوصی تعلیم جو محض عوام پر فوقیت و امتیاز کے لئے دلائی جاتی ہے
ارزاں شعبوں کی بجائے، جو گو زیادہ مفید ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ گراں شعبوں پر
مشتمل ہوتی ہے، چنانچہ خصوصی تعلیم حاصل کرنے والوں کو گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی ہے جو بڑی مہنگی

تی ہے، لیکن تیراکی شاید ہی کسی کو سکھائی جاتی ہے، اس لئے کہ اس میں کوڑی کا بھی خرچ نہیں
تا ہے، اور ایک کاریگر یا دستکار، حد بھی اتنا ہی عمدہ تیر سکتا ہے جتنا کہ کوئی اور۔ ایک مسافر گھوڑے
دار کا امتحان پاس کئے بغیر بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہونا، اس پر جم کر بیٹھنا اور اعلیٰ اغراض کے لئے کافی
بھی طور پر سواری کرنا سیکھ جاتا ہے، لیکن اگر آپ پانی میں تیر نہ سکتے ہوں تو آپ ڈوب ہی جائیں گے
ور تیرنا بغیر سیکھے آتا نہیں، پھر آپ کو موت کا ڈر سواری کے لئے مجبور نہیں کرتا ہے، لیکن ڈوبنے کے
ایک خطرۂ عام سے بچنے کا کسی کو بھی یقین نہیں ہوتا ہے، لہذا پانی میں اسمٰعیل بالکل ایسا ہی بے دھڑک
پھرے گا جیسا کہ وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے، وہ ہر عنصر میں رہنے کے لائق کیوں نہ ہو، پس اگر وہ اڑنا
سیکھ سکے گا تو وہ عقاب بن جائے گا۔ اور اگر گرمی آتش کو برداشت کر سکے گا تو میں اسے آگ کا بھی
کیڑا ہی بنا دوں گا۔

لوگ ڈرتے ہیں کہ تیرنا سیکھتے ہوئے کہیں بچہ ڈوب ہی نہ جائے، اگر سیکھنے کے دوران میں یا اس
وجہ سے کہ اس نے تیرنا نہیں سیکھا ہے وہ ڈوب جائے تو ہر دو صورتوں میں آپ ہی بذات خود
قصوروار ہوں گے، حماقت دراصل ریاکاری اور نمود کا نتیجہ ہوتی ہے، جب ہمیں کوئی نہ دیکھتا ہو
تو ہم سے کوئی حماقت سرزد نہیں ہوتی ہے، ساری دنیا چاہے دیکھا کرے لیکن اسمٰعیل کسی حماقت کا
مرتکب نہ ہوگا، کیونکہ ورزش کا انحصار اس کے خطرات پر نہیں ہوتا ہے، اس لئے اپنے آبائی باغ کے
پہنچتے ہی ہیں اسمٰعیل بلا خوف و خطر ہیلسپانٹ کو تیر کر عبور کرنا سیکھ جائے گا، لیکن اسمٰعیل کو خطرات کا مقابلہ
کرنے کا عادی ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ ان سے خوفزدہ نہ ہونے پائے، جس چیز کا میں نے ابھی
ذکر کیا ہے وہ امیدواری کا جوہر ہے، علاوہ بریں اسمٰعیل کو میں اس کی قوت کے لحاظ سے خطروں میں
ڈالوں گا، اور میں خود بھی اس کا شریک رہوں گا، تاکہ اگر میں اس کی زندگی کی بھی اتنی ہی فکر رکھوں
جتنی کہ میں اپنی زندگی کی رکھتا ہوں تو مجھے اپنی نادانی سے خوفزدہ ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہ رہے گی۔

حواس خمسہ کی تربیت

بچہ آدمی کی نسبت چھوٹا ہوتا ہے، اور گو اس میں آدمی کے برابر عقل تو نہیں
[illegible]

کم ہوتی ہے لیکن اس کا مذاق بہت اعلیٰ ہوتا ہے اور گو خوشبوؤں سے وہ بہت ہی کم متاثر ہوتا ہے
ان میں تمیز اتنی ہی خوبی سے کرتا ہے، ہماری جملہ خاصیتوں میں ہمارے حواس ہی سب سے پہلے
پختگی حاصل کرتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر انہی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

حواس سدھانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ محض انہیں استعمال ہی کیا جائے، بلکہ ان کے
ذریعہ ہمیں چیزوں کو جانچنا اور ان کا اندازہ لگانا سیکھنا ضروری ہے، یا بالفاظ دیگر ہمیں ان کے ذریعہ
محسوس کرنا سیکھنا چاہیئے، اس لئے کہ سننا دیکھنا اور چھونا ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا کہ ہمیں سکھایا
ان حواس کا ایک استعمال محض طبعی اور قدرتی ہوتا ہے جو قوت فیصلہ کو تقویت پہونچائے بغیر
طاقت دیتا ہے۔ تیرنا۔ دوڑنا۔ کودنا۔ اچھلنا۔ لٹو پھرانا اور پتھر پھینکنا یہ سب اچھی باتیں ہیں لیکن
ہاتھ پاؤں کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چیز بھی نہیں ہے، محض طاقت ہی کو روبہ عمل نہ لائیے، بلکہ
اعضا کو جو قوت کی رہنمائی کرتے ہیں کام میں لائیے اور ہر ایک کا بہترین استعمال کیجئے اور ایک عضو
حاصل کردہ تجربے کو دوسرے اعضا کے تجربوں سے جانچئے۔ ناپئے۔ تولئے حساب لگائیے موازنہ
مقابلہ فرمائیے۔ جب تک مدافعت کا اندازہ نہ لگا لیجئے قوت کو استعمال میں نہ لائیے، ذرائع استعمال
کرنے سے پہلے ہی ان کے نتائج کا اندازہ لگا لیجئے، بچے میں زائد از ضرورت کوششوں سے محفوظ
رکھنے کی دلچسپی پیدا کیجئے، اگر آپ اسے اپنے افعال کے نتائج کا اندازہ لگا کر اپنی غلطیوں کی تصحیح
تجربات کے ذریعہ اس طرح کرنا سکھا دیں گے تو کیا یہ امر واضح نہیں ہے کہ وہ جس قدر زیادہ کام
کرے گا اتنا ہی عقل مند ہو جائے گا؟

کسی وزنی چیز کو سرکانے کا معاملہ لیجئے، اگر وہ کوئی لمبا لیور لے گا تو یقیناً اس کی طاقت ضائع
ہوگی اور اگر چھوٹا لے گا تو وہ اپنی پوری قوت استعمال نہ کر سکے گا، صرف تجربہ ہی اس کو یہ سکھا سکتا
کہ کس ناپ کا لیور استعمال کرنا چاہئے، یہ علم اس کی عمر سے بالاتر نہیں ہے، مثال کے طور پر کوئی
بوجھ لیجئے، پس اگر وہ صرف اتنا ہی بوجھ اٹھانا چاہتا ہے جتنا کہ اٹھانے کی اس میں استطاعت
اور اس سے زائد نہیں اٹھانا چاہتا جتنا وہ لے کر چل سکتا ہے تو اس وزن کا اندازہ کیا

ے نہ کرنا چاہئے ؟ کیا وہ جانتا ہے کہ ایک ہی مادہ کی مختلف الجسامت اشیا کا موازنہ کس طرح کیا
، یا ایک ہی جسامت کے مختلف مادوں میں انتخاب کس طرح کیا جائے ؟ پس ان کے مختلف
ن کا اندازہ لگانا سیکھنا اس کے لئے ضروری ہے ، میں نے ایک نہایت تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھا
ں نے بذاتِ خود تجربہ کئے بغیر اس بات کا یقین ہرگز نہ کیا کہ شاہ بلوط کی چپٹیوں سے بھرا ہوا ڈول
ساوی الجثہ پانی بھرے ہوئے ڈول سے ہلکا ہوتا ہے ۔

ہمارے کل حواس مساویانہ طور پر ہمارے قابو میں نہیں ہیں ، ان میں ایک لمس جاگتے وقت
معروف کار رہتا ہے ، وہ ہمارے جسم کی ساری سطح پر پھیلا ہوا ہے ، اور سنتری کی مانند ہمیں ہر اس
ے سے آگاہ کرنے کے لئے جس سے ہمیں نقصان پہونچنے کا احتمال ہو رات دن چوکس کرتا رہتا ہے
ہی نخواہی مسلسل استعمال کے باعث تجربات کے ذریعے سب سے اول ہم اسی کا استعمال کرنا سیکھتے ہیں ۔
ا اس کے لئے ہم کو خصوصی تعلیم کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اندھوں کی
ت حسی ہمارے مقابلہ میں بہت زیادہ قابل وثوق اور لطیف ہوتی ہے ، کیوں کہ بینائی کی رہنمائی سے
دم ہو جانے کی وجہ سے وہ لمس کے ذریعہ ان کاموں کو بھی انجام دینے کے لئے مجبور ہوتے ہیں جن کو
اپنی آنکھوں کے ذریعہ انجام دیتے ہیں ، لہٰذا ان کی طرح اندھیرے میں پھرنا چلنا لمس کے ذریعہ
چاننا اور ارد گرد کی اشیاء کی تمیز کرنا یا مختصراً رات اور اندھیرے میں وہ کام دینا جو وہ بے دیکھے
ن کو انجام دیتے ہیں ہم کو بھی کیوں نہیں سکھایا جاتا ؟ دن کے اجالے میں ہم ان پر سبقت رکھتے
ں لیکن رات کے اندھیرے میں ان کی باری آتی ہے کہ وہ ہماری رہنمائی کریں ، پس اس لحاظ سے
سف وقت ہم بھی اندھے ہی رہتے ہیں کیوں کہ حقیقی اندھے تو اس سے خوب واقف ہوتے ہیں کہ
ن کو کیا کرنا چاہئے ، لیکن ہم اندھیرے میں ایک قدم بھی ہلاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں ، آپ فرماتے
یں کہ ہمارے پاس روشنی ہے ۔ لاحول ولاقوۃ کیا آپ ہر وقت مصنوعی امداد پر بھروسا رکھ سکتے ہیں
، بھلا کس کو یقین ہے کہ بوقت ضرورت وہ روشنی ہمارا ساتھ بھی دے گی ، میں تو چاہتا ہوں کہ ایمیل
کی آنکھ کی روشنی چراغ بتی والے کی دکان میں ہونے کی بجائے خود اس انگلیوں کی نوکوں میں

میں ہونی چاہیئے۔

اگر رات کے وقت آپ کسی عمارت میں بند ہو کر تالی بجائیں تو تالی کی آواز سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ عمارت کشادہ ہے یا تنگ اور یہ کہ آپ بیچوں بیچ کھڑے ہیں یا کسی کنارے پر۔ دیوار سے نصف فٹ فاصلہ کی ہوا کا دوران چوں کہ محدود ہوتا ہے، تالی کی آواز سے ہوا پھٹ کر منتشر ہو جاتی ہے، اور آپ کے چہرے پر بالکل ایک مختلف قسم کا اثر ہوتا ہے۔ آپ خاموشی سے ایک مقام پر کھڑے ہو جائیے اور ادھر ادھر پلٹ کرنہ دیکھئے۔ تو آپ کو ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا۔ یا سانی بتا دے گا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے یا بند ہے۔ اگر آپ کشتی میں سفر کر رہے ہیں تو ہوا کے جھونکے سے جو آپ کے منہ کو لگے گا نہ صرف آپ کو یہ پتہ چل جائے گا کہ آپ کی کشتی کدھر جا رہی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سمندر کی رو آپ کو تیز لے جا رہی ہے یا آہستہ، ایسے مشاہدات و تجربات اور اسی قبیل کے اور بھی بہت سے رات ہی کے وقت مناسب طور پر حاصل ہو سکتے ہیں، دن کے وقت ہم چاہے کتنا ہی غور و خوض کریں ہماری بینائی ان مشاہدات میں کمی اور بیشی کر ہی دیتی ہے، اس لئے ہم صحیح نتیجہ نہیں حاصل کر سکتے ہیں پھر بھی ان مشاہدات میں نہ ہم ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔ نہ لکڑی بغیر کسی شئے کو چھوئے قوت حسی کے ذریعہ کس قدر علم حاصل ہو سکتا ہے۔

میں اسمٰعیل کو اندھیرے میں بہت سے کھیل کھلاؤں گا، یہ مشورہ بادی النظری اہمیت کی نسبت کہیں زیادہ اہم ہے، لوگ اندھیرے سے قدرتاً خوف کھاتے ہیں اور اسی طرح بعض جانور بھی[1] ڈرتے ہیں، ذاتی علم مستقل مزاجی اور دلیری کے باعث چند ہی لوگ اس مصیبت سے آزاد ہوں گے، میں نے ملاکرین۔ دہریوں اور فیلسوفوں کو دیکھا ہے کہ یہ لوگ دن کے وقت تو بڑے بہادر اور جواں مرد ہوتے ہیں لیکن رات کے اندھیرے میں ایک پتے کی کھڑکھڑاہٹ سن کر عورت سے بھی زیادہ کانپتے اور لرزتے ہیں، خوفزدہ ہونے کی بنا آنا کی کہانیوں سے متعلق کی جاتی ہے یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، اس کا سبب تو قدرتی ہوتا ہے، بہرے کو تشکی اور جنگلی کو توہم پرست

[1] سورج گرہن کے وقت یہ وحشت بے حد نمایاں ہوتی ہے۔

کونسی چیز بناتی ہے، قرب وجوار کی اشیا اور ماحولی حالات سے ہماری لاعلمی۔ فقد سے اشیا کو دیکھ کر ان کے اثرات کا اندازہ لگانے کی عادت کے باعث بالخصوص جبکہ میں دیکھ بھی نہ سکتا ہوں

ملے ایک فلاسفر نے اس کے متعلق ایک اور بھی بہت اچھا سبب بیان کیا ہے جو ذیل میں نقل کیا گیا ہے اور یہ وہ فلاسفر صاحب ہیں جن کی وسیع النظری کا میں بیحد ممنون ہوں۔

جب ہم خصوصی حالات کے تحت فاصلہ کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے اور اشیا کے متعلق محض ان کے زاویے کی ناپ یا جسامت کے لحاظ ہی سے یا اس عکس کی بنا پر فیصلہ کرتے ہیں جو ہماری نگاہ پر پڑتا ہے، تو ایسی حالت میں ان اشیا کے متعلق ہم دھوکہ کھا جانے سے محفوظ نہیں رہتے اس چیز کا ہر شخص کو تجربہ ہوگا کہ رات کے سفر میں ہم اکثر ایک نزدیک کی چھوٹی سی جھاڑی کو ایک دور افتادہ بڑا سا درخت کس طرح خیال کر لیتے ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس بھی اتفاق ہوتا رہتا ہے، پس اگر کوئی شے مشہودہ ایسی ہو کہ اس کی شکل صورت یا جسامت سے ہم ناواقف ہوں تو اسی کی مانند اس کے متعلق بھی ہماری نظر اور تخیل کو دھوکہ ہونے کا احتمال ہوگا۔ اگر ایک مکھی انچ بھر کے فاصلے پر ہماری آنکھ کے پاس سے اڑتی ہوئی چلی جائے تو ایسا خیال گذرتا ہے کہ دور سے کوئی چڑیا اڑ کر گذری ہے، اگر دور فاصلہ پر ایک گھوڑا کھلے میدان میں ایسا خاموش کھڑا ہو جیسے بھیڑ کھڑی ہوتی ہے تو جبتک ہم اس کو گھوڑا ہی محسوس کر لیں وہ ہم کو ایک بھیڑ ہی نظر آتا ہے، لیکن جس وقت ہم یہ تمیز کر لیتے ہیں کہ کیا چیز ہے تو وہ جسم بغور گھوڑے کے مانند ہی دکھائی دینے لگتا ہے اور ہم اپنے خیال کی اسی وقت اصلاح کر لیتے ہیں۔

رات کے وقت جب کبھی کوئی کسی ایسے اجنبی یا نئے مقام پر ہوتا ہے جہاں اندھیرے کے باعث ہم فاصلہ کا اندازہ نہیں لگا سکتے تو ایسے مقام پر ان اشیا کے متعلق جو ہمارے دیکھنے میں آتی ہیں غلط رائے قائم کرنے کا مستقل خدشہ رہتا ہے، اندھیری راتوں میں جو اکثر اور بیشتر لوگوں پر دہشت اور خوف طاری ہو جاتا ہے اس کی یہی وجہ ہوتی ہے، اور مفروضہ بھوت پریت یا بڑی بڑی خوفناک اور ہیبت ناک صورتیں دکھائی دینے کی بھی بنیاد یہی چیز ہے، جو لوگ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں ان سے عموماً کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کا وہم و خیال ہے، لیکن ممکن ہے انہوں نے ان چیزوں کو حقیقتاً دیکھا ہو اور یہ بالکل ممکن ہے کہ جو وہ کہتے ہیں وہی انہوں نے فی الواقعی دیکھا بھی ہو، اس لئے کہ جب ہم کسی چیز کی جسامت کا اندازہ محض اپنی آنکھ کے زاویہ کے ذریعہ کرتے ہیں تو ہمیشہ یہ ایسا ہی ہوگا کہ ہم جوں جوں اس چیز کے نزدیک پہونچیں گے وہ ہم کو پھیلتی اور بڑی ہوتی ہوئی نظر آئے گی، اور جبکہ ناظر نے (باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ ہو)

مجھے یہ فرض کئے بغیر کیا مفر ہے کہ میرے چاروں طرف ایسے حشرات الارض اور ہر اقسام کے درندوں کا ہجوم ہے جو مجھے نقصان پہونچا سکتے ہیں اور ان کے خلاف میں اپنی حفاظت کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتا، میرے لئے یہ خیال کر لینا بے سود ہے کہ میں اپنی جگہ پر محفوظ ہوں، اس خیال سے مجھے کبھی اتنا بھروسا اور اطمینان نہیں ہوتا جیسا کہ بچشم خود کسی شے کو دیکھ لینے پر ہو سکتا ہے، لہذا ہر وقت خوف کا سماں بندھا رہتا ہے جو دن کو مفقود ہو جاتا ہے، میں اس سے قطعی طور پر واقف ہوں کہ کوئی غیر جسم خفیف سے خفیف آواز بغیر مجھ کو متاثر نہیں کر سکتا ہے، لہذا میں نہایت غور سے اس آواز کو سننے کی فکر میں رہتا ہوں، اور نا قابل اظہار خفیف ترین آہٹ پر بھی حفاظت خود اختیاری کی خواہش میرے سامنے ہر اس چیز کا نقشہ کھینچ دیتی ہے، جو مجھے حفاظت کے لئے خبردار کر دیتی ہے اس لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵ سے آگے) تیس چالیس فٹ کے فاصلہ سے اس چیز کو کئی فٹ اونچا خیال کر لیا ہو تو چند فٹ کے فاصلہ پر تو وہ اس کو بے حد بڑی اور نہایت مہیب معلوم ہوگی، پس جب تک وہ اس کو چھو کر نہ دیکھ لے کہ وہ کیا چیز ہے یقیناً وہ حیرت زدہ اور بیوں چکا ہو جائے گا، کیوں کہ یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ کیا چیز ہے وہ قد آور اور تنومند شے فوراً ہی سمٹ اور سکڑ کر اپنی اصلی حالت پر آ جائے گی، لیکن اگر ہم ڈر کر بھاگ جائیں اور اس کے قریب نہ جائیں تو اسی نقشے کے تصور کے سوا جو ہماری آنکھ کے ذریعہ قائم ہوا ہوگا، دوسرا کوئی تصور ہم یقیناً قائم نہ کر سکیں گے، لہذا ارواح دیکھنے کا میلان قدرتاً ہم میں موجود رہتا ہے اور یہ شکلیں جلیا کہ سائنس والے باور کراتے ہیں محض ہمارے توہمات کی پیدا کردہ ہی نہیں ہوتی ہیں" (بیفون کی تاریخ قدرت (نیچرل ہسٹری) میں نے اصل مضمون میں یہ دکھانے کی سعی کی ہے کہ ہمیشہ یہ جز وًا ہمارے توہمات کی مخلوق ہوتے ہیں۔ ..ان کے سبب کے متعلق جو متذکرہ بالا قول میں ظاہر کیا گیا ہے یہ واضح ہے کہ راتوں میں پھرنے کی عادت ہم کو ان اشکال میں صحیح تمیز کرنا سکھاتی ہے جو رات کو دکھائی دینے والی اشیاء کی صورتوں اور ہیئتوں میں بوجہ اختلافات مشابہت اور فصل نمودار ہوتی ہیں، پس اگر ہوا اس قدر ہلکی ہو کہ ہم چیزوں کا خاکہ ہی دیکھ سکیں تو ہمارے اور اس کے درمیان اگر وہ زیادہ فاصلے پر ہوں ہوا لازماً زیادہ ہوگی اور وہ اگر ہم عادی ہوں تو اس مغالطہ یا فریب نظری سے ہم کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے، جس کی تفصیل ایم بیفون نے اوپر دی ہے آپ جو تشریح جی چاہے پسند فرمائیں، میرا طریقہ اب بھی کارآمد اور موثر ہے اور تجربہ اس کی بالکل تائید کرتا ہے

مجھے چوکنا رکھنے کے لئے ہر چیز کا بیحد زیادہ اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اگر مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تو میں اور بھی بے چین ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی بلا بغیر آہٹ کے مجھ پر اچانک نہ نازل ہو جائے، اشیا کی تصاویر جیسی کہ پہلی تھیں اور جیسی ہونی چاہئیں مجھے تصور میں کھینچی ضرور ہوں گی، اور میرے لئے اُن دیکھا دیکھنا ضروری ہو جائے گا پس قوت تخیلہ کے استعمال پر مجبور ہو جانے کے باعث وہ فوراً میری مالک بن جاتی ہے اور جو کچھ میں ذاتی اطمینان کے لئے عمل کرتا ہوں وہ محض اور بھی مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے، آواز سنتا ہوں تو چور کا خیال بندھتا ہے، نہیں سنتا ہوں تو آہٹ سلب کا خیال پیدا ہوتا ہے، فطرتی حفاظت خود اختیاری کی پیدا کردہ چوکیداری مجھے اور بھی زیادہ مصیبت زدہ بنا دیتی ہے، ہر وہ شے جس کو مجھے چاہئے کہ اطمینان دلائے صرف میری عقل ہی میں موجود رہتی ہے اور طبعی آواز عقل کی آواز سے بلند ہو جاتی ہے، پس یہ خیال کرنے سے کیا فائدہ کہ ہم کو کسی سے نہ ڈرنا چاہئے کیونکہ اس معاملہ میں ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے ؟

اندھیرے کا خوف دور کرنے کا طریقہ بیماری (سبب) خود صحت یا علاج کی رہبری کرتی ہے، ہر کام میں عادت وہم کو مغلوب کر لیتی ہے، اور وہم صرف اسی وقت نمودار ہوتا ہے جب کوئی نئی چیز سامنے آئے جس کا تعلق ہمارے روزمرہ کے مشاہدے سے ہو وہ وہم نہیں رہتا بلکہ حافظہ ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے یہ مثل مشہور ہے (ABASSUETIS MAN FIT PAN I) کیوں کہ توہمات ہی کی رَو میں خواہشات بھڑکتی ہیں، پس جس کسی شخص کو عذاب ظلمات سے آپ نجات دلانی چاہیں اس سے کبھی بحث نہ فرمائیں، بلکہ بار بار اس کو اندھیرے مقامات پر لے جایا کیجئے اور یقین مانیئے یہ طرز عمل آپ کی تمام فلسفیانہ بحث سے زیادہ موثر ثابت ہو گا۔ کو ٹھو چھانے والا چھت پر یہ نہیں جانتا کہ چکر کھانا کیا شے ہے اور جو لوگ اندھیرے میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں ڈرتے۔

ہمارے اندھیرے کے کھیلوں میں ایک اور بھی بہت بڑا فائدہ ہے، لیکن اگر ان کھیلوں کو زیادہ کامیاب بنانا ہے تو میں زیادہ چہل پہل پر ہرگز زور نہ دوں گا، اندھیرے سے زیادہ بھیانک

کوئی اور شے نہیں ہوتی ہے۔ پس آپ اپنے بچے کو کوٹھری میں بند نہ فرمائیں جب وہ اندھیرے میں جائے اس وقت اس کو خوب ہنسائیے اور جب وہ اندھیرے سے واپس آئے تب خوب ہنسائیے تاکہ جس کھیل کو وہ ختم کر رہا ہے اور دوسرے دن پھر کھیلے گا، اس کا خیال بچے کو ان فرضی توہمات سے محفوظ رکھ سکے جو شاید اس کے دل پر چھا گئے ہوں۔

ہماری زندگیوں میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جبکہ ہم ترقی معکوس کرنے لگتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ میں تو اسی نوبت کو پہنچ چکا ہوں اور بقول شخصے میں اپنی ماضی کی طرف رجوع ہو رہا ہوں، ضعیفی کا قرب ہم کو ہمارا بچپنا یاد دلاتا ہے، اور جوں جوں میں بڈھا ہوتا جاتا ہوں، اتنا ہی میں اپنے بچپن کی طرف عود کرتا جاتا ہوں، اور اس وقت تیس سالہ عمر کے واقعات کی نسبت مجھے دس سالہ عمر کے واقعات زیادہ یاد آتے ہیں، پس بعض اوقات اگر میں آپ بیتی کا حوالہ دوں تو ناظرین مجھے معاف فرمائیں اس لئے کہ اگر یہ کتاب اچھی ہونی چاہے تو مجھے اس کے لکھنے میں لطف اندوز ضرور ہونا چاہئے۔

میں ایک پادری مسمی ایم لامیر سیر (M. LAMBER CIER) کے ساتھ ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک میرا چچازاد بھائی جو مجھ سے زیادہ مالدار تھا میرا ساتھی، وہ ایک جائداد کا وارث خیال کیا جاتا تھا اور میں اپنے باپ کو چھوڑ کر محض ایک غریب یتیم تھا، میرا علیم و شمیم چچازاد بھائی بالخصوص رات کے وقت غیر معمولی طور پر ڈرپوک واقع ہوا تھا، اس لئے میں اس کا بڑا مذاق اڑایا کرتا تھا، مسٹر لامیر سیر نے میری شیخی خوری اور ڈینگوں سے تنگ آکر بالآخر میری آزمائش کی ٹھان لی، اور موسم خزاں میں موقع پاکر ایک روز شام کے وقت جب خوب اندھیرا چھا گیا انہوں نے مجھے گرجا گھر کی کنجی دی، اور کہا منبر پر انجیل رکھی ہے جا کر اٹھالاؤ۔ اور جوش دلانے کی کچھ ایسی باتیں کیں کہ انکار کرنا میرے لئے تقریباً ناممکن سا ہو گیا۔

پس روشنی ہمراہ لئے بغیر میں روانہ ہو گیا اور اگر کوئی روشنی میرے ساتھ ہوتی بھی تو بہت ہی برا ہوتا، راستہ میں قبرستان تھا، اس میں سے میں نہایت دلیرانہ طور پر گذر گیا، کیوں کہ جب تک میں کھلے میدان میں تھا۔ اندھیرے کا مجھے ذرا بھی خوف نہ تھا۔

جوں ہی میں نے گرجا پہونچ کر اس کا دروازہ کھولا ایک قسم کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دی

بند لوگوں کی مجموعی آوازوں کی مانند معلوم ہوئی، اس کے سنتے ہی میری تیس مارخانی میں فرق آنے لگا
بال دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا، ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ رک گیا، اس وسیع عمارت
اندھیرے گھپ نے میرے اوسان باختہ کردیئے، خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے
نے لگے، میں اپنے قدم واپس ہوا اور دروازہ میں سے باہر نکل کر ڈرتا ہوا بھاگا، صحن میں ایک کتا
کو سلطان کہتے تھے مل گیا، اس کے پیار نے میری ڈھارس دوبارہ باندھ دی اور میں اپنی
بزدلی سے شرمندہ ہوکر پھر سلطان کو ساتھ لے کر واپس ہوا، لیکن کتا ساتھ نہ آیا۔ بہرحال میں نے جلدی
پھر دروازہ کھولا اور دوبارہ گرجا میں داخل ہوگیا، بمشکل ہی میں منبر کے پاس پہونچا ہوں گا کہ مجھ پر
اس قدر خوف طاری ہوگیا کہ میرا دماغ تک قابو میں نہ رہا اور گو مجھے خوب معلوم تھا کہ منبر دائیں جانب
ہے لیکن میں اس کو بائیں جانب ٹٹولنے لگا اور بالآخر بنچوں میں الجھ کر مجھے پھر کسی بات کی خبر نہ رہی
دروازہ یا منبر کچھ بھی سوجھائی نہ دینے کی وجہ سے میرا حال بالکل ناگفتہ بہ ہوگیا، بہرحال دروازہ
طرف پڑ گیا اور میں افتاں وخیزاں گرجا کے باہر آگیا اور یہ ارادہ کرکے کہ اب دن کے سوا کسی اور
وقت دوبارہ گرجا میں کبھی نہ آؤں گا پہلے کی طرح بھاگ گیا۔

گھر واپس آکر میں سیڑھیوں پر چڑھ ہی رہا تھا کہ مجھے لامبر صاحب کے ٹھٹھا مارنے کی آواز آئی، مجھے یہ خیال گذرا کہ
میری بزدلی ہی پر ہنس رہے ہوں گے، اس ہنسی سے نادم ہوکر دروازہ کھولتے ہوئے جھجک ہی رہا تھا کہ میں نے
مسز لامبر کو جو میری طرف بڑھ رہی تھیں کہ منہ بنائیں خادمہ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "لالٹین لاؤ اور ادھر مسٹر لامبر میری
تلاش میں نکلنے کے لئے تیار ہوگئے اور ان کے ہمراہ میرے بہادر چچیرے بھائی صاحب بھی تشریف لارہے تھے کہ
اس ساری مہم کی داد خود ہی حاصل فرمالیں، پس یہ دیکھ کر میرا سارا خوف ایک دم رفوچکر ہوگیا اور میں اپنی
بیت پر محض تعجب میں پڑ گیا، لہٰذا میں وہاں سے گرجا گھر کی طرف بے تحاشہ بھاگا ملکہ ہوا ہوگیا۔ اور بغیر کہیں بھٹکے
یا ادھر ادھر ٹٹولے منبر پر سے جاکر انجیل اٹھائی اور زینے سے اتر کر بھاگتے ہوئے کمرہ میں پہونچ کر
انجیل منبر پر رکھ دی۔ اس جلدی میں میرا سانس پھول گیا اور گو میں ڈرا ضرور تھا لیکن مارے فخر کے
میرا دل گز بھر اس بات پر اچھل رہا تھا کہ بغیر مجوزہ امداد میں نے وہ کام بخیر و خوبی انجام دے دیا ۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

ڈک بکویسٹ (DICK BEQUEST)

یوں تو اسکاٹ لینڈ میں تعلیم و تدریس کی ترویج میں اوقاف نے بہت بڑا حصہ لیا ہے لیکن ان سب میں ڈک بکویسٹ کی حیثیت نمایاں ہے، اس کی تاریخ شاندار اور اس کی خدمات لائق ستائش ہیں [illegible]ء میں جیمز ڈک فوریس میں پیدا ہوا۔ فورڈ کے پیرش اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور قسمت آزمائی کے لئے جزائر غرب الہند کا سفر کیا۔ جمائیکا میں رہ کر اس نے اچھی خاصی دولت پیدا کی۔ اس نے جو تعلیم حاصل کی اور اس سے جو فائدے اس نے حاصل کئے اس کے صلے میں اس نے ۱۱۳،۰۰۰ پونڈ ابردین، مورے اور بنف کے مدرسوں میں اچھے اساتذہ اور اچھی تعلیم کے لئے وقف کر دیئے، اس وقف کا اہم مقصد اچھے اور کام کرنے والے مدرسین کو معقول اور قابل قدر معاوضہ دینا تھا۔ اور اس سے فی الواقع مدرسوں میں نئی زندگی اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا۔ یہ رقم بیس پونڈ سے ۵۰ پونڈ تک ہوتی تھی، اس کا ایک عمدہ اثر یہ ہوا کہ دیہاتی علاقوں میں علم و عرفان کی روشنی پھیلانے کے لئے شمال مشرق کے تعلیم یافتہ، متمدن اور اونچی تعلیمی اقدار کے حامل افراد ملنے لگے موجودہ حالات میں اور بالخصوص نیشنل پے اسکیل کے پیش نظر کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ڈک بکویسٹ سے اساتذہ کو اب اس قسم کے معاوضے نہ دیئے جائیں اور نہ انھیں سفر یا ممالک غیر میں تعلیم مزید کے لئے رقوم دی جائیں اور مرکزی مدرسوں میں وہ سہولتیں مہیا نہ کی جائیں جو تعلیمی کمیٹی کی سفارشات سے باہر ہوں جن اساتذہ پر ان سفارشات کا براہ راست اثر پڑا انھوں نے احتجاج کیا اور ٹرسٹ کے گورنروں کی تجویزوں پر اعتراضات کئے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ احتجاج اور یہ اعتراضات بعید از قیاس یا بے جا نہیں تھے۔ ٹرسٹ کے گورنروں نے جو تجویزیں پیش کیں ان پر اساتذہ کو ٹیلر کمیٹی کی سفارشات سے بھی کہیں زیادہ خسارہ اٹھانا پڑے گا۔ اس سلسلے میں سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس معاملے کی تحقیق کے لئے گراہم کیسٹ کو مقرر کیا۔

اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جیمز ڈک نے بے گراں قدر رقم اچھے اہتمام کرنے والے
مدرسین کی فلاح کے لئے وقف کی تھی، تاکہ ان علاقوں میں بھی مہذب اور باسلیقہ اساتذہ میسر آسکیں۔ اور
اس طرح رفتہ رفتہ ان علاقوں کو تنگ نظر، پست خیال کلیسائی مدرسین اور مدرسوں سے نجات مل سکے
دراثنا ٹرسٹ میں تو ہر مدرس کو ایک امتحان دینا ہوتا تھا۔ اور ڈک بیکویسٹ کے ناظرین ان مدرسوں کا معائنہ
بھی کرتے تھے۔ ان ناظروں کے سامنے مدرس کی اونچی تعلیم اور اس کی ذہنی بلندی، کسی حد سے کے اعلیٰ معیار
پر پرکھنے کی کسوٹی ہوتی تھی، یہ بھی صحیح ہے کہ بیکویسٹ نے اسکاٹ لینڈ میں ایسی تعلیمی روایات کی طرح ڈالی
جس پر اسکاٹ لینڈ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے، یہ بھی درست ہے کہ اس وقت اس کے طریق کار نے کلیسائی
مدرسوں کی بعض کمزوریوں اور خرابیوں کو مٹانے میں بھی امداد کی، کیا اب حالات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں
کہ ٹرسٹ کے پرانے آئین و ضوابط بے سود اور لاحاصل ہو چکے ہیں، وقف کے ناظموں کا خیال ہے کہ
یہ رقم تجرباتی مدارس چلانے اور دوسرے مدارس کی تکمیل کے لئے کاؤنٹی کونسل کی امداد میں صرف کی جائے
تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس رقم سے موجودہ مدرسوں کی حالت اور بہتر بنائی جاسکتی ہے، حالاں کہ اس سلسلے
میں ناظمین وقف، اس سے پہلے بھی کافی رقم خرچ کر چکے ہیں۔

کارڈف اور امتحانات

کارڈف میں مقامی تعلیمی حکومت کی ثانوی مدارس کمیٹی نے اپنی دسمبر کی میٹنگ میں ثانوی مدارس کے
ہیڈ ماسٹروں کی یادداشت پر بحث و تمحیص کی، اس یادداشت میں گرامر اسکولوں کے امتحانات کے متعلق
وزارت معارف کے گشتی مراسلے پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ کارڈف اور کینتھیز ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹروں اور لیڈی
مارگریٹ اسکول کی ہیڈ مسٹرس نے مدرسین اعلیٰ کے نمائندوں کی حیثیت سے کمیٹی کے اجلاس منعقدہ
جنوری ۵۳ء میں شرکت کی اور اس یادداشت میں جو اعتراضات کئے گئے تھے ان کے مباحث میں
حصہ لیا، اس یادداشت میں بچوں کی عمر کی پابندی کو مسترد قرار دینے کی تجویز کو منظور کر لیا گیا ہے
لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس گشتی مراسلے میں بعض ایسے مفروضات بھی ہیں جو
بے وقیع اور بے حقیقت ہیں۔ وہ وزارت معارف کے اس کلیے سے اتفاق نہیں کر سکے کہ امتحانات

اس صورت میں بالکل ہی برے ہیں، بلکہ ان کا خیال ہے کہ امتحانات کوشش اور مساعی کے لئے بہت موثر طریق کار ثابت ہوتے ہیں اور متعلمین اور مدرسین دونوں کی ترقی کا صحیح معیار۔ امتحانات کو یک سر ختم کر دینا دونوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوگا اور حصول تعلیم کا یہ ایک عجیب مبہم اور غیر واضح طریق کار ہے وفد کا خیال ہے کہ امتحانات کا موجودہ طریقہ ابھی صرف ایک سال ہی پرانا ہے وہ قبل از وقت کوئی رائے قائم کرنا نہیں چاہتے۔ اور جب تک اس کا پورا تجربہ نہ کیا جائے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا تشویش ہی خلجان کا باعث ہو سکتا ہے۔ عوام اور آجرین کا یہ خیال تھا کہ جنرل سرٹیفکیٹ، عام اور مروجہ تعلیم کی سند ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک مضمون میں کامیاب ہو کر اسے حاصل کر لیا جائے لیکن اس طرح اس سلسلے میں طریق کار غلط ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اس گنتی مراسلے کے بعض مندرجات نے طلبہ کے ذہنی تفاعل کا جائزہ نہیں لیا جو بچے فطرتاً کم زور اور آسان پسند ہیں وہ اس مضمون سے حتی الامکان گریز کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو ان کے لئے مشکل ہوگا یا جسے وہ خود پسند نہیں کرتے، مضامین کے انتخاب میں اتنی آزادی طلبہ میں عزم وہمت اور مستقل مزاجی کے جوہر نہیں پیدا کر سکتی، وہ دشواریوں پر قابو پانے کی کوشش کی بجائے ہمیشہ اس سے دور رہنے کی سعی کریں گے۔ بہت سے طلبہ دو یا تین مضامین میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تھوڑی سی محنت اور کاوش کے بعد وہ پانچ مضامین میں بھی بآسانی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ گنتی مراسلے میں مدرسے اور آجرین کے اشتراک اور تعاون کار پر کافی زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہیڈ ماسٹروں کی رائے یہ ہے کہ وزیر معارف کی یہ بات قابل تحسین ہے۔ مگر مختلف اسکولوں کی رپورٹ کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا کسی مخصوص معیار پر پورا اترنا مشکل ہی ہوتا ہے، اس سلسلے میں کچھ اتنا ابہام اور تذبذب پیدا ہوتا ہے کہ آجرین اپنے صحیح مقام کے تعین سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ آجرین کے لئے کسی متعین بیرونی امتحان کے ذریعے اس مسئلے کے خارجی تعینات مشکل ہیں۔ اور فی الحقیقت وہ اپنے فرائض سے عہدہ برا بھی نہیں ہو سکتے۔ اس بحث کے اختتام پر وفد نے اس اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ اس پالیسی کے اختیار کرنے کے بعد گریمر اسکول کی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی بہت سے بچے اسکول

چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

ناظم تعلیمات نے کمیٹی کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ نظام امتحانات پر اس تبدیلی کی ذمہ داری وزارت معارف پر نہیں ثانوی مدارس کمیٹی پر عائد ہوتی ہے جس نے وزیر معارف سے اس کی سفارش کی۔ اس کا اپنا ذاتی خیال یہ تھا کہ اصلاح تعلیمی او خیالی ہے جس سے بے ربطی اور عدم یکسانیت پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ پیشہ ور طبقہ اس پیشے میں نئے آنے والے گروہوں سے امتحان میں کامیاب ہونے کی توقع کرتا ہے، اور اس چیز نے اسکول سرٹیفکٹ کو ضروری اور ناگزیر بنا دیا۔

لندن کاؤنٹی کونسل

اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ایک مخصوص دن کو لندن کے ۲۱۳۰۷ مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو کھانا کھلایا گیا یعنی اسکول جانے والے بچوں کی مجموعی تعداد کا ۷۰۵٫۷ فی صدی۔ اس سے کچھ سال پہلے یہی تعداد ۲۰۸٫۱۹۸ تھی اور کل تعداد کا ۵٫۷۰۹ فی صدی، جو بچے اسکول میں دودھ پیتے ہیں ان کی تعداد ۳۲۲٫۰۱۱ ہے جو اسکول جانے والے بچوں کی تعداد کا ۸۸٫۷۵ فی صدی ہے۔ اگر اسکول میلز سروس (SHOOL-SHO MEALS SERVICE) کے اخراجات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مالی سال میں کھانے پینے پر ۱۵۳٫۵۷۵ پونڈ صرف ہوئے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سال خوراک کی قیمت میں کم و بیش ۱۵ فی صدی اضافہ ہو چکا ہے، یا اسے یوں سمجھ لیجئے کہ ایک پنس فی طعام اخراجات بڑھ گئے ہیں۔

وول ورس ٹون ہال میں رہنے والے طلبہ کی سالانہ فیس ۱۵۵ پونڈ فی کس تھی بابت ۰۱۔۱۹۵۰ء میں فی کس اخراجات ۲۰۳ پونڈ ۴ شلنگ تھے۔ اب یہی اخراجات ۲۳۷ پونڈ ۱ شلنگ ہو گئے ہیں چنانچہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ ستمبر ۵۲ء سے دو سال کے لئے دارالاقامہ کی فیس ۱۵۰ پونڈ سے ۲۰۰ پونڈ سالانہ کر دی جائے گی۔

سرکاری جریدے کے اعلانات

اسکول — شعبۂ رجال

ای/۲۰۵/۴ — ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء
— م۔ غلام احمد معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھہ ٹوانہ ۔م۔ غلام حسین خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود (تاریخ حاضری سے)
— م۔ فیض احمد خاں بی۔ اے۔ قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل۔ م۔ غلام احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھہ ٹوانہ مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود (تاریخ حاضری سے۔

ای/۹۱۳۵ — ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء
— م۔ محمد امین بی۔ ایس سی (اگری کلچر) — (۱۲۰ — ۲۵۰) معلم زراعت برائے تجدیدی کورس۔ دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور (آرمائشی) م۔ غلام غوث کی جگہ معلم زراعت گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود (تاریخ حاضری سے)
— م۔ غلام غوث۔ ایس۔ ڈی (اگری کلچر ٹرینڈ) معلم زراعت گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور و ورناکیولر سکشن کی ایک خالی آسامی پر معلم زراعت گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔ تاریخ حاضری سے۔

ای/۹۷۷۴ — ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء
— م۔ مبارک علی بھٹی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۲۲۵ — ۲۵۰/۱۲۰ روپے) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ۔ م۔ غلام نبی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۴۵ — ۲۵۵/۲۵۰ روپے) کی جگہ جو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے۔
م۔ عبد المجید بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۲۵۸ — ۲۵۰/۱۲۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ ضلع راولپنڈی، م۔ مبارک علی بھٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول گوجرانوالہ مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔ تاریخ حاضری سے۔
رائے اللہ بخش بھٹی بی۔ اے (کپارٹمنٹ) ایک امیدوار۔ م۔ عبد المجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور ایک خالی آسامی پر عارضی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول کہوٹہ مقرر ہوئے۔ بشاہرہ ۸۰/- روپے ماہانہ اور دوسرے الاؤنس۔ تاریخ حاضری سے۔

ای/۹۶۵۴ — ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء
— م۔ تجلیل الحسن۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۳ — ۲۵۵/۲۵ روپے) سکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول

ملتان م۔ ظہور الحق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا (ضلع ملتان)
مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے۔

م۔ ظہور الحق۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا، چودھری محمد صادق ۱ قائم مقام
ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (نمبر ۴ ــ ۲۵۰/۳۵۵) کی جگہ جو ۱ جنوری ۵۳ء کو اپنی ملازمت سے سبکدوش
ہو چکے ہیں، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔ تاریخ حاضری سے۔

م۔ محمد الحق۔ ایم۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۲۷ ــ ۲۵۰/۳۵۵ روپے) سکنڈ ماسٹر گورنمنٹ
ہائی اسکول باغبان پورہ (لاہور)۔ ایس۔ بہادر علی شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ
ہائی اسکول ظفروال مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔ تاریخ حاضری سے

ایس۔ بہادر علی شاہ بی۔ اے، ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۶۷ ــ ۲۵۰/۳۵۵ روپے) ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال شیخ غلام نبی۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (نمبر ۱۴ ــ ۲۵۰/۳۵۵)
کی جگہ جو ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی
اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود، تاریخ حاضری سے۔

م عبد الحمید۔ بی۔ اے، ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۸۶ ــ ۲۵۰/۳۵۵ روپے)۔ اے۔ ڈی۔
آئی۔ ایس۔ ملتان م م فیض احمد بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس کی جگہ جو ۱۹ مارچ ۵۳ء کو اپنی ملازمت
سے سبکدوش ہو چکے ہیں، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔

م سعید اللہ خاں، بی۔ اے، ایس۔ اے۔ وی (نمبر ۹۰ ــ ۲۵۰/۳۵۵ روپے) سکنڈ ماسٹر گورنمنٹ
ہائی اسکول تونسہ (ڈیرہ غازی خاں) ایک نئی آسامی پر جو اسکول کے لئے منظور کی گئی ہے۔ ہیڈ ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول واہوا (ڈیرہ غازی خاں) مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔ تاریخ حاضری سے۔

۹۶۴۳/ق ــ م عبد الرحمٰن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایم ایس۔ ایف۔ (نمبر ۲۷۳ ــ ۱۳۰/۲۵۰ روپے) معلم انگریزی
ایچ ۵۲ء گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور م۔ امیر الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول للہ
(جہلم) کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو چکے ہیں، اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس ضلع اٹک مقرر ہوئے بشاہرہ خود، تاریخ حاضری سے۔

۱۰۰۴/ق ــ م احمد نواز خاں۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰/۲۵۰ روپے) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول
مارچ ۵۳ء میاں والی، م خلیل الحسن، بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰/۳۵۵) کی جگہ جو گورنمنٹ اسکول کہروڑ پکا
(ملتان) کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو چکے ہیں معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان مقرر ہوئے۔
بشاہرہ خود تاریخ حاضری سے۔

۲۲۱۰۶/ق ــ م۔ عبد اللہ خاں (نمبر ۱۰۰ ــ ۶۰ ــ ۱۲۰) جونیر کلرک سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور۔
یکم جنوری ۱۹۵۱ء سے اپنے عہدہ پر مستقل ہوئے۔

کالج ——— شعبۂ نساء

ڈبلیو/۱۱م ۳۰۵ مس خورشید انور تنویر لکچرر جغرافیہ گورنمنٹ زنانہ کالج منٹگمری مس رفیعہ اختر کی جگہ لکچرر جغرافیہ گورنمنٹ زنانہ کالج لائل پور مقرر ہوئیں۔ تاریخ حاضری سے۔

مس جولس ضیا ایک امیدوار مس رفیعہ اختر کی واپسی تک قائم مقام لکچرر جغرافیہ گورنمنٹ زنانہ کالج منٹگمری مقرر ہوئیں۔ تاریخ حاضری سے۔

ڈبلیو/۱۳ ۲۵۲۷ مس رضیہ فرحت ایک امیدوار ایک خالی اسامی پر ۱۳ اکتوبر ۵۲ء قائم مقام لکچرر انگریزی — گورنمنٹ زنانہ کالج راولپنڈی مقرر ہوئیں۔

اسکول شعبۂ نساء

ڈبلیو/۱ ۷۲۲۲ بیگم زبیدہ عمر صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول چونیاں مس زبیدہ احمد دین کی جگہ نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول قصور مقرر ہوئیں۔

بیگم زبیدہ مشتاق گیلانی صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول اکال گڑھ بیگم زبیدہ عمر کی جگہ صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول چونیاں مقرر ہوئیں بشاہرہ خود۔ تاریخ حاضری سے۔

مس رسول فاطمہ صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول راجا پور بیگم زبیدہ مشتاق گیلانی کی جگہ صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول اکال گڑھ مقرر ہوئیں۔ تاریخ حاضری سے۔

ڈبلیو/۳ ۵۳۰۲ مس عذرا منیر ایک امیدوار مس مسرت نیاز کی جگہ ۲ جنوری ۵۳ء سے قائم مقام نائب معلمہ وکٹوریہ گرلز ہائی اسکول لاہور مقرر ہوئیں۔

مس عذرا منیر قائم مقام نائب معلمہ وکٹوریہ گرلز ہائی اسکول لاہور محمودہ نیاز کی جگہ قائم مقام نائب معلمہ بھیرہ مقرر ہوئیں۔

مس محمودہ نیاز قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول بھیرہ مس عذرا منیر کی جگہ قائم مقام نائب معلمہ وکٹوریہ گرلز ہائی اسکول لاہور مقرر ہوئیں۔

ڈبلیو/۶ ۵۸۷ مس بی۔ اے۔ چوہان۔ اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس۔ سیالکوٹ مس زبیدہ مولا بخش کی جگہ صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول میاں چنوں مقرر ہوئیں۔ تاریخ حاضری سے۔

ڈبلیو/۸ ۵۳۴۸ مس زبیدہ میر نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول چوبرجی باغ بیگم سلیم پی۔ ای۔ ایس (ذوم) کی جگہ قائم مقام صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول چوبرجی باغ مقرر ہوئیں۔

Regd. No. L.5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ مینجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

[مئی ۱۹۵۳ء **لاہور** شمارہ ۲]

اس شمارہ میں

: **بشیر ہاشمی ،** **عبدالغفور** چودھری

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

مئی سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ——— ۶

شمارہ ——— ۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

28 JAN 1994

تدریسِ تاریخ

تاریخ اقوامِ عالم کے عروج و زوال، ان کی سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی زندگی کی داستان ہوتی ہے اور اس سے ان کے تہذیب و تمدن، ان کی معاشرت اور ان کے عقائد و رجحانات کا پتہ چلتا ہے، اس لئے ہر ملک میں تاریخ ہمیشہ کسی مقصد کے پیشِ نظر پڑھائی جاتی رہی ہے اور یہ مقصد بالعموم ملک کے سیاسی عقائد سے وابستگی اور ان کی ترویج و اشاعت سے متعلق ہوتا ہے۔ تدریس کا یہ طریقہ نیا نہیں پرانا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی فرنگی حکمرانوں نے تاریخ کو اپنا آلۂ کار بنایا اور اس سے اپنی سامراجی ضرورتیں پوری کرتے رہے اور حسبِ ضرورت تاریخی واقعات کی محض قطع و برید ہی نہیں کی، بلکہ انہیں بالکل مسخ کر کے پیش کیا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد نازیوں کو جمہوریت آشنا بنانے کے وسائل کا جائزہ لینے کے لئے اتحادی قوموں نے چند معروف شخصیتوں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا اور انگلستان کا مشہور فلسفی برٹرنڈ رسل اس کا صدر منتخب ہوا۔ اس کمیشن نے جرمن قوم کی سماجی زندگی کا تجزیہ کیا، اس کے معاشی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ لیا، حصولِ مقصد کی خاطر اس قوم کی تاریخ کو از سرِ نو لکھے جانے کی سفارش کی، تاریخ کی اس نئی ترتیب و تدوین کا مقصد یہی تھا کہ یہ قوم اپنے محسنوں کو بھول جائے اور اپنے قومی مشاہیر کو فراموش کر دے۔

تاریخ کی ترتیب و تدوین کا یہ نظریہ عالمگیر ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی اخلاقی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا حالاں کہ تاریخ کی تدریس میں حسبِ ذیل مقاصد رکھنے چاہئیں۔

(۱) آنے والی نسلوں کو وقت کا تصور دلانا اور

(۲) انہیں یہ احساس دلانا کہ اس کا مقصد انسانی گم و جہل کو مربوط اور ہم آہنگ کرنا ہے۔

پہلا مقصد تو مورخین اور مدرسین دونوں کے پیش نظر رہا اور یہ لوگ طلبا کو مرور زمانہ سے روشناس کرتے رہے، کبھی بادشاہوں کی فتح و شکست کی داستانیں سنا کر اور کبھی صلح و صفائی کی باتیں کر کے کبھی جنگ و جدل کے قصے پیش کر کے اور کبھی بادشاہوں اور خاندانوں کے عروج و زوال کے خطوط کھینچ کر، اس طرح تاریخ کی تدریس ناموں اور تاریخوں کے گورکھ دھندوں میں پھنسی رہی اور ہمارے سامنے تاریخ کی تدریس کا کوئی مقصد نہ رہا۔ ہمارے ذہنوں میں بادشاہوں کے جاہ و جلال، سپہ سالاروں کی دیو قامت شخصیتوں، میدان جنگ کی معرکہ آرائیوں کے واقعات ہی پھرتے رہتے ہیں، اور عام انسان انھیں بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے اور اس کی نگاہوں سے تاریخ کا ارتقائی مقصد اوجھل ہو جاتا ہے، پچھلے چند سال سے عمرانیات کی تدریس میں کسی حد تک وہ فرائض داخل ہو گئے ہیں جنھیں مدرسوں میں تاریخ کی تدریس بہت آسانی سے پورا کر سکتی ہے عمرانیات کی تدریس مدرسے کے نصاب میں داخل نہیں اس لئے ہمیں اپنے نصاب اور درسی کتب پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

اس سے قطع نظر تاریخ کے تدریسی طریقوں میں بھی بہت کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے، اور ہمیں امید ہے کہ مدرسین بادشاہوں کے نام اور ان کی تخت نشینی کی تاریخوں سے کہیں زیادہ انسان کی معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی ترقی پر زور دیں گے۔

بہت دنوں سے تدریس ریاضی کے سلسلے میں، مدرسین بالعموم کچھ غیر مطمئن سے معلوم ہوتے ہیں اب تک ریاضی کی تدریس کا مقصد یہ رہا ہے کہ بچوں کے احساس تنقید اور ان کی معلومات کو ابھارا جائے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس تدریس کا زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا، بچے سود در سود کے لمبے چوڑے سوالات اور طویل اور مبہم کسور میں ہی الجھے رہتے ہیں، اس لئے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ طلبا کی اکثریت کو ریاضی سے نفرت ہو جاتی ہے، تو خوشی کا مقام ہے کہ نئے نصاب میں، جو ہنوز عوام کے زیر غور ہے، تدریس ریاضی کے پرانے اور فرسودہ طریقوں کو ختم کر دیا گیا ہے، اور اسے زیادہ بہتر بنانے کے لئے اور عام رجحانات کو معلوم کرنے کے لئے محکمہ تعلیم نے اسے شائع کر کے اس کے متعلق مشورے طلب کئے ہیں، محکمے کا یہ اقدام نہایت دانش مندانہ ہے، ایسے معاملات میں خواہ عوام کی رائے حتمی اور آخری نہ ہو، لیکن ہمیں یہ توقع ضرور ہے کہ اس سے محکمے کو عوام کے محسوسات اور ردِّ عمل کا علم ہو جائے گا۔

جو لوگ غور و فکر سے عادی نہیں ہیں ان کی رائیں اور ان کے رجحانات بھی معلوم ہو جائیں گے، مدرسوں
ریاضی کی تدریس نے ہمارے طلبا کا وقت اور ان کی صلاحیتوں کو بھی ضائع کیا ہے اور ان کے لئے بہت سی
دشواریاں بھی پیدا کر دی ہیں، ہمیں امید ہے کہ مجوزہ نصاب ہماری ضروریات کو پورا کر سکے گا، اس سلسلے میں
مدرسین سے بالخصوص درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کا بغائر مطالعہ کریں اور اس کے تجزیے کے بعد اپنے
نتائج کے اظہار میں بے باکی اور آزادی سے کام لیں۔

پچھلے دنوں اخبارات میں ڈیرہ غازی خان کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ کم و بیش پانچ سو لڑکے ثانوی
مدارس میں داخلہ لینے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن جگہ کی قلت کی وجہ سے یہ بچے مدرسے میں داخل
نہیں کیے جا سکے، یہ خبر اس نقطۂ نگاہ سے دل خوش کن بھی ہے اور ہمت افزا بھی کہ ہمارے ایک سرحدی
ضلعے میں تعلیم کے حصول کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوتا ہے کہ
مدرسوں میں ان طلبا کو بھی جگہ نہیں ملتی جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، کچھ عجیب بات ہے کہ عوام نے
اپنی بھی کوششوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ حکومت اپنا طلسمی عصا گھمائے گی نئی عمارتیں
تیار ہو جائیں گی، مدرسوں میں ضروری ساز و سامان بہم پہنچ جائے گا اور بچوں کو پڑھانے کے لئے نئے
مدرسین بھی مقرر ہو جائیں گے، حکومت تعلیم کی اس بڑھتی ہوئی مانگ کو غالباً ضرور پورا کرے گی لیکن کیا
مقامی جاگیرداروں اور زمینداروں کا فرض نہیں ہے کہ وہ اس ضرورت کے پیش نظر ایک نیا ادارہ
قائم کریں ہمیں امید ہے کہ اگر محکمۂ تعلیم کے ارباب حل و عقد تمن دار سے ملیں گے اور انہیں تعلیم کی افادیت
سے روشناس کریں گے تو انہیں مایوسی نہیں ہوگی، اب دیکھنا یہ ہے کہ عمدہ عمارت اور اچھے ساز و سامان کی توقع میں
ڈیرہ غازی خان ان پانچ سو طلبا کو تباہ و برباد ہونے دے گا یا ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی صورت
پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، اس کام کو تو انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ اگر
اچھی عمارت نہیں ہے تو نہ سہی، درس و تدریس کے لوازم کی کمی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں تعلیم و تدریس کے
عدم اہتمام سے بچوں کی تھوڑی بہت ذہنی اور دماغی تربیت بھی بہت مفید ہوگی، اور اس کے حصول کے لئے
ہمیں وسائل و ذرائع پیدا کرنے ہوں گے۔

ہر سال اپریل میں سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور کی پوری فضا نئے داخلوں کے ہنگاموں سے معمور ہوتی ہے ۔ اس سال بھی اچھی خاصی گہما گہمی رہی ، ذیل کے اعداد و شمار سے تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ اور تعلیمی سہولتوں کے عدم اہتمام کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

نمبر شمار	جماعت	خالی جگہیں	درخواستیں
۱	کے ۔ جی ۔ لوئر	۴۰	۱۵۴
۲	ششم	۶۴	۵۷۶

اسی طرح دوسری جماعتوں میں کہیں کہیں جو دو چار جگہیں خالی تھیں ، ان کے لئے بیسیوں امیدوار موجود تھے ظاہر ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں گنجائش کے مطابق ہی بچوں کو داخل کیا جا سکتا تھا اس لئے مقابلے کے امتحان میں جن طلبا کے نام سر فہرست آ گئے ان میں سے چند امیدواروں کو خالی جگہوں کے مطابق علی الترتیب لے لیا گیا ، اس سے اکثر طلبا اور والدین کو مایوس ہونا پڑا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد داخلی ہمارے قوی میں کچھ اضمحلال پیدا ہو گیا ہے ، اور ہم اپنی نجی ذمہ داریوں کو بھی حکومت کے سر تھوپنے کے عادی ہو گئے ہیں ، اگرچہ ہمیں اچھے تعلیمی اداروں کی کمی کا شدت سے احساس ہے لیکن عمدہ اداروں کے قیام کے لئے اب تک نجی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں ، اور اگر خال خال اس کی مثالیں ملتی ہیں تو یہ تعلیم گاہیں معیاری اور مثالی نہیں ہوتیں ، چونکہ یہ مدرسہ پنجاب میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے ، والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اس درس گاہ میں تعلیم پائیں لیکن آج تک غالباً کسی نے یہ نہیں سوچا کہ لاہور کے سارے بچے اس مختصر سی جگہ میں نہیں سما سکتے ۔

تعلیم کی ترویج و اشاعت حکومت یا کسی مخصوص طبقے کا اجارہ نہیں ، اس میں تو ہر گروہ اور ہر خیال کے لوگ حسبِ مقدور شامل ہو سکتے ہیں ، صرف جذبۂ کار اور خلوص نیت کی ضرورت ہوتی ہے ، ہمیں امید ہے کہ لاہور کا سنجیدہ طبقہ اس مسئلے کو قابلِ توجہ سمجھ کر اس پر غور و خوض کرے گا ، اور ایک لاہور پر ہی کیا موقوف ہے ، اگر ہم تعلیم کو عام کرنا چاہتے ہیں تو ہر گاؤں ، ہر قریے اور ہر شہر میں ہمیں یہی اقدام کرنا ہوگا ۔

پشاور اور ایبٹ آباد کے کالجوں میں

طلبا کا

معاشری و اقتصادی جائزہ

ڈاکٹر احمد مختار

پشاور یونی ورسٹی میں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے طے کیا کہ پشاور اور ایبٹ آباد کے کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی معاشری و اقتصادی کیفیت کا جائزہ لینے کے لئے پہلے موقعے سے فائدہ اٹھاؤں لہذا ایک سوال نامہ تیار کیا اور دلچسپی رکھنے والے حضرات سے اس پر تبادلۂ خیالات کیا۔ بعد میں اسے چھپوا کر اپنے ایم۔ اے (جماعت اول و دوم) کے طلبا سے اس کی مفصل تشریح کی۔ انھیں نومبر ۱۹۵۱ء میں اعداد و شمار جمع کرنے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ ہر کالج میں طلبا کی فہرست تیار کی گئی اور مشتے نمونہ از خروارے (RANDOM SAMPLING) کے اصول پر ان میں سے تقریباً ۲۰ فی صدی براہ راست جائزے کے لئے گئے۔ ہر کالج کے طلبا کی مجموعی تعداد مع ان طلبا کی تعداد کے جن کو اس جائزے کے لئے نمونہ جاتی یا نمائندہ حیثیت سے لیا گیا تھا مفصلہ ذیل ہے۔

۱	۲	۳	۴
کالجوں کے نام	طلبا کی مجموعی تعداد	نمائندہ طلبا کی مجموعی تعداد	مجموعی تعداد سے نمائندہ طلبا کی فیصدی
۱۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج پشاور	۹۲۰	۲۰۵	۲۲
۲۔ فرنٹیئر کالج فار ویمن پشاور	۱۴۴	۳۴	۲۰
۳۔ ایڈورڈس کالج۔ پشاور	۳۲۵	۶۳	تقریباً ۲۰
۴۔ گورنمنٹ کالج۔ پشاور	۱۶۲	۳۱	تقریباً ۱۹

سوال نامہ کے جوابات طلب کرنے سے قبل میں نے خود ہر کالج کے طلبا سے ملاقات کی اور اپنی تحقیقات کا مقصد ان پر واضح کیا، ایبٹ آباد میں اس مقصد کے لئے ایم اے کے میرے دو طالب علموں (نصر من اللہ صاحب اور شاہ شمس العمر صاحب) نے ذاتی طور پر ملاقات کی۔ اس کے بعد جوابات کی غرض سے منتخب طلبا میں سوال نامہ تقسیم کر دیا گیا، پھر ایم۔ اے کے طلبا نے ہر منتخب طالب علم سے مل کر جوابات کی پڑتال کی اور اعداد و شمار کا اندراج کیا۔ آخر میں اس کی پڑتال نذر عباس صاحب جونیر لکچرر اقتصادیات، پشاور یونیورسٹی اور مزید پڑتال معراج الدین صاحب سینیر لکچرر اقتصادیات پشاور یونیورسٹی نے فرمائی۔

تحقیقات میں ایک نقص رہ گیا، اگرچہ میں نے تحقیقات کا مقصد واضح کر دیا تھا۔ پھر بھی متعلقہ حضرات نے اس کو مختلف معنی پہنائے۔ میرے علم میں ایسے واقعات آئے ہیں کہ طلبا کے والدین یا نگران حضرات نے اپنے متعلقین کو اپنی آمدنی اور اخراجات کے سلسلے میں صحیح حقائق غالباً اس خطرے کے پیش نظر ظاہر نہ کرنے کی ہدایت کی کہ یہ تحقیقات کسی نئے ٹیکس کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے، خود طالب علموں نے بھی بعض مدوں میں اپنے اخراجات کم بیان کئے ہیں اور بعض دیگر معنی خیز مدوں میں خاموشی تک اختیار کر لی ہے، ان نقائص کے باوجود نتائج ایسی صورتِ حالات کی طرف رجحان کا پردہ فاش کرتے ہیں جو آسانی سے جزوی اصلاح کی بنیاد قرار پا سکتی ہے۔

گوشوارہ ۱ اور ۲ گورنمنٹ اسلامیہ کالج اور ایڈورڈس کالج کے طلبا کے اضلاع ظاہر کرتے ہیں۔ گوشوارے سے واضح ہے کہ ۴۹ فی صدی طلبا گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے اور ۶۱٫۹ فی صدی طلبا ایڈورڈس کالج کے ضلع پشاور سے تعلق رکھتے ہیں، گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں ۱۷٫۲ فی صدی اور ایڈورڈس کالج میں ۸٫۹ فی صدی ضلع مردان کی نمائندگی ہے، دوسرے اضلاع کی فی صدی قدرے کم ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اضلاع ہزارہ، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور بنوں میں چونکہ حکومت نے اول یا دوم درجے کے کالج کھول دیئے ہیں، اس لئے یہ اضلاع پشاور کو طلبا کی کم تعداد بھیجتے ہیں، دوسرے اضلاع کی قلیل فی صدی کا سبب اعلیٰ تعلیم میں ان کی پسماندگی ہی ہو سکتی ہے، مہاجر طلبا گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں ۱۰٫۵ فی صد ایڈورڈس کالج میں ۸٫۶ فی صد ہیں، وہ طلبا جو شمال مغربی سرحدی صوبہ

ادنہیں ہوئے۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں ۸،۵ فی صد اور ایڈورڈس کالج میں ۵،۵ فی صد ایسا
اہران طلبا کے نگراں ملازمت یا تجارت کے سلسلے میں یہاں مقیم ہیں اور فی الحال پشاور کو مستقل
ن بنانے کا قصد نہیں رکھتے۔

گوشوارہ نمبر ۱

گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں طلبا کی ضلع وار تقسیم

جماعت	ضلع پشاور	ضلع مردان	ضلع ہزارہ	ضلع کوہاٹ	ضلع بنوں	ضلع ڈیرہ اسماعیل خان	قبائلی علاقے	[illegible]	[illegible]	[illegible]	مجموعہ
سال اول۔ آرٹس	۶۹	۳۱	۴	۹	۳	-	۱۱	۳	۳	۳	۱۳۶
سال اول۔ سائنس	۱۳۱	۳۳	۷	۱۴	۳	۴	۱۰	۵	۵	۷	۲۱۳
سال اول۔ ایگریکلچر (زراعت)	۷	۱	-	۱	-	۱	-	۳	۱۰	-	۲۳
سال اول تھیالوجی (دینیات)	۶	۴	۱	-	-	-	-	-	-	-	۱۱
میزان	۲۱۳	۶۹	۱۲	۲۴	۶	۵	۲۱	۱۱	۱۸	۱۰	۳۸۹
سال اول کی مجموعی تعداد کی فیصدی	۵۴،۰	۱۸،۰	۳،۱۱	۶،۲	۱،۶	۱،۳	۵،۵	۲،۹	۴،۷	۲،۶	۱۰۰
سال دوم۔ آرٹس	۴۷	۱۴	۱۲	۶	۳	۳	۹	-	۶	۴	۱۰۴
سال دوم سائنس	۸۹	۲۸	۱۸	۱۰	۱۱	۲	۱۰	-	۱۱	۷	۱۸۶
سال دوم زراعت	۶	۴	۳	۱	-	-	-	-	۱	۱	۱۶
سال دوم دینیات	۳	۱	-	-	۲	۱	-	-	-	-	۷
میزان	۱۴۵	۴۷	۳۲	۱۷	۱۶	۶	۱۹	-	۱۸	۱۲	۳۱۳
سال دوم کی مجموعی تعداد کی فی صدی	۴۶،۳	۱۵،۰	۱۰،۵	۵،۴	۵،۲	۱،۹	۶،۱	-	۵،۸	۳،۸	۱۰۰

گوشوارہ نمبر ۱ از صفحہ ماسبق

جماعت	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	میزان
سال سوم آرٹس	۲۷	۱۵	۲	۶	--	—	—	—	۱	۵	۵۶
سال سوم سائنس	۴۰	۱۰	۲	۸	۱	۳	—	۱	۶	۲	۷۳
سال سوم زراعت	—	—	۱	—	—	—	—	۲	—	—	۳
سال سوم دینیات	۷	۱	—	—	۲	—	—	—	—	۳	۱۳
میزان	۷۴	۲۶	۵	۱۴	۳	۳	—	۳	۷	۱۰	۱۴۵
سال سوم کی مجموعی تعداد کی فیصدی	۵۱٫۰	۱۷٫۹	۳٫۴	۹٫۷	۲٫۱	۲٫۱	—	۲٫۱	۴٫۸	۶٫۹	۱۰۰
سال چہارم آرٹس	۱۶	۱۴	۴	۶	۱	—	۳	۱	۳	۱	۴۹
سال چہارم سائنس	۷	۲	۶	۳	۱	—	۱	—	۲	—	۲۲
سال چہارم زراعت	۲	—	—	—	—	—	۱	—	۵	—	۸
میزان	۲۵	۱۶	۱۰	۹	۲	—	۵	۱	۱۰	۱	۷۹
سال چہارم کی مجموعی تعداد کی فیصدی	۳۱٫۶	۲۰٫۲	۱۲٫۷	۱۱٫۴	۲٫۵	—	۶٫۳	۱٫۳	۱۲٫۷	۱٫۳	۱۰۰
میزان کل	۴۵۱	۱۵۸	۶۰	۶۴	۲۷	۱۴	۴۵	۱۵	۵۳	۳۳	۹۲۰
کالج کی مجموعی تعداد کی فی صدی	۴۹٫۰	۱۷٫۲	۶٫۵	۷٫۰	۳٫۰	۱٫۵	۴٫۹	۱٫۵	۵٫۸	۳٫۶	۱۰۰

گوشوارہ نمبر ۲

ایڈورڈس کالج میں طلبا کی ضلع وار تقسیم

جماعت	ضلع پشاور	ضلع مردان	ضلع ہزارہ	ضلع کوہاٹ	ضلع بنوں	ضلع ڈیرہ اسماعیل خان	صوبہ سرحد کی ریاستیں	قبائلی علاقہ جات	صوبہ سرحد سے باہر پاکستان کے علاقے	دوسرے ممالک	میزان
اول سائنس	۹۱	۹	۲	۶	۵	—	۱	۱	۵	۳	۸۲
اول آرٹس	۴۸	۳	-	۴	۱	—	۳	۳	۲	۴	۶۸
دوم سائنس	۳۱	۸	۶	۱	—	۱	—	۱	۹	۷	۶۴
دوم آرٹس	۴۵	۷	۲	۲	۳	—	—	۱	۳	۴	۶۷
سوم آرٹس	۱۹	۱	—	—	۲	—	—	—	۶	—	۲۸
چہارم آرٹس	۷	۱	۱	۲	—	۱	—	—	۳	—	۱۵
میزان	۲۰۱	۲۹	۱۱	۱۵	۱۱	۲	۴	۶	۲۸	۱۸	۳۲۵
فی صدی	۶۱٫۹	۸٫۹	۳٫۴	۴٫۶	۳٫۴	۰٫۶	۱٫۲	۱٫۹	۸٫۶	۵٫۵	۱۰۰

گوشوارہ ۳ اور ۴ علی الترتیب گورنمنٹ اسلامیہ کالج اور ایڈورڈس کالج کے مقیم
غیرمقیم طلبا سے تعلق رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے ۵۲٫۵ فی صد طلبا دارالاقاموں
رہتے ہیں۔ جو آج کل پوری طرح پُر ہیں۔ اگر کافی گنجائش مہیا ہوتی تو اس تعداد میں نمایاں
اضافہ ہوگیا ہوتا۔ لہٰذا نئے دارالاقاموں کی تعمیر کے لئے ایک لائحہ عمل کی فوراً ضرورت ہے
ایڈورڈس کالج کے ۳۲۵ طلبا میں سے صرف ۲۲ کالج کی حدود کے اندر رہتے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۳ و ۴ دوسری طرف ملاحظہ ہوں

گوشوارہ نمبر ۳

گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے مقیم اور غیر مقیم طلبا کی تفصیل

جماعت	مقیم	غیر مقیم	میزان
سال اول و دوم	۳۷۴	۳۲۲	۶۹۶
سال سوم و چہارم	۱۰۹	۱۱۵	۲۲۴
میزان	۴۸۳	۴۳۷	۹۲۰
مجموعے کی فیصدی	۵۲٫۱۵	۴۷٫۵	۱۰۰

گوشوارہ نمبر ۴

ایڈورڈس کالج پشاور کے مقیم اور غیر مقیم طلبا کی تفصیل

جماعت	مقیم	غیر مقیم	میزان
سال اول و دوم	۱۷	۲۶۵	۲۸۲
سال سوم و چہارم	۶	۳۷	۴۳
میزان	۲۳	۳۰۲	۳۲۵
مجموعہ کی فی صدی	۷	۹۳	۱۰۰

گوشوارہ نمبر ۵ کے بموجب تمام طلبا (مذکور) کو ایک ساتھ ملا کر ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ ان میں سے ۲۵ سے ۵۴ فی صد تک سرکاری ملازمین کے بیٹے یا متعلقین ہیں جبکہ ۲۶ سے ۴۳ فی صد تک زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، تجارت پیشہ طبقہ کی نمائندگی ۱۷ اور ۳۲ فی صدی کے درمیان ہے، مزارعین کے گروہ سے تعلق رکھنے والے طلبا گورنمنٹ اسلامیہ کالج کی مجموعی تعداد کا صرف ایک فی صد ہیں۔ جبکہ دوسرے اداروں میں ان کی عدم موجودگی قابل توجہ ہے۔ یہ صورت حالات بڑی افسوسناک ہے، لہذا ضروری ہے کہ حکومت یا یونیورسٹی کی طرف سے ان کے لئے مخصوص وظائف مہیا کئے جائیں۔

جہاں تک طالبات کا تعلق ہے ان میں سرکاری ملازم خاندانوں کا حصہ ۷۰ فی صدی ہے زمیندار اور تاجروں میں سے ہر ایک ۱۵ فی صدی حصہ لیتے ہیں، یہاں بھی مزارعین اور دوسرے طبقوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

گوشوارہ نمبر ۵

والد یا نگران کی معاشرتی حیثیت

کالج کا نام	سرکاری ملازمین	زمیندار	تجارت پیشہ	مزارعین	دیگر پیشے
گورنمنٹ اسلامیہ کالج پشاور	۳۶ فیصد	۴۲ فیصد	۱۷ فیصد	۱ فیصد	۴ فیصد
فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور	۷۰ "	۱۵ "	۱۵ "	—	—
گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد	۴۵ "	۲۶ "	۲۹ "	—	—
ایڈورڈس کالج۔ پشاور	۳۵ "	۲۸ "	۳۲ "	—	۵ فیصد

مزید براں اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۸۰ سے ۸۴ فی صدی تک طلبا کے والد یا نگران خواندہ ہیں، ماؤں میں خواندگی ۱۶ اور ۶۸ فی صد کے درمیان ہے۔ طلبا اور طالبات کے درمیان ایک بڑا نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ موخرالذکر کے خاندانوں میں ایک فرد بھی ناخواندہ نہیں، جبکہ طلبا کے خاندانوں میں خاص کر ان کی ماؤں اور بہنوں میں ناخواندگی کی فی صدی کافی ہے، مندرجہ ذیل گوشوارہ اس پہلو پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۶

خاندان میں خواندگی کی کیفیت

کالج کا نام	والد		والدہ		بھائی		بہنیں	
	خواندہ	ناخواندہ	خواندہ	ناخواندہ	خواندہ	ناخواندہ	خواندہ	ناخواندہ
	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد
گورنمنٹ اسلامیہ کالج۔ پشاور	۸۲	۱۸	۲۵	۷۵	۹۰	۱۰	۶۹	۳۱
فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور	× ۸۰	۶	۶۸	۳۰	۱۰۰	—	۱۰۰	—
گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد	۸۰	۲۰	۱۶	۸۴	۷۸	۲۲	۶۸	۳۲
ایڈورڈس کالج۔ پشاور	۸۴	۱۶	۴۱	۵۹	۸۴	۱۶	۷۶	۲۴

× ۱۴ فی صد لڑکیوں کے والد فوت ہو چکے ہیں۔ ان لڑکیوں نے اپنے نگران کی خواندگی یا ناخواندگی کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

جیسا کہ گوشوارہ نمبر ۷ سے ظاہر ہے کہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے تمام طلبا اردو بول بھی سکتے ہیں اور لکھ بھی سکتے ہیں، ان میں سے ۸۲ فی صدی پشتو بول سکتے ہیں لیکن صرف ۴۹ فی صد لکھ پڑھ سکتے ہیں، ایک اچھی خاصی تعداد پنجابی بول سکتی ہے لیکن صرف ۳ سے ۱۳ فی صدی تک لکھ سکتے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۷

مختلف کالجوں میں مختلف زبانیں جاننے والے طلبا کی فیصدی

کالج کا نام	پشتو		پنجابی		اردو		فارسی	
	تقریر	تحریر	تقریر	تحریر	تقریر	تحریر	تقریر	تحریر
	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد
گورنمنٹ اسلامیہ کالج - پشاور	۸۳	۴۹	۴۶	۱۳	۹۸×	۹۶×	۱۹	۱۹
فرنٹیر کالج فار ویمن - پشاور	۶۵	۱۸	۸۲	—	۱۰۰	۱۰۰	—	۱۵
ایڈورڈس کالج - پشاور	۷۹	۲۶	۶۰	۸	۱۰۰	۱۰۰	۲۲	۲۹
گورنمنٹ کالج - ایبٹ آباد	۳۲	۱۳	۹۴	۳	۱۰۰	۱۰۰	۱۶	۲۶

× بعض طلبا نے عمداً اصلیت کو چھپایا ہے۔ اس لئے کہ پرائمری اور مڈل میں اردو لازمی مضمون ہے۔

والد یا نگران کی آمدنی کی تفاصیل مختلف کالجوں کے دفتری کاغذات سے لی گئی ہیں، ان کے قابل اعتماد ہونے میں مجھے بہت کچھ شک ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اس کی تفصیلات گوشوارہ نمبر ۸ میں) درج ذیل کی جاتی ہیں، میری یہ تجویز ہے کہ آئندہ سے غیر کاشت کار طلبا کو کسی گزیٹڈ افسر سے آمدنی کا تصدیق نامہ لانے کی ہدایت کی جائے۔ اور کاشت کار طبقہ سے تعلق رکھنے والے طالب علم سرکاری مال گذاری کا اطمینان بخش ثبوت پیش کریں، تمام ایسے طلبا سے جن کے والد مبلغ ۵۰۰ روپے ماہوار یا اس سے زیادہ کما لیتے ہیں۔ دونی فیس وصول کی جائے جس میں سے نصف ایک مخصوص غریب فنڈ میں جانا چاہیے، جو ہر کالج میں قائم ہو۔

گوشوارہ نمبر ۸

والد یا نگراں کی آمدنی

کالج کا نام	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد	فیصد
گورنمنٹ اسلامیہ کالج پشاور	۱۰٫۶	۲۵٫۵	۱۳٫۵	۸٫۸	۱۳٫۵	۱۴	۱۴
فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور	۱۷	۱۲	۹	۹	۱۵	۱۷	۹
گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد	۱۲	۲۹	۲۲	—	۱۶	۶	۳
ایڈورڈس کالج۔ پشاور	۱۱	۳۰	۱۱	۲۲	۹	۱۲	۴

طلبا کی بڑی اکثریت کا مقصدِ تعلیم سرکاری ملازمت ہے۔ ۵۹ فی صدی لڑکیاں تعلیمی ملازمت کے لیے پڑھ رہی ہیں اور ۳۸ فی صدی علم اور روشن خیالی کی غرض سے اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہیں۔ گوشوارہ نمبر ۹ ہر کالج میں نمونوں (منتخب طلبا) کے مقصدِ تعلیم پر روشنی ڈالتا ہے، سرکاری ملازمتوں کی بھوک کچھ تو موجودہ ناقص نظامِ تعلیم کی وجہ سے ہے اور کچھ ہمارے یہاں صنعتوں کی کمی کے باعث۔ یہ صورتِ حالات اس نتیجہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ملک کے موجودہ نظامِ تعلیم کی از سرِ نو تنظیم ہونا چاہئے ورنہ اس کا نتیجہ اپنی تمام بلا سامانیوں سمیت تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری ہوگا۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار کا ایک قابلِ توجہ رُخ یہ ہے کہ فوجی عہدوں کے آرزو مند صرف ۱۲ سے ۱۵ فی صد تک ہیں جو پٹھانوں جیسی جنگجو قوم سے اور اس ملک کے ایک اوسط شہری کی امید سے بہت کم ہے۔

گوشوارہ نمبر ۹

مقصد تعلیم

کالج کا نام	فوج	سرکاری ملازمت	تجارت	خدمت خلق	تعلیم برائے علم
	فیصدی	فیصدی	فیصدی	فیصدی	فیصدی
گورنمنٹ اسلامیہ کالج۔ پشاور	۱۲ر۱	۷۰ر۲	۱۷ر۷	—	—
فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور	—	۵۹	—	۳	۳۸
گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد	—	۷۸	۲۲	—	—
ایڈورڈس کالج۔ پشاور	۱۵	۶۱	۲۴	—	—

مندرجہ ذیل گوشوارہ مختلف کالجوں میں طلبا کی علمی زندگی کے متعلق دلچسپ تفصیلات پیش کرتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱۰

ادارے کا نام	[illegible]	ڈویژن جو طالب علم کو میٹرک کے امتحان میں ملا			[illegible]	ڈویژن جس میں طلبا انٹرمیڈیٹ امتحان میں قرار دیئے گئے		
		اول	دوم	سوم		اول	دوم	سوم
گورنمنٹ اسلامیہ کالج۔ پشاور	۱۴۶	۲۳	۷۵	۴۷	۵۳	۲ (۱۰)×	۱۱ (۲۵)×	۲۰ (۱۸)×
فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور	۲۷	۶	۱۸	۳	۷	(۱)×	۱ (۱۵)×	۶ (۱)×
ایڈورڈس کالج۔ پشاور	۴۸	۱	۲۱	۲۶	۱۵	(۳)×	۳ (۱۰)×	۱۲ (۲)×
گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد	۲۸	۶	۱۳	۹	۳	(۱)×	(۲)×	۳ (×)

× میٹرک میں

گورنمنٹ اسلامیہ کالج پشاور

انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں پڑھنے والے ۱۴۶ طلبا میں سے میٹرک کے امتحان میں ۲۲ (مجموعی تعداد کا ۱۴٪) درجۂ اول، ۷۵ (مجموعی تعداد کا ۵۱٪) درجۂ دوم میں اور ۴۷ (مجموعی تعداد کا ۳۲٪) درجۂ سوم میں پاس ہوئے تھے۔ اسکے مقابلے میں ڈگری کے طلبا کی حالت غیر اطمینان بخش ہے۔ ۵۳ طلبہ میں سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ۲ (یعنی ۴٪) کو درجہ اول ملا تھا ۱۱ (یعنی ۲۱٪) نے درجہ دوم حاصل کیا تھا اور باقی (یعنی ۷۵٪) درجہ سوم میں پاس ہوئے ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان ۵۳ طلبا میں سے میٹرک کے امتحان میں ۱۰ نے درجۂ اول، ۲۵ نے درجۂ دوم اور ۱۸ نے درجۂ سوم حاصل کیا تھا تو تنزلی کی کیفیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور سے طلبا اپنے تعلیمی معیار کو برقرار نہ رکھ سکے، یہ کیفیت حقیقتاً قابل افسوس ہے۔

فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور

گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کے طلبا میں کارگذاریوں کی نمایاں عدم مساوات فرنٹیر کالج فار ویمن میں اور بھی زیادہ ہو گئی ہے، انٹرمیڈیٹ کی ۲۲ فی صدی (یعنی ۲۷ میں سے ۶) طالبات نے اپنے میٹرک کے امتحان میں درجۂ اول حاصل کیا تھا، مگر ڈگری کی جماعتوں میں ایک طالبہ بھی ایسی نہ تھی جو انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں درجۂ اول حاصل کر سکی ہو، اس کے علاوہ انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں دو تہائی طالبات (یعنی ۲۷ میں سے ۱۸) ایسی تھیں جنھوں نے میٹرک کے امتحان میں درجۂ دوم حاصل کیا تھا لیکن ڈگری کی جماعتوں میں، ۷ طالبات میں سے صرف ایک (یعنی ۱۴٪) انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں درجۂ دوم حاصل کر سکی تھی، جب ہم انٹرمیڈیٹ کی اُن ۱۱ فی صد طالبات کا مقابلہ جو میٹرک کے امتحان میں درجۂ سوم میں پاس ہوئی تھیں، ان ۸۶ فی صدی طالبات سے کرتے ہیں جنھوں نے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں یہی درجہ حاصل کیا تھا تو صورت حالات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے، ان حقائق سے تعلیمی معیار کی تنزلی واضح ہو جاتی ہے۔

ایڈورڈس کالج۔ پشاور

یہاں پر حالت بہت زیادہ قابل افسوس ہے، انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے ۴۸ طلبا میں سے

میٹرک کے امتحان میں صرف ایک نے درجۂ اول حاصل کیا تھا۔ ۱۲ کو درجۂ دوم ملا تھا اور ۲ کو درجۂ سوم میں قرار دیا گیا تھا۔ جب ہم ڈگری کے طلبا کا جائزہ لیتے ہیں تو صورتِ حالات اور بھی زیادہ غیر تسلی بخش ہو جاتی ہے ۱۵ طلبا میں سے کوئی بھی درجۂ اول نہیں حاصل کر سکا تھا۔ صرف ۳ طلبا (مجموعی تعداد کا ۲۰%) نے درجۂ دوم حاصل کیا تھا اور باقی درجۂ سوم میں آئے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں علی الترتیب ۳، ۱۰ اور ۲ طلبا درجۂ اول، دوم اور سوم میں رکھے گئے تھے۔

گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

انٹرمیڈیٹ کے طلبا کی تک فرنٹیئر کالج فار ویمن کی سی کیفیت ہے، انٹرمیڈیٹ کے ۲۸ طلبا میں سے علی الترتیب ۷، ۱۲ اور ۹ طلبا نے درجۂ اول دوم اور سوم حاصل کیا تھا۔ اس کے برعکس ڈگری جماعتوں کے تینوں طلبا انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں درجۂ سوم میں رکھے گئے تھے، میٹرک کے امتحان میں ان کی کارگزاری بہرحال تسلی بخش تھی، ایک نے درجۂ اول حاصل کیا تھا اور باقی دو نے درجۂ دوم۔ درجۂ سوم میں کوئی بھی نہ تھا۔

گوشوارہ نمبر ۱۱ مختلف مدات میں نمونوں (SAMPLLS) کے اخراجات کو ظاہر کرتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱۱

مختلف مدات میں نمائندہ طلبا کے اوسط ماہواری اخراجات

مدات	اسلامیہ کالج۔ پشاور			ایڈورڈس کالج پشاور			فرنٹیئر کالج فار ویمن۔ پشاور			گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد		
	روپے	آنے	پائی	روپے	آنے	پائی	روپے	آنے	پائی	روپے	آنے	پائی
لباس	۱۷	۷	۰	۱۱	۲	۰	۱۷	۲	۰	۱۲	۹	۰
کتابیں	۶	۱۲	۰	۷	۱۴	۰	۴	۲	۰	۶	۵	۰
سامانِ نوشت و خواند	۱	۲	۰	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۱	۱۱	۰
دودھ	۴	۴	۰	۳	۹	۰	۴	۲	۰	۷	۳	۰
چائے	۵	۰	۰	۷	۷	۰	۷	۰	۰	۷	۱۳	۰

شوارہ نمبر ۱۱ الصفحہ ماسبق

مدات	اسلامیہ کالج ۔ پشاور			ایڈورڈز کالج ۔ پشاور			فرنٹیر کالج فار ویمن ۔ پشاور			گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد		
	پائی	آنے	روپے	پائی	آنے	روپے	پائی	آنے	روپے	پائی	آنے	روپے
پھل	۰	۱۱	۴	۰	۳	۶	۰	۳	۴	۰	۰	۴
مہانداری	۰	۰	۸	۰	۰	۸	۰	۵	۸	۰	۰	۸
کتاب	۰	۰	۲	۰	۹	۱	۰	۵	۱	۰	۰	۱
سامانِ زینت	۰	۲	۱	۰	۹	۴	۰	۷	۳	۰	۵	۳
سگریٹ	۰	۸	۰	۰	۹	۶	۰	۰	۰	۰	۵	۹
سینما	۰	۲	۱	۰	۰	۴	۰	۳	۲	۰	۹	۵
حجامت	۰	۰	۱	۰	۶	۱	۰	۰	۰	۶	۰	۱
دوا	۰	۹	۱	۰	۱۱	۱	۰	۲	۴	۰	۱۳	۰
اخبار و رسائل	۰	۰	۰	۰	۶	۰	۰	۴	۱	۰	۰	۰
مشاغل	۰	۰	۰	۰	۳	۰	۰	۱۵	۲	۰	۰	۰
ٹینس وغیرہ	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۷	۲	۰	۰	۰
میزان	۰	۴	۲۸	۰	۸	۴۵	۰	۹	۶۳	۶	۹	۶۷

ان اعداد پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور سے طلبا نے کیوں کر بعض مدات میں اپنے اخراجات کم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ گورنمنٹ کالج کے نمونوں (SAMPLLS) نے خصوصیت کے ساتھ سینما۔ سگریٹ اور سامانِ زینت وغیرہ کے سلسلے میں اہم معلومات چھپانے کی کوشش کی ہے ایک بہت واضح مثال لے لیجیے۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں کو آپریٹو اسٹور پر دسمبر ۱۹۵۱ء میں

سگرٹ کی بکری مبلغ ۲۱۲۸ روپے ۱۴ آنے ۶ پائی ہوئی۔ آزادی کے ساتھ مال بیچنے اور اس پر
پابندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ بکری کی رقم بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ جب سگرٹ کی
رسد آزادی سے مہیا ہوتی ہے تو تقریباً تین ہزار روپے تک بکری پہونچ جاتی ہے۔ کوآپریٹو اسٹور
کے علاوہ ایک اور دوکان بھی ہے، جہاں سگرٹ بکتے ہیں، اس کے علاوہ طلبا اکثر شہر جایا کرتے ہیں
اور اپنی ضروریات وہاں کے دوکان داروں سے خرید لیتے ہیں، میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ اساتذہ
... اور ان افراد کو چھوڑ کر جو تمباکو نوشی کرتے ہیں، گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے ۹۲۰ طلبا کم سے کم ۴,۵۰۰ روپے
ماہوار صرف کرتے ہیں، اس طرح صرف سگرٹ پر کم سے کم ۵ روپے ماہوار فی طالب علم صرف ہوتا ہے
میں نے متعدد طلبا سے اس مسئلے پر آزادانہ بات چیت کی ہے اور میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض
افراد کا سگرٹ کا خرچ ۲۰ روپے ماہوار سے اوپر ہوتا ہے۔

کالج کی فیس جو ماہوار واجب الادا ہے اور صبح و شام کے کھانے کا کم سے کم خرچ مبلغ ۴۴ روپے
شامل کرکے پشاور اور ایبٹ آباد کے کالجوں میں اوسط خرچ مبلغ ۱۰۵ روپے ماہوار سے کم نہیں
ہمارے جیسے غریب ملک کے لئے یہ رقم بہت ہی زیادہ ہے، اور جب تک اعلیٰ تعلیم کے اخراجات
گھٹائے نہیں جائیں گے، اس وقت تک قوم کے غریب لیکن اہل افراد کے لئے ترقی کی زیادہ
گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہتا چلوں کہ دو نمونوں (SAMPLES) نے اقبال کیا کہ وہ شراب پیتے ہیں۔

جسمانی اور طبی معائنہ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل معلومات کے لئے میں ناظم تربیت جسمانی
گورنمنٹ اسلامیہ کالج۔ پشاور کا ممنون ہوں۔

گوشوارہ نمبر ۱۲

فی صدی طلبا مریض اور مرض

[illegible]	معائنہ کا سال	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۲۴۰	۱۹۵۱	۲۰	۱۵	—	۵	۶	۱	—	۲	۵	۲	۵	۱	۰
۳۰۹	۱۹۵۲	۱۴	۷	۱۰	۹	۷	۱	۲	۱	۱۰	۵	۵	۱	۵

بڑھتے ہوئے دوران خون کے مریضوں کی زیادہ فی صدی بظاہر بہت زیادہ گائے کا گوشت کھانے
ر تمباکو نوشی کا نتیجہ ہے، اگر گرمیوں میں طلبا سے لازمی طور پر مچھر دانیاں استعمال کرائی جائیں تو ملیریا
واقعات قابل لحاظ حد تک کم ہو جائیں گے جسمانی کمزوری کا سبب یہ حقیقت قرار دی جاتی ہے کہ
ت سے طلبا کے گھر غیر صحت بخش حصوں میں واقع ہیں، اور بصورت دیگر قوت بخش غذا کھانے کی استطاعت
ہیں رکھتے، پشاور یونی ورسٹی سے متعلقہ کسی کالج میں شام کے کھیل لازمی نہیں ہیں، میری یہ رائے ہے
اس سلسلے میں فوراً اقدام کیا جائے اور تمام طلبا کو شام کے کسی کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کا طبی معائنہ جتنا ہونا چاہیئے اتنا مکمل اور باقاعدہ نہیں ہے، یہاں
یں یہ تجویز کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ طبی معائنہ ماہرین خصوصی کی ایک ایسی جماعت کرے جس میں
یک ادویہ کا ماہر۔ ایک آنکھوں کا سرجن۔ ایک تپ دق کا ماہر وغیرہ وغیرہ شامل ہوں۔ اور ہر
ارب علم کے تن درست ہونے یا نہ ہونے کی رپورٹ اطلاع اور ضروری کارروائی کے لئے اس کے
ران کے پاس بھیجی جائے، ماہرین ہر کالج میں ایک ساتھ جائیں اور ان کی فیس پشاور یونیورسٹی
کی طرف سے ادا کی جائے۔

روزانہ اخبار پڑھنے والے طلبا بہت نہیں ہیں، گورنمنٹ اسلامیہ کالج کے ۱۹۹ طلبا میں سے
۸۹ روزانہ اخبار پڑھتے ہیں، جب کہ فرنٹیر کالج فار ویمن میں ایسی طالبات کی تعداد ۱۰ ہے
گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد کے دس طلبا کے مقابلے میں ایڈورڈس کالج کے ۳۰ طلبا اخبار
پڑھتے ہیں۔

آخر میں میں اپنے ان شرکائے کار اور طلبا کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے
اس معاشری و اقتصادی جائزے کے دوران میں میری ہر ممکن امداد فرمائی۔

(سالنامہ پشاور یونی ورسٹی)

قسط ۳

عراق میں لازمی تعلیم

محمد عبد العزیز

ترقی پسندانہ تعلیمی اقدام

اس میں شک نہیں کہ عراق میں لازمی تعلیم کو عملی صورت دینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، لیکن موجودہ سیاسی اور سماجی انقلابات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عراق جدید تعلیمی رجحانات کو تیزی سے اپنا رہا ہے اور اس طرح کچھ دنوں بعد وسیع پیمانے پر لازمی تعلیم کا جاری کرنا بھی ممکن ہو جائے گا۔ اس وقت عراق کی سماجی زندگی میں چند ایسے عوامل مصروف کار ہیں جو کسی نئی منزل تک پہونچنے میں ہماری رہ نمائی کر سکتے ہیں۔

معاشی اور سماجی عوامل

ملک کے معاشی اور سماجی نظام میں اس وقت جو تغیر رونما ہو رہا ہے، اس سے تعلیم کی توسیع اور لازمی تعلیم کی ترویج کے لئے ایک سازگار فضا پیدا ہو سکتی ہے، توقع کی جاتی ہے کہ اس سماجی اور معاشی انقلاب سے ملک کے محاصل میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور لوگوں کا معیار زندگی بھی بلند ہو سکے گا، اور جب معاشی بحران کے یہ بادل چھٹ جائیں گے تو والدین اپنے بچوں سے چھوٹے چھوٹے کام لینے کی بجائے انہیں خوشی خوشی مدرسوں میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا کریں گے۔

بعض روشن خیال زمینداروں نے اور بالخصوص وہ زمیندار جو ملک کی زرعی ترقی میں براہ راست حصّہ لیتے ہیں، کوشش کر رہے ہیں کہ دیہاتوں میں بھی بجلی پہونچ جائے، بجلی کی مدد سے زراعت کو جدید اور مفید بنایا جا سکتا ہے، یہ اسی جذبۂ کار کی برکت ہے کہ بارانی علاقوں میں بھی

شمار زمین کا آمد بنتی جاتی ہے، چنانچہ اب تک جو زمین بے آب و گیاہ ریگستان تھی اور جہاں گرد و غبار
ہ جھولوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، لہلہاتے ہوئے مرغزاروں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔
ن کی دیکھا دیکھی دوسرے زمیندار بھی زرعی سدھار کے منصوبے تیار کر رہے ہیں، جگہ جگہ قطعات
اضی میں جدید اصولوں کے مطابق کھیتی باڑی ہوتی ہے، جو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے فال نیک
ہے، اگر رفتار ترقی یوں ہی جاری رہی تو عراق بہت جلد آپ اپنا کفیل بن جائے گا۔ اگرچہ اس
تی سے زیادہ تر اونچا طبقہ ہی فائدہ اٹھا سکے گا، لیکن عوام کی موجودہ مشکلات بھی بہت کچھ دور
ہو جائیں گی۔

زمین کی آبادکاری کے سلسلے میں جو منصوبے اس وقت تک عمل میں آئے ہیں ان میں منصوبہ دجلہ
سب سے زیادہ امید افزا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ غیر آباد اور بنجر علاقے آباد ہو جائیں، افق میں
ریگ کے ٹیلے ہی نظر نہ آئیں بلکہ سرسبز اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں بھی دکھائی دیں۔

اس زرعی ترقی کے علاوہ تیل کے ذخائر اور چھوٹی موٹی صنعتوں کی آمدنی سے بھی عراق کی
مالی حالت بہتر ہو رہی ہے اور اسی مالی استحکام کی بدولت تعلیم بھی ترقی کے مراحل طے کرتی جا رہی
ہے، توقع ہے کہ کچھ دنوں میں عراق کسی ایسے تعلیمی نظام کے قیام میں کامیاب ہو جائے گا جو اس کے
ترقی یافتہ ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہوگا۔

ابتدائی مدارس

بالعموم عراق کے ابتدائی مدارس کا نظام تعلیم نصابی ہے لیکن رفتہ رفتہ بعض مقامات پر ایسے مدارس بھی قائم ہوتے جا رہے ہیں جو اپنے نظام میں زیادہ آزاد خیال ہیں، اور جہاں بچوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے تعلم بالعمل کے مواقع بھی بہم پہونچائے جاتے ہیں اور جو مدارس تربیتی اداروں سے متعلق ہیں ان کے نظام کار میں بھی انقلابی روح کارفرما ہے، پرانے تدریسی طریقے سے ہٹ کر وہ ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہو رہے ہیں، ان اداروں کے علاوہ بعض دوسرے مدرسے بھی جدید رجحانات کو اپنا رہے ہیں، اس دور میں محض سبق یاد کرنے کو تعلیم نہیں کہتے۔ تعلیم کا مقصد اس سے کہیں زیادہ

بلند و ارفع ہے : بچوں کو بولنے کا، بات کرنے کا اور کام کرنے کا موقع دینا نہایت ضروری ہے، ان مدرسوں میں معلم کی حیثیت بے جان مقرر کی نہیں زندہ دل رہنما کی ہوتی ہے، اس کا کام بچوں کے مشغلوں میں ان کی امداد کرنا ہوتا ہے، ان جدید مدرسوں کی عمارتیں کشادہ، صاف ستھری اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تعمیر کی گئی ہیں، ان میں ہوا اور پانی کا عمدہ انتظام ہوتا ہے بچوں کے کھیلنے کے لئے وسیع و عریض میدان اور سیر و تفریح کے لئے عمدہ باغات ہوتے ہیں، مدرسے کی اس دل خوش کن اور پر رونق فضا میں بچے کھیلتے اور پڑھتے نظر آتے ہیں۔

کنڈر گارٹن مدارس

آج سے کوئی سو سال پہلے فروبل نے جرمنی میں ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد بچوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت تھا یہ تحریک جرمنی میں تو نہ پنپ سکی لیکن فروبل کی زندگی میں ہی اس کے اثرات یورپ کے دوسرے ممالک میں تیزی سے پھیلنے لگے۔ اور تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کے بعد کنڈر گارٹن طریق تعلیم آج بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے سب سے زیادہ مناسب، موثر اور نفسیاتی سمجھا جاتا ہے، عراق میں اگرچہ کنڈر گارٹن مدرسوں کی کمی ہے۔ مگر جن ابتدائی مدرسوں میں تجدد کا رنگ جھلکنے لگا ہے ان میں کنڈر گارٹن طریق تعلیم کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، اور غالباً سب سے زیادہ قابل قدر یہی کنڈر گارٹن اسکول ہیں، ان میں سے بعض مدرسے اپنی عمارت، اپنے ساز و سامان اور اپنے طریق کار میں ترقی یافتہ ممالک سے بھی آگے ہیں، ان مدرسوں میں مدرسین کے لئے کام کرنے کی آزادی بھی ہے اور کام کے مواقع بھی، کسی متعین نصاب کو سامنے رکھ کر وہ کسی خاص مضمون کی گردان میں مصروف نہیں رہتے بلکہ بچوں کی ضروریات کے مطابق حالات کا جائزہ لے کر، درس و تدریس کے نئے طریقوں کو استعمال میں لاتے ہیں، اس کے لئے بڑی چھان بین اور ذہنی اپج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے بچوں کی صلاحیتوں پر اوس پڑنے کا احتمال نہیں رہتا۔ اور مدرسین کو بھی اپنے ذہنی افق کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کا موقع ملتا ہے، اگر یہی خیال اور یہی جذبہ عراق کے دوسرے ابتدائی مدرسوں میں پیدا ہو گیا تو یہی مدارس عراق کے نظام تعلیم میں ایک مسلسل اور دیرپا انقلاب لانے کے موجب

ہوں گے۔ آزادیٔ خیال اور آزادیٔ کار دو ایسے ہتھیار ہیں جو پرانے اور فرسودہ اداروں کے فکر میں نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کر سکتے ہیں۔

عراق کے معمولی ابتدائی مدارس میں بھی ترقی پسندی کی ہلکی ہلکی کرنیں ان کے تنگ و تاریک گوشوں کو منور کر رہی ہیں، نصابِ تعلیم اور طریقِ تدریس دونوں متباین اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، نئی شراب اور پرانا ساغر، لیکن اب ان مدرسوں میں بھی خود حرکی تعلیم اور تعلیم بالعمل کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے، ان کے گھٹے ہوئے ماحول اور روح فرسا حالات میں اس تحریک کے یہ معمولی سے نقوش بھی بہت زیادہ وسیع نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔

ابتدائی زراعتی مدارس

اس تحریر میں بار بار عراق کی زرعی زندگی کا حوالہ دیا گیا ہے اور زراعت کو جدید اصولوں کے مطابق از سرِ نو منظم کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، عراق کی زرعی ترقی کے لئے منرو کمیشن نے زرعی مدارس کے قیام کی سفارش کی تھی، ان سفارشات کو عملاً جاری کرنے کے لئے وقت اور زرِ کثیر دونوں کی ضرورت تھی، کسی مالی خلا میں رہ کر قومی تعمیر و ترقی کے منصوبوں کو مکمل کرنا دور از کار اور بعید از قیاس ہوتا ہے، عراق تعمیر و ترقی کے اس عبوری دور میں محض اسکیمیں ہی بنا سکتا تھا، ان اسکیموں کو عملاً رواج دینے کے لئے سازگار اور ترقی یافتہ ماحول کی ضرورت تھی، چنانچہ ۱۹۵۲ء میں وزارتِ معارف نے صوبائی ناظمین کو ہر صوبے میں تجرباتی۔ زراعتی مدارس کھولنے کی ہدایت کی، آج کل ہر صوبے میں اس قسم کا ایک مدرسہ ضرور موجود ہے۔ ان زراعتی مدرسوں کو جدید زرعی تکنیک اور جدید رجحانات کے مطابق نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آراضی کا ایک وسیع و عریض قطعہ ہر اسکول سے متعلق ہوتا ہے، بعض مدرسوں میں شیر خانے (ڈیری) اور جدید زراعتی مشینوں کا بھی انتظام ہے، اگرچہ ان مدرسوں کی عمارتیں فی الحال اپنی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہیں، ان میں مکمل ساز و سامان بھی نہیں ہوتا، لیکن ان نامساعد اور ناسازگار حالات کے باوجود یہ ادارے عوامی زندگی سے زیادہ قریب ہوتے جا رہے ہیں۔

مشرقی ممالک کے تعلیمی نظام کا ایک بڑا نقص تعلیم کا تمام تر نصابی ہونا ہے، عراق کے زراعتی

مدارس بھی اس نتیجے سے مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے لیکن نصابی پابندیوں کے ساتھ ان میں سے بیشتر مدارس عملاً کاشت کاری میں براہ راست حصہ لے رہے ہیں، ان کے چھوٹے چھوٹے تجربات سے گرد و نواح کے کاشت کار اور زمیندار بہت زیادہ اثر قبول کر رہے ہیں، وزارت معارف ان مدرسوں کی ضرورت اور ان کے احاطہ کار کی وسعت کو شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ اگر ان مدرسوں کی عمارتیں مع ان کے ساز و سامان اور ان کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے معیار کو بلند کیا جائے تو یہی مدارس دیہاتی مدرسوں کے لئے عمدہ نمونے بن سکتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی ایسے زراعتی مدرسوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے، ملک کی زرعی ترقی کے لئے اور گاؤں کی تنظیم اور غیر صحت مند فضا کو خوش گوار اور صحت مند بنانے کے لئے اگر عراق کی اس تعلیمی پالیسی کو اس ملک میں بھی اپنانے کی کوشش کی جائے تو دیہاتی ابتدائی مدارس اس ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لے سکیں گے۔

صوبائی تعلیمی تحریکیں

عراق کا نظام تعلیم مرکزی ہے، وزارت معارف ہی عوام کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اور مدرسوں کی تعمیر اور ان کے اخراجات کی کفالت بھی اس کے فرائض میں داخل ہے لیکن اب دور دراز علاقوں میں بھی تعلیمی بیداری پھیل رہی ہے، اور تعلیم کی ترویج میں عوام خود براہ راست حصہ لینے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، حالات امید افزا ہیں، یہ عوامی بیداری عراق کے نظام تعلیم کے احاطہ کار کو اور زیادہ وسیع کر دے گی لیکن حکومت تعلیم کو ارزاں اور عام کرنے میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اسے عوام کا تعاون حاصل ہو، صرف سرکاری تعلیم گاہیں ملک کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں، صوبائی ناظمین تعلیم اگرچہ براہ راست مرکزی احکام کے تابع ہوتے ہیں۔ اور وہ خود نہ کوئی تعلیمی تحریک چلا سکتے ہیں اور نہ کسی اہم علاقائی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کوئی نیا ادارہ کھول سکتے ہیں، مگر مقامی تعلیم میں نیا سوز و گداز اور نئی راہیں پیدا کرنے میں اس تعلیمی مرکزیت کے باوجود بلا پیش قدمی کر رہے ہیں بعض صوبوں میں ناظمین تعلیم بوسیدہ عمارتوں اور غیر صحت مند ماحول کی تنگی اور اپنی مجبوریوں کے ماتم دار

نظر آتے ہیں اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے۔ وزارت معارف کے پاس اتنی فرصت کہاں سے آئے کہ وہ ان چھوٹی
چھوٹی ضروریات کی طرف توجہ دے لیکن بعض ناظمین زیادہ حساس ہیں۔ وہاں پر حرف شکایت لانے سے
دراصل ملک و ملت کی خدمت نہیں ہوتی، زندگی اس سے کہیں زیادہ گراں قدر ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتے
رہنے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اس لئے حکام اور عوام کے تعاون سے نئے نئے مدرسوں کی بنیاد ڈالنے
میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ایک صوبے میں محض ایک ناظم تعلیم کے جذبۂ کار کی بدولت بے شمار ابتدائی
مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ تین سال پہلے جب اسے صوبے کا ناظم مقرر کیا گیا تھا تو سارے علاقے میں صرف
۲۸ ابتدائی مدارس تھے۔ اب ان کی مجموعی تعداد ۵۵ سے اوپر ہے۔

تعلیم گاہوں کے قیام اور تعلیمی توسیع کے لئے حکومت سے کہیں زیادہ عوام کے جذبۂ عمل کی
ضرورت ہوتی ہے۔ اگر عوام اس کار نیک میں حصہ لینا اپنا قومی اور اخلاقی فرض سمجھنے لگیں تو بہت سی
برائیوں کا مداوا ہی ہو جائے، اور اگر صرف حکومت کی اسکیموں پر ہی قناعت کی جائے تو ترقی کی راہیں
مسدود ہو جاتی ہیں۔ آج پاکستان میں بھی ہماری نگاہیں حکومت کی طرف اٹھتی ہیں۔ جیسے قیام پاکستان کے
بعد تعلیم کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر عائد ہو گئی ہے، عوام کو اس سے کوئی سروکار نہیں، حالاں کہ
چاہئے تو یہ تھا کہ ان حالات میں نجی مساعی کو زیادہ تیز کیا جاتا، چھ سال کے طویل عرصے میں محض دو تین
عوامی اداروں کے قیام کا نشان ملتا ہے لیکن ان کی تعلیم اور ان کے ماحول کو معیاری نہیں کہا جا سکتا
ہمارا انتظام تعلیم مرکزی نہیں صوبائی ہے۔ صوبائی حکومتوں کو ابتدائی اور وسطانی تعلیم کی ترویج و ترقی
کا پورا پورا قانونی حق حاصل ہے۔ لیکن ان مدارس کو ان کے صحیح خدوخال میں دیکھنا ہے تو آپ کو
کسی گاؤں کا سفر کرنا ہوگا، ٹوٹی پھوٹی عمارت جو بعض اوقات محض ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتی
ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ عمارت گاؤں کے عین وسط میں کرائے پر لے لی جاتی ہے، یہی
بچوں کی تربیت گاہ کا کام دیتی ہے۔ اس ماحول میں بچوں کی جو تربیت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ
لگانا کچھ اتنا مشکل نہیں ہے۔ عراق کی طرح یہاں بھی لوگوں کے دلوں میں تعلیم کی توسیع و
اشاعت کا جذبہ تو پیدا ہو رہا ہے۔ لوگ بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں، مگر صحیح قیادت کی

عدم موجودگی میں یہ جذبات مرجھا جاتے ہیں۔ اور نگاہیں محض حکومت کی طرف اٹھ اٹھ کر پتھرا جاتی ہیں۔ ذاتی کوششوں اور نجی اداروں کے قیام کا مسئلہ نہ ہمارے سامنے آتا ہے اور نہ ہم اسے قابل توجہ سمجھتے ہیں۔

بہرصورت عراق میں تعلیمی بیداری پھیل رہی ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف حروف شناسی یا حساب کے چند موٹے موٹے اصولوں کو سمجھنا ہی نہیں رہا۔ عراقی عوام اسے زندگی سے زیادہ قریب اور ماحول آشنا دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں کہ دو چار لفظ پڑھ کر وہ اپنی پچھلی رفتار اور طریق بود وماند کو بھول جائیں اور سرچشمۂ علم سے انہیں پیاس بجھانے کا موقع نہ ملے۔ مدرسوں میں بھی بچوں کو زندگی کے حقائق سے نزدیک اور اپنے سماجی تقاضوں سے روشناس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے یہاں مدرسوں کو نصاب کے قید وبند سے نجات دلانے کے لئے کوششیں جاری ہیں۔

اس وقت تک عراق کی تعلیمی ضروریات کا اس کے سماجی معاشی اور سیاسی تقاضوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا، اور ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں جو ترقی ہوئی ہے اسے بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ ان رجحانات اور ترویج تعلیم کے شدید احساس کے پیش نظر عراق میں لازمی تعلیم کے امکانات زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے شدید احساس ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس احساس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمت وجرأت کے ساتھ صحیح جذبۂ کار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان مواقع کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے جو کسی نظام عمل کی تشکیل کے لئے ہمت شکن ثابت ہوتے ہیں۔ عراق کی تعلیمی ترقی کی راہ میں آنے والی مشکلات بھی واضح ہیں اگر صرف ابتدائی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کی پوری تعداد کے لئے قرأت وحساب دانی کے مدرسے کھول دیئے جائیں تو اس سے اس ملک کی تعلیمی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے تعلیم کو سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ اور مربوط کرنے کی۔ اگر عدم مطابقت کی یہی صورت قائم رہی تو انفرادی یا اجتماعی ترقی ممکن نہیں۔ موجودہ تخمینے کے مطابق مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد ۵۰۰،۰۰۰ ہے لیکن اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں فی الحال صرف ۲ فی صدی

ں کی تعلیم کا اہتمام ہو سکا ہے، اور وہ بھی ملک کی دوسری ضروریات کو روک کر۔ لازمی تعلیم کا موثر انداز
بجاری ہونا دیوانے کے خواب سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتا، صرف لازمی ابتدائی تعلیم کے لئے
ں کو اپنے موجودہ تعلیمی میزانیے کو دوگنا کرنا ہوگا اور اس صورت میں بھی بچوں کی تعلیم کا جو انتظام ہوگا
کسی طرح معیاری نہیں کہا جا سکے گا، جو طریق کار موجودہ ابتدائی مدارس میں جاری ہے اور جو رقم
مدرسوں کے اہتمام پر خرچ کی جاتی ہے نہ تو معیار کے مطابق ہے۔ اور نہ اس سے کسی اچھے نتیجے کی
ید ہو سکتی ہے اور بالفرض عراق اپنے تعلیمی مزانیے کو دوگنا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ مشکل آسان نہیں ہوتی
ی ابتدائی تعلیم کے لئے صرف متعین میزانیے اور ساز و سامان ہی کی ضرورت نہیں، اس کے لئے
بیت یافتہ مدرسین کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے اور اس کے لئے بھی مزید رقم مطلوب ہوگی جس کا
ہنہ لگانا مشکل ہے، عراق کے یہ مسائل نئے نہیں ۱۹۴۱ء میں وزارت معارف کی ایک مخصوص کمیٹی
دس سالہ پروگرام مرتب کیا تھا، اس پروگرام کی رو سے اگر انتظامی امور میں کچھ بنیادی اصلاحات
جائیں، اور حصول تعلیم کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے تو دس سال میں مدرسہ
نے والے بچوں کی تعداد کے نصف یعنی ۲۲۵۰۰۰ بچوں کی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا، اس
وگرام کی رو سے ایک سال میں ۴۰۰ مزید مدرسین کی تربیت کا بھی اہتمام ہو جائے گا، ہر سال ۱۲۰۰۰،
بچہ کا اضافہ ہوگا، تربیت یافتہ مدرسین کی یہ تعداد ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کافی ہوگی، وزارت معارف
بنی اس مہم میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ ابتدائی مدارس میں طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، تربیت یافتہ
مدرسین کی کمی ہے، اور عمارت اور ساز و سامان کی کمی کی وجہ سے بچے مدرسے میں داخل ہونے سے ہی
محروم رہ جاتے ہیں۔

اس تعلیمی ترقی کے لئے موجودہ تعلیمی تقاضوں کا پورا کرنا ضروری ہے، یونیسکو کمیشن نے اس
سلسلے میں جو سفارشات کی ہیں، ان سے عراق اور دوسرے کم ترقی یافتہ ممالک فائدہ اٹھا سکتے ہیں
سفارشات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قلیل میعاد پالیسی:

۲ - طویل میعاد پالیسی۔

آگے چل کر ان بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے جن کے والدین معاشی اور اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے اسکول بھیجنے سے معذور ہیں، اور انہیں کے ساتھ ساتھ ان بچوں سے بھی تغافل نہیں برتا جا سکتا جن کے والدین بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

قلیل میعاد پالیسی

موجودہ تعلیمی تقاضے اس وقت عراق کی سب سے اہم ضرورت ان بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہے جن کے والدین انہیں پڑھانا چاہتے ہیں، مگر مدرسوں کی کمی کی وجہ سے تعلیم دلانے سے محروم رہ جاتے ہیں بعض ماہرین تعلیم کا یہ خیال ہے کہ مدرسوں کی تعداد میں اضافہ کرنا کچھ اتنا زیادہ ضروری نہیں ہے، سب سے اہم اور ضروری کام پرانے مدرسوں کو جدید تدریسی ساز و سامان سے آراستہ کرنا ہے، ملک میں جو تعلیمی بیداری پھیل چکی ہے اس سے نئے مدارس کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے، والدین کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نئی درسگاہوں کی تلاش رہتی ہے، ان کے پیش نظر بچوں کی تعلیم بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جو ان کے لئے معاشی اور اقتصادی مسائل سے کہیں زیادہ پریشان کن ہوتا ہے، اگر ان ماہرین تعلیم کے نظریات کو تسلیم کر لیا جائے اور نئے مدارس کھولنے کی بجائے پرانے مدرسوں کے ساز و سامان کو درست کرنا ہی ضروری سمجھ لیا جائے تو اس سے ایک نہیں سیکڑوں والدین کو مایوس ہونا پڑے گا، اس سے ملک کی تعلیمی حالت درست نہیں ہوگی۔ لوگوں کے دلوں کو ٹھیس بھی لگے گی اور تعلیم کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا اور بچے بھی تعلیم سے بے بہرہ رہ کر اپنی زندگی کو کسی مفید کام میں نہیں لگا سکیں گے ہو بائی ناظمین تعلیم سے اگر ان بچوں کے اعداد و شمار طلب کئے جائیں جو تعلیم حاصل کرنے کے متمنی ہیں، مگر مدرسوں کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ بھی پوچھا جائے کہ ان بچوں کے لئے کتنے مدرسوں اور کتنے اساتذہ کی ضرورت ہوگی تو یہ اعداد و شمار غالباً لوگوں کے لئے حیران کن ہوں گے، حق یہ ہے کہ اس وقت تک عراق میں تعلیم کی ترویج کے لئے کوئی خاص اقدام نہیں کیا گیا، اور نہ اس قسم کے اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں، کہ

جودہ حالات میں کتنے بچے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کتنے نئے مدرسوں اور کتنے نئے اساتذہ
ضرورت ہوگی لیکن جب یہ اعداد و شمار مرتب ہو جائیں گے تو اس سے عراق میں تعلیم کی بڑھتی ہوئی
نے کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔

ان اعداد و شمار سے عراق کی تعلیمی ضروریات متعین کی جا سکتی ہیں۔ اور تعین کار کے بعد ہر کوئی
لیمی میزانیے سے ان ضروریات کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے لیکن تعلیمی ضروریات کا پورا ہونا
ت کا مالی استحکام ہی عراق کو منزل تک نہیں پہونچا سکتا۔ اس سلسلے میں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ
رے کی عمارتوں میں تعلیم و تربیت کا اہتمام نہ کیا جائے، بلکہ اس رقم سے تربیتی اداروں میں مزید اساتذہ کی
بیت کا انتظام کیا جائے، اگر اساتذہ کی تربیت کے لئے فوری اقدام کیا گیا تو بہت جلد یہ کمی پوری
ہو سکتی ہے۔ اب اس جگہ ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ما کرده رقوم جو عمارتوں کے کرائے
رف کی جاتی ہیں، انہیں اساتذہ کی تربیت پر خرچ کر دیا جائے۔ مگر اس سے مدرسوں اور عمارتوں
کمی کا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا، تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کچھ نئی عمارتوں کی بھی
ضرورت ہوگی، اگر ہمت سے کام لیا جائے اور تعلیم کو پھیلانے کی مہم جاری کی جائے تو گاؤں اور
قصبوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو ابتدائی تعلیم کے لئے رضاکارانہ طور پر عمارتیں دے دیں گے۔
بڑے شہروں میں ایک عراقی ماہر اقتصادیات کی تجویز کے مطابق عوامی قرضے کی مدد سے عمارتیں تعمیر
کی جائیں اور کرائے پر جو رقم خرچ ہو رہی ہے اس سے اس قرض کی ادائیگی کی جائے، بہر صورت
اس وقت سب سے زیادہ اہمیت ابتدائی مدارس کے انصرام اور اچھے نظم و نسق کی ہے۔ آیا وزارت معارف
..... سماج کی ان تعلیمی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے یا نہیں، اسے آنے والا زمانہ ہی بتا سکے گا۔

مرکزی نظام کی اصلاح

لیکن اس سے پہلے کہ وزارت معارف تعلیمی توسیع و ترقی کے سلسلے میں اقدام کرے اور اپنی
ہمت دیا مردی کا ثبوت پیش کرے ۱۹۵۳ء کے دس سالہ پروگرام کی مخصوص کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنا

ضروری ہے۔

عراق کا تعلیمی مفاد اور وزیرِ معارف | کسی نظام کے قیام و انصرام کے لئے اس کی تعلیمی کل کا مضبوط
بنیادوں پر قائم ہونا ضروری ہے، پچھلے دنوں اس ملک میں محض ایک وزیر کے تبدیل ہونے سے
پورا نظامِ تعلیم درہم برہم ہو گیا، یہ تبدیلیاں کسی سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ نہیں تھیں، بلکہ تغیر برائے تغیر کے
پیشِ نظر عمل میں آ رہی تھیں، اور صرف تعلیمی نظام کا رئیس ہی تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ محکمہ تعلیم
کام کرنے والوں کو بھی تبدیل کر دیا گیا، اس سے کام میں تسلسل اور انہماک نہیں پیدا ہو سکتا، بعض لوگ
خیال ہے کہ یہ محض تنگ نظری اور سیاسی گروہ بندی کا نتیجہ ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ضرورت اس امر کی
ہے کہ محکموں کو ان سیاسی بکھیڑوں اور ذاتی منفعت کے جھمیلوں سے بلند رکھا جائے، تعلیمی ترقی پر
کسی سماج کی سیاسی ترقی کا انحصار ہوتا ہے لیکن یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ اس قسم کی تبدیلیاں وزیر
کی ذاتی پسند و ناپسند اور اس کے نجی اثرات کی بنا پر ہوتی رہتی ہیں، ایک ایسے ملک میں جو ابھی
ابھی تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہوا ہے ایسے واقعات کا رونما ہونا کچھ اتنا تعجب خیز نہیں، ہر نیا وزیر
اپنے عہدِ وزارت کو نقش بر دوام کرنے کی فکر میں رہتا ہے، یہ ٹھیک ہے اسے کام کرنے کا پورا
حق ہے، لیکن اسے پورے نظامِ تعلیم کو درہم برہم کرنے کے کلی اختیارات نہیں ہونے چاہئیں
ہر نئے وزیر کے لیے نئی تجویزوں کو بروئے کار لانے سے پہلے محکمہ تعلیم اور دوسرے ماہرینِ تعلیم
سے مشورہ لینا لازمی قرار دے دیا جائے، خدا کا شکر ہے کہ اب حالات بدل رہے ہیں، اور
وزیرِ معارف اپنی محدود تعلیمی معلومات یا اپنے سیاسی گروہ کے مفاد سے قطعِ نظر ملک کے تعلیمی نظام
ضامن بنتا جا رہا ہے، اور یہ ایک اچھا شگون ہے ؛

مدارس دینیۂ عربیہ

منظور احسن

پرانی وضع کے دینی مدارس عربیہ کا تذکرہ نہ تو دورِ حاضرہ کے تعلیمی حلقوں میں کوئی ضروری بحث تصور کیا گیا ہے۔ اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ مبذول کی جاتی ہے، لیکن اس بات کا مشکل سے یقین کیا جائے گا کہ موجودہ مدارس کے نظام و نصاب تعلیم، طریق امتحان و ضبط کے بیشتر پہلو ایسے ہیں کہ اگر اُن پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اپنی سیدھی سادھی شکل میں بھی سالہا سال کے تجربوں اور فکری فنی کاوشات سے ہم آہنگ ثابت نہ ہوں گے، شاید اس کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہ ہو۔

بدقسمتی سے ہماری توقعات کے علی الرّغم مملکت پاکستان میں دینی معیاری مدارس عربیہ کا وجود تقریباً مفقود ہے، ہندوستان میں دیوبند کا مدرسہ قاسم العلوم۔ دہلی کے مدارس امینیہ و حسینیہ و فتح پوری و مدرسہ حسین بخش و مدرسۂ عبدالرب۔ سہارنپور کا مدرسہ مظاہر العلوم تھانہ بھون ... کا مدرسہ اشرفیہ کانپور کا مدرسہ الٰہیات اور الہ آباد کا مدرسہ مصباح العلوم دینی مدارس میں مقتدر اور معتبر حیثیت کے مالک تھے۔ لاہور میں جامعہ اشرفیہ کے علاوہ اور کوئی مدرسہ قابل ذکر نہیں۔ دیوبند کے مدرسے میں طلبہ کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی اور دہلی کے مدارس سے مستفیض ہونے والے طلبہ کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے کم نہ تھی، ان مدارس میں حصولِ تعلیم کی غرض سے بنگال۔ آسام۔ سلہٹ۔ جاوا۔ سماترا۔ سیلون۔ حبش۔ عرب۔ ترکی۔ چین۔ افغانستان اور دوسرے مختلف مقامات سے طلبہ آتے تھے اور عرصۂ تعلیم

۵ سال سے ۱۰ سال تک جاری رہتا تھا۔

سلسلۂ درس نظامیہ کے تعلیمی مضامین کی ایک تخمینی فہرست یہ ہے۔

صرف۔ نحو۔ فقہ۔ منطق۔ فلسفہ۔ حدیث۔ تفسیر۔ تجوید۔ ادب۔ اصول فقہ۔ اصول حدیث اصول تفسیر۔ علم الرجال۔ فرائض۔ مناظرہ۔ طب۔ ہندسہ۔ اقلیدس۔ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ نجوم۔ طبیعات۔ الٰہیات اور فلسفہ مابعد الطبیعات۔ مدارس دینیہ کی انتظامی استطاعت کے مطابق ان مضامین میں سے چند یا کل کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

مدارس دینیہ میں جماعت بندی کا اصول ہمارے عوامی سرکاری مدارس سے مختلف ہے۔ مدارس سرکاری میں نصاب جماعت کی تکمیل کے لئے طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لیکن مدارس عربیہ میں طلباء کی جماعت اپنا نصاب خود مترتب کرتی ہے، کیوں کہ وہاں جماعت بندی کا انحصار مجرد دروس و اسباق پر ہے۔ کسی نصاب متعینہ پر نہیں ہے، چنانچہ اگر بالفرض ایک جماعت شرح وقایہ (فقہ کی ایک درسی کتاب) پڑھتی ہے تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ تمام جماعت ملاحسن (فلسفہ کی ایک درسی کتاب) کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہو۔ یہ طلبہ کے انفرادی رجحان اور ذہنی صلاحیت یا اور خارجی اسباب پر موقوف ہے کہ وہ فقہ کے ساتھ فلسفہ بھی پڑھنا چاہے یا نہیں۔ اس نظام کی بدولت طالب علم کی ذہنی صلاحیتوں میں باہمی تصادم کا اندیشہ نہیں رہتا اور اُس کی رجحانی فراست مجروح نہیں ہوتی۔

دینی مدارس میں جماعت کی تشکیل ایک خاص حلقۂ درس سے ہوتی ہے، چنانچہ وہاں پہلی۔ دوسری۔ تیسری جماعتوں کی بجائے کتب درسیہ کی جماعتیں کہلاتی ہیں۔ مثلاً درس ہدایہ درس جلالین۔ یا درس مشکوٰۃ وغیرہ کی جماعتیں۔ پھر ان کتب درسیہ کی تکمیل کے لئے سال بھر کی یا کوئی اور تقویمی مدت درکار نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لئے ایک تخمینی عرصہ مقرر ہوتا ہے جس میں اختلاف احوال کی بنا پر تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور درس کے ختم ہوتے ہی جماعت کی تحلیل ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ نہیں رہتا کہ ہمارے عوامی مدارس کی طرح مقررہ نصاب کی

تکمیل تعلیم سے قطع نظر سال بھر کے بعد حتمی طور پر اسے چھوڑ دینا پڑے ہیں کے باعث اکثر صورتوں میں سرکاری مدارس کے اوّل درجے میں کامیاب ہونے والے طلبا، بھی متعینہ نصاب کے بعض مضامین سے قطعاً نابلد رہ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم جو معلّم اور متعلم کی مشترکہ مساعی کا راس القاصد ہے۔ اپنے اصل موقف سے دُور جا پڑتا ہے۔ اور طالب علم امتحان میں کامیاب ہوکر بھی علم سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہمارے اعلیٰ مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کا عام معیارِ قابلیت اس حقیقت کا ایک کھلا ثبوت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سال کی مدرسی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی فطری فراست کا سہارا لئے بغیر محض تعلیمی نظام کے زیرِ اثر شاذ ونادر ہی کوئی طالب علم مطلوبہ معیارِ قابلیت پر پورا اترتا ہے، دینی مدارس اس صورتِ حالات سے بالکل بری ہیں۔

دینی مدارس میں جماعت کی ترتیب نشست وغیرہ بھی نہایت سادہ اور قدرتی اسلوب پر ہوتی ہے، اُستاد سامنے بیٹھتا ہے اور تلامذہ ایک حلقہ یا مربع مستطیل شکل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ تلامذہ میں سے کوئی ذہین طالب علم کتاب پڑھتا ہے اور استاد اُس کے معانی ومطالب کی تشریح کرتا رہتا ہے، چند یا بیشتر طلبا کو ہر روز قرأت کا موقع نہیں ملتا۔ البتہ ہر ایک کو سوال کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور تقریباً ہر سوال کا جواب استاد دیتا ہے، لیکن اونچی جماعتوں میں مبہم اور نامعقول سوالات یا بے تعلق ایرادات کی طرف مشائخ اساتذہ توجہ نہیں دیتے۔ سلسلہ درس نظامیہ کی تمام کتابیں با استثناء چند کتب ابتدائی عربی زبان میں ہیں۔

جامعی یا مدرسی تعلیم کا آغاز بالعموم میزان الصرف سے ہوتا ہے (جو علم صرف کی پہلی کتاب ہے) اور سلسلہ درس کتاب بخاری پر ختم متصور ہوتا ہے۔ یہ کتاب کتب احادیث کی مستند کتابوں میں سے مستند ترین کتاب حدیث ہے جس کو قرآن حکیم کے بعد صحت اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے اونچا درجہ دیا جاتا ہے، ان کتب احادیث کو صحاح ستہ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اور صحاح ستہ کے حلقۂ درس کو اصطلاح دورہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ دورہ کی تکمیل

کے بعد مدرسہ دینیہ کا طالب علم فارغ التحصیل متصور ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا مضامین میں سے متاخر الذکر دس یا رہ مضامین کی جانب دورہ کی تکمیل سے پہلے توجہ نہیں دی جاتی، یہ مضامین اختیاری یا مزید علیہ متصور ہوتے ہیں۔

امتحان کا طریقہ بھی ہمارے مدارس سرکاری کے طریق امتحان سے مختلف ہے۔ چنانچہ ایک آدھ کی استثنا کے ساتھ تمام مضامین کے امتحانات تقریری ہوتے ہیں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ کتب درسیہ میں سے کسی ایک حصہ کی قطع نظر اس سے کہ وہ مشکل ہو یا آسان مسلسل خواندگی کرائی جاتی ہے۔ اور اسی قراءت سے عربی زبان کی مہارت اور اس کی عمومی استعداد کا اندازہ لگانا ممکن ہوتا ہے کیوں کہ تمام کتب درسیہ اعراب سے معرّے ہوتی ہیں۔ اور عربی زبان کے تمام لسانی قواعد کی بنیاد حروفِ الفاظ کے اعراب و سکنات پر ہے۔ اور الفاظ کے آخری حروف کی حرکات کی صحت خواندگی پر تمام فہم مطالب کا انحصار ہے، دورانِ خواندگی میں اگر کوئی طالب علم کسی لفظ کا غلط تلفظ کرتا ہے۔ تو گویا وہ صرف میں ناقص ہے۔ اور اگر حروف آخرہ الفاظ کی حرکت غلط پڑھتا ہے، تو نحو سے بے بہرہ ہے اور فہم مطلب سے قاصر۔ لہٰذا محض "پڑھائی" سے طالب علم کے صرف و نحو کی استعداد کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

امتحانی سوالات کے کل ۵۰ نمبر مقرر ہیں، ۴۰ سے کم نمبر پانے والے طلبہ ناکام متصور ہوتے ہیں، اگرچہ یہ بات ہمارے نقطۂ نظر سے مضحکہ خیز اور عجیب ہے کہ بعض طلبا کو امتحان میں ۵۱ یا ۵۲ بلکہ ۵۵ نمبر تک دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان مزید چند نمبروں کو غیر معمولی استعداد کا ایک بہت بڑا امتیازی نشان تصور کیا جاتا ہے اور یہ امتیاز سیکڑوں طلباء میں سے شاید ہی کسی کے حصہ میں آتا ہے،

طالب علم کے لئے صرف مسائل کا حفظ و استحضار چنداں ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ امتحان کی کامیابی کے لئے دینی فراست کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر طالب علم کو قرآن و حدیث کے صحیح اور مستند معانی پر عبور ہے اور مختلف احادیث کے اصول تطبیق یا نصِ قرآن سے احادیث کے

ِ مطابق اور معانی کی درست تاویل اور فقہا کے اصول استخراج مسائل سے واقف ہے یہی
کے دینی تبحر اور مطلوبہ استعداد کی مہارت کا قطعی ثبوت ہے اور اس کے بعد ہی وہ ایک
ستند عالم دین یا صاحب افتا تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ ایسے فارغ التحصیل طلبا کو ایک سند
لقہ ادارہ کی جانب سے دی جاتی ہے، یہ سند بھی ہماری یونیورسٹیوں کی سندات سے مختلف ہوتی
لیکن مستند کی قابلیت کا نہایت دیانتدارانہ اعتراف ہوتا ہے، ان سندات میں ان تمام کتب درسیہ
نام درج ہوتے ہیں جن کے نصاب درس کو پورا کیا جا چکا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس پر ان اساتذہ
دستخط بھی ثبت ہوتے ہیں جن کے حلقۂ درس میں شمولیت کی گئی ہے

ہر چند کہ ہمارے مفکرین اور ماہرین علم التعلیم کے نقطۂ نظر سے مدارس دینیہ کا متذکرہ صدر
ی ڈھانچا بالکل ناقص ہے، لیکن اس کے پیش نظر افادی نتائج سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اور
انہ بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ نظام تعلیم سے ہم جس قدر غیر مطمئن ہیں اسی قدر مدارس
یہ کے منتسبین اپنے نظام اور اس کے نتائج سے مطمئن ہیں اور ایسا ہونا عجیب نہیں، کیوں کہ
ل تعلیم کا مجرد انہماک ہی مقصودِ تعلیم ہو وہاں ناکامی۔ خامی۔ یا بے اطمینانی کا تصور ہی باقی
ہیں رہتا۔

ظاہر ہے کہ رائج الوقت عوامی تعلیم کا موجودہ نظام اس اصول کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے
ن اس کا سبب صرف تعلیمی مقاصد کا باہمی اختلاف ہے۔

دینی مدارس کی تعلیم کی غرض وغائت یقیناً وہ نہیں ہے جو سرکاری مدارس کے تعلیم کی ہے اگرچہ
ش فہم حلقوں میں یہی کہا اور بتایا جاتا ہے کہ موجودہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایک اچھا شہری
یا جا سکے لیکن اچھا شہری کون ہے؟ یہ امر خود محل نظر ہے۔

یہ اصطلاح درحقیقت برطانوی استعمار کے عزائم مشومہ پر ایک پردہ ڈالنے کے لئے گھڑی
ا تھی جس کے اصلی معنوں پر غور کئے بغیر محکمہ تعلیم کے سنجیدہ طبع افراد نے اس لفظ کو مستحسن معنوں میں
تعمال کرنا شروع کر دیا۔

بدقسمتی عہدِ استعمار میں ہمارے مدارس و جوامع کا نصاب و نظامِ تعلیم جس اسلوب پر ترتیب کیا گیا تھا اس کا مقصد ایک فرانسیسی مبصر کی ضخیم کتاب تمدنِ ہند میں انگریزی اربابِ حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے "بابو فراہم کرنا" بتایا ہے۔ مصنف نے اس مقصد کا بیان ایک سنجیدہ طنز کے لہجے میں کیا ہے اور ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی کہ اگر اہلِ ہند کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اُن کے ملک پر غیر ملکیوں کی حکومت قابلِ شرم بات ہے تو خواہ یہ احساس کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو بالآخر موجودہ نظام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دے گا۔

یہ احساس پیشگوئی کے نصف صدی بعد ہوا اور غیر ملکی اقتدار بھی ہمیشہ کے لئے برصغیر ہند و پاکستان سے رخصت ہو گیا لیکن ہمارے تعلیمی نصاب و نظام کا وہی اسلوب ہنوز کارفرما ہے۔ اور ہمارے مکاتب و جوامع بدستور "بابو" بنانے میں معروف ہیں اس لفظ کے معنے خود صاحب "تمدنِ ہند" نے سرکاری ملازم بتایا ہے۔

اب موجودہ عوامی مدارس کی تعلیم کے اصل مقصد پر خواہ کتنا ہی پردہ ڈالا جائے حقیقت بجز "سرکاری ملازمت" کے اور کچھ نہیں ہے۔

مقصد کا یہ تسفّل ہمارے عوامی تعلیمی اداروں کے ہر شعبہ میں اثر انداز ہے، چونکہ ہر درجہ تعلیم کے پیشِ نظر ملازمت ہے اور ملازمت کسی سند کے بغیر نہیں ملتی۔ اس لئے معلّم اور متعلّم کی تمام کوششیں حصولِ سند کے لئے وقف ہوتی ہیں، چناں چہ کامیابی امتحان کے لئے استاد اور شاگرد دونوں قیاسی اور حقیقی ذرائع کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر ظنی اور ہنگامی وسائل ڈھونڈتے رہتے ہیں، کتبِ درسیہ کے خلاصے۔ پرچوں کے حل۔ متوقع سوالات کا استحضار یہ ساری تدبیریں صرف اس لئے ہوتی ہیں۔ کہ متعینہ نصاب کی صحیح معنوں میں تکمیل نہیں ہوتی اور نہ اس کی ضرورت کبھی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے قابل ترین اساتذہ سمجھے جاتے ہیں جو سقفِ مدرسہ کے نیچے بیٹھ کر طلبہ کو سمجھائیں کہ ان سوالات کو حل کر لو اور کامیاب ہو جاؤ گے، اور پھر اگر خوش قسمتی سے محض وہی متوقع سوالات امتحان میں آجائیں تو ان اساتذہ کا سرِ افتخار کوہِ ہمالیہ تک بلند ہو جاتا ہے اور فخریہ یہ کہتے ہیں کہ دیکھے ہم نے

جو کچھ بتایا تھا من وعن وہی امتحان میں آیا، انہیں اس طرح فخر کرتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا
کہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے جرائم کا اعتراف کر رہے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ مکمل نصاب کو پس پشت
ڈال کر اور صرف چند مسائل پر اکتفا کر کے انھوں نے اپنے شاگردوں کی تکمیلی صلاحیت کا کس طرح
خون کیا ہے۔ اساتذہ کا یہ طریقہ دیکھ کر شاگرد بھی علم و یقین کی روشن شاہ راہوں کو چھوڑ کر ظن و تخمین
...... دھندلی گذرگاہوں سے منزل مقصود پر پہنچنے کی کوشش میں سرگرم نظر آتے ہیں
اور اس کو اپنی اصطلاح میں امتحان کی تیاری سے تعبیر کرتے ہیں، یہ طلبا ممتحنین کے نفسیاتی انداز نظر
سے لے کر پرچہ سوالات کے نمبروں تک میں اپنی کامیابی کا راز تلاش کرتے ہیں، اور اس جستجو کے
مکروہ ترین مجسمے امتحان کے بعد ممتحنوں کی قیام گاہ کے گرد چکر لگاتے بھی نظر آتے ہیں۔

آپ یقین مانیئے ان حالات کے بالکل برعکس مدارس دینیہ کی فضا اس قسم کے غیر صحت مند
اور متعفن عناصر سے قطعاً پاک ہے۔

ان مدارس کا کوئی متعلم خود امتحان کے لیے تیار نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کا نصاب درس
مکمل نہ ہو، یہاں تک کہ احیاناً اگر امتحان کا زمانہ قریب آجائے اور اس کا نصاب مکمل نہ ہوا ہو تو
امتحان کے بعد بھی اس کی تکمیل واجب تصور کرتا ہے، اور اکثر صورتوں میں صرف تکمیل نصاب
کو امتحان کی کامیابی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مدارس دینیہ کے امتحانات کی تیاری میں نہ ظن و تخمین
کو دخل ہے اور نہ سعی و تدبیر کی گنجائش۔ کیوں کہ اس کا مقصد صرف تکمیل درس ہے، مقاصد
بعد التکمیل کی تعیین اس کے دائرۂ شعور کے غیر ضروری عناصر میں سے ہے۔

کیا ان حالات کی تفصیل میں ہمارے سرکاری تعلیمی اداروں کے لئے کوئی عبرت و سبق کا
پہلو ہے؟ اس سوال کا جواب ایک دوسری صحبت کا محتاج ہے۔

ایمیل
یا
روسو کی تعلیم

ترجمہ مرزا رزقی

مسلسل ۲۱

آپ دریافت فرمائیں گے کہ کیا یہ قصہ میں اس خوشی کا اندازہ بیان کرنے کے لئے پیش کر رہا ہوں جو اسی قسم کے کھیلوں میں حاصل ہوتی ہے، نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسی بات کا ثبوت ہے کہ اندھیرے سے ڈرنے والے کو اطمینان دلانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ برابر کے کمرے میں سے اس کو دوسروں کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز آتی رہے، اس کی بجائے کہ آپ بچے کے ساتھ خود اندھیرے میں تنہا جا کر کھیلیں میں یہ مشورہ دوں گا کہ آپ بہت سے خوش مزاج بچوں کو جمع کریں اور جب تک آپ کو قبل از قبل یہ یقین کامل نہ ہو جائے کہ بچہ بہت زیادہ نہ ڈر جائے گا آپ اندھیرے میں ایک کو بھی تنہا بھیجنے کی ہمت نہ فرمائیں۔

اس بات کا خیال کرتے ہوئے کہ بچوں کو منظم کرنا کس قدر معمولی سی بات ہے، میں ان کھیلوں سے زیادہ پُر لطف اور نفع بخش تصوّر اور کسی چیز کا نہیں کر سکتا، میں ایک کمرے میں کرسیوں میزوں آرام کرسیوں اور پردوں کی ایک بھول بھلیاں بنا دوں گا اور اس میں آٹھ دس خالی بکس دکھلا دوں گا اور ایک خاص بکس میں مٹھائی بھر دوں گا اور جہاں وہ بکس مل سکے گا وہاں کا ایک مختصر اور واضح نقشہ بھی بناؤں گا اور پھر ایسی ہدایتیں دوں گا، جو ایسے لوگوں کے لئے وہ مقام معلوم کرنے میں کافی امداد و تسکین کا باعث ہوں جو بچوں کی

ملہ توجہ یا غور کرنے کی مشق دینے کے لئے ان سے آپ صرف ان اشیاء کا ذکر کریں جو صریحاً ان کے حقیقی فائدہ کی ہوں تاکہ وہ ان کو بخوبی سمجھنے لگیں اور سب سے اہم یہ معاملہ ہے کہ آپ اختصار سے کام لیں۔ ایک لفظ بھی ضرورت سے زائد زبان سے نہ نکالیں، لیکن آپ کی گفتگو تو کبھی مبہم ہونی چاہیے اور نہ اس کا مطلب کبھی مشتبہ ہونا چاہیئے۔

بہت زیادہ بُردبار اور توجہ کرنے والے ہیں۔ پھر میں ان ننھے ننھے مقابلہ کرنے والوں کے ناموں پر قرعہ ڈالوں گا اور پہلے ایک کو تلاش کے لئے بھیجوں گا پھر دوسرے کو حتی کہ مطلوبہ بکس مل جائے گا۔ ان کی مہارت کے لحاظ سے میں اس کارروائی کی دشواری میں روز بروز اضافہ بھی کرتا رہوں گا۔

ہر کلینر کے مانند بکس اٹھائے ہوئے ہم سے ایک کم سن بچے کی فاتحانہ واپسی کا تصوّر فرمائیے یہ بکس میز پر رکھا جاتا ہے اور بڑے تزک و احتشام سے اس کو کھولا جاتا ہے۔ اب جو اس کی توقع کے خلاف مٹھائی کے بدلے اس میں سے کائی یا روئی کے گالے پر عمدگی سے چپٹا ہوا ایک کھنورا۔ ایک گھونگا کوٹلے کا ایک ٹکڑا بلوط کے چند پھل۔ ایک شلغم یا اسی قسم کی اور چیزیں نکلتی ہیں تو ایک زندہ دل جماعت کی ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں تو اب تک مجھے تصوّر ہی تصوّر میں لطف اندوز کر رہی ہیں۔ دوسری مرتبہ تازہ سفیدی کئے ہوئے کمرے کی ایک دیوار پر ایک کھلونا اور چھوٹی سی چیز لٹکا دی جاتی ہے اور بچوں کو دیوار چھوئے بغیر اس کو اتار کر لانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ پس جب کوئی بچہ اس چیز کو وہاں سے حاصل کر کے واپس ہوتا ہے اور اگر اس نے اس شرط کی پابندی کا خیال نہ کیا ہو تو ٹوپی۔ جوتے کی نوک۔ کوٹ کا دامن یا اس کی آستین پر ایک سفید چھوٹا سا نشان اس کی عدم مہارت کی چغلی کھا دیتا ہے۔

ان کھیلوں کی روح ظاہر کر دینے کے لئے میرے خیال میں بہت کافی بلکہ اس سے بھی زائد ہے۔ اس پر بھی اگر آپ مجھ سے ہر بات کی تفصیل کے خواہش مند ہوں تو آپ میری اس کتاب کو پڑھئے ہی نہیں۔

اس طرز پر تعلیم پائے ہوئے بچے کو دوسروں پر کس قدر سبقت حاصل ہو گی، اس کے پاؤں اندھیرے میں بآسانی چلنے اور اس کے ہاتھ آہستہ سے چھونے کے عادی ہوں گے تو وہ دونوں گھرے سے گھرے اندھیرے میں بھی اس کی رہنمائی کر سکیں گے۔ شام کے وقت بچپن کے کھیلوں میں محو رہنے کی وجہ سے اس کا دھیان بمشکل ہی خوف و خطر کی جانب مبذول ہو سکے گا۔ اگر وہ ہنسی سننے کا تصوّر باندھے گا تو وہ ہنسی کسی جانے پہچانے دوست کی ہو گی مجنون ارواح کی نہیں ہو گی۔ اگر اس کے خیال میں لوگوں کے کسی مجمع کا تصور پیدا ہو گا تو وہ مجمع جادوگرنیوں یا چھلاوں پریوں کی عید کا نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کے اتالیق کے کمرے کی کسی تقریب کا ہو گا، یہ رنگ رلیاں صرف رات ہی میں یاد آتی ہیں، پس ان سے وہ کبھی خوف نہ کھائے گا۔

بلکہ بجائے خوف کے فرحت حاصل کرے گا۔ وہ فوج کے ساتھ یا بنا فوج کے ہر وقت کام کے لیے تیار رہے گا۔ وہ سال (SOUL) کے کیمپ میں داخل ہو کر اپنا راستہ خود معلوم کرے گا اور بلا آہٹ کے شاہی ڈھیرے تک پہونچ جائے گا۔ اور پوشیدہ پوشیدہ ہی واپس آجائے گا۔ اگر ریسیس (RHESUS) کے گھوڑے سرقہ کرانے ہیں تو آپ اس کی مہارت پر اعتماد کر سکتے ہیں کسی دوسری طرز پر تعلیم پائے ہوئے لوگوں میں مشکل ہی سے کوئی یولیس (ULYSSES) بن سکے گا۔

میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بچوں کے دلوں سے اندھیرے کا خوف دور کرنے کے لئے انہیں مختلف طریقوں سے ڈراتے اور خوفزدہ کرتے ہیں، یہ طریقہ غیر مدبرانہ اور نہایت ہی خراب ہے، کیوں کہ اس کے اثرات خلاف توقع ہوتے ہیں جس سے بچے اور بھی زیادہ ڈرپوک اور بزدل بن جاتے ہیں۔ کسی وقتی خطرے سے جس کی اہمیت اور نوعیت سے ہم ناآشنا ہوں اور اچانک حادثات کے خوف سے جن کا ہم کو اکثر تجربہ ہو چکا ہو۔ نہ عقل بچا سکتی ہے، نہ عادت۔ تو آپ اس کا کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ آپ اپنے شاگرد کو ان حادثات سے محفوظ کر سکیں گے، میں تو سب سے بہتر یہی بات خیال کرتا ہوں کہ بچوں کو قبل از قبل ہی ان سے واقف اور آشنا کرا دیا جائے، میں ایمیل سے تو یہ کہہ دوں گا "دیکھو یہ معاملہ حفاظت خود اختیاری کا ہے، اور کیوں کہ حملہ آور تم کو یہ اطلاع نہیں دیتا ہے کہ وہ تم کو نقصان پہونچانا چاہتا ہے یا محض خوفزدہ ہی کرنا چاہتا ہے۔ اور تم چوں کہ اس کے بس میں ہوتے ہو اس لئے بھاگ کر بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ لہٰذا آدمی ہو یا جانور جو کچھ بھی اندھیرے میں تم پر حملہ آور ہو اس کا بہادری کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کرو، اس کو پکڑ کر اپنی پوری قوت سے کچل ڈالو۔ اگر وہ کشمکش کرے تو پوری طرح مارنے میں ہرگز کمی نہ کرو اور اس کا جو جی چاہے کہے یا کرے تم جب تک یہ نہ جان جاؤ کہ وہ کون اور کیا ہے اس کو ہرگز مت چھوڑو، اس حرکت سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن ایسے سلوک سے عملی مذاق کرنے والا پھر کبھی ایسے مذاق کی جراءت نہ کر سکے گا۔

لامسہ حواس خمسہ میں سے قوت لامسہ گو تقریباً ہر وقت استعمال میں رہتی ہے، لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں دیگر حواسوں کی نسبت اس حواس کی قوت تمیز ناقص اور زیادہ کچی

ہوتی ہے کیوں کہ اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے کام لینا بھی ضروری ہوتا ہے، یہ آنکھیں ایک چیز کو پہلے ہی دیکھ لیتی ہیں، اور ہاتھ سے چھونے کے قبل ہی دماغ اس کے متعلق ہمیشہ فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس لمس کے ذریعہ محض محدود ہونے کی وجہ سے موثق ترین تمیز ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کی وسعت صرف ہاتھوں کی دسترس کے اندر ہونے کی وجہ سے یہ ہمارے دیگر حواسوں کے عاجلانہ فیصلوں کی تصحیح کر دیتا ہے جو ایسے امور کے متعلق ہوتے ہیں جن کو ہم بمشکل ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اور جو کچھ علم ہم لمس کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں وہ کاملاً حاصل کر لیتے ہیں۔ علاوہ بریں لمس پٹھوں کی قوت کو ہمارے بہادرانہ اعمال سے بھی متحد کر دیتی ہے، ہم بیک وقت لمس کے ذریعے حرارت جسامت اور شکل کے تصورات کا موازنہ کر کے اسے کثافت کے تصورات سے متحد کر دیتے ہیں۔ پس لمس ہی وہ حس ہے جو ہمارے جسم پر غیر اجسام کے تاثرات کو بہترین طریق پر ظاہر کر دیتی ہے۔ اور حفاظت خود اختیاری کا مطلوبہ علم ہمیں بالراست بخشتی ہے۔ سدھی سدھائی قوت لامسہ چوں کہ نظر کا بھی کام انجام دیتی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ سننے کا بھی کام .... نہ دے، اس لئے کہ آواز دار اجسام (گھنٹہ وغیرہ) کی آوازوں والی رَو (تھرتھراہٹ) لمس کے ذریعہ محسوس کی جا سکتی ہے (CELLO) باجے پر ایک شخص بلا دیکھے یا سنے ہاتھ رکھ کر محض لکڑی کی تھرتھراہٹ کے ذریعہ معلوم کر سکتا ہے کہ آواز باریک ہے یا موٹی اور یہ کہ وہ آواز پلیندے سے نکل رہی ہے یا ستارے سے۔ پس اگر ہماری قوت لامسہ ان اختلافات میں تیز کرنی سیکھ جائے تو بلاشبہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ اس قدر ذکی الحس ہو جائے گی کہ ہم سارے سروں کو انگلی کے پوروں کے ذریعے سننے لگیں گے، لیکن اس بات کو اگر ہم تسلیم کر لیں تو اس سے یہ امر صریحاً واضح ہو جاتا ہے کہ موسیقی کے ذریعہ ہم بہروں سے بآسانی بات کر سکتے ہیں، کیوں کہ الفاظ اور تلفظ کے مقابلہ میں باقاعدہ میل اور یگانگت کے لئے سُر اور تال بھی کچھ کم اہل نہیں ہوتے ہیں، اس لئے وہ بھی بطور عناصر گویائی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

بعض ایسے افعال ہیں جن سے قوت لامسہ بالکل ماند پڑ کر مردہ ہو جاتی ہے اور بعض ایسے ہیں جن سے وہ تیز ہو کر نہایت لطیف اور ذکی بن جاتی ہے۔ اول الذکر وہ ہیں جن میں ٹھوس اجسام کو ہر وقت مس کرتے رہنے کی وجہ سے جسم کو بھی زیادہ حرکت دینی پڑتی ہے۔ اور قوت بھی زیادہ صرف ہوتی ہے

اس لئے کھال سخت اور موٹی پڑ جاتی ہے اور خرامی احساس سے محروم ہو جاتی ہے۔ آخر الذکر وہ ہیں
جو ہلکے اور متواتر اتصال کے باعث اس احساس میں تغیر و تبدل پیدا کرتے رہتے ہیں، اس لئے دماغ
بار بار ہونے والے نقوش کی طرف متوجہ رہتا ہے، اور ان کے تغیرات کو جلد ہی تمیز کر لینا سیکھ جاتا ہے
یہ امتیاز آلات موسیقی کے استعمال میں بین طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ بڑی سارنگی (CELLO) رباب سارنگی
(BASSVIAL) اور خود سارنگی (VIOLIN) اور اس کے گز کا پر مشقت اور سخت استعمال گو انگلیوں
میں تو وچ پیدا کر دیتا ہے لیکن ان کے سروں یا نوکوں کو بالکل سخت اور سُن کر دیتا ہے۔ چنگ یا ستار
(HARAI CHARD) پر انگلیوں کا لطیف اور صاف ستھرا استعمال ان کو لچکدار اور ذکی الحس
دونوں ہی بنا دیتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے چنگ یا ستار ہی کو ترجیح دینی چاہیئے۔

کھال سارے جسم کی حفاظت کرتی ہے، اس لئے یہ بہت ضروری امر ہے کہ ہوا کے اثرات کے
خلاف اس کو سخت بنا دیا جائے تاکہ اس کے تغیرات کو وہ برداشت کر سکے، اس کے متعلق میں یہ کہہ سکتا
ہوں کہ میں ایک ہی کام کی غلامانہ انجام دہی کے ذریعہ ہاتھوں کو سخت اور کھردا نہیں بنانا چاہتا اور
نہ ہاتھوں کی کھال کو ہی اس قدر سخت ہونا چاہیئے کہ وہ اس لطیف قوت لامسہ ہی سے محروم ہو جائے
جو جسم کو ہر واقعہ سے باخبر اور اندھیرے میں لمس یا اتصال کے باعث بعض اوقات ہم کو مختلف طریقوں کے
لرزہ بر اندام کر دیتی ہے۔

میرے شاگرد کو ہمیشہ جوتے پہنے رہنے پر بھلا کیوں مجبور کیا جائے۔ اگر بوقت ضرورت پاؤں کے
تلوے ہی جوتے کا کام دے دیں تو اس میں کیا ہرج ہے! یہ تو مسلمہ ہے کہ نازک کھال کسی حال میں
بھی کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی ہے، اور یہ کہ بسا اوقات اس سے نقصان بھی پہونچ جاتا ہے آدھی
رات کے وقت گڑگڑاتے جاڑوں میں جب جنیوا والے دشمن کی آہٹ پاکر بیدار ہوئے تو جوتے کی
بجائے انہوں نے فوراً ہی اپنے ہتھیار سنبھال لئے، بھلا یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر وہ ننگے پاؤں چلنے پھرنے
کے قابل نہ ہوتے تو ان کا شہر جنیوا فتح ہونے سے بچ جاتا؟

آدمی کو پہلے غیر متوقع اور اتفاقی حادثات جھیلنے کے لئے تیار کر دینا چاہیئے، برس کے بارہ مہینے

اسمٰعیل کو ٹھے پر۔ نیچے۔ مکان کے اندر۔ باہر یا باغ میں غرض کہ ہر جگہ ننگے پاؤں پھرے گا تو میں ڈانٹوں ڈپٹوں گا نہیں۔ بلکہ خود بھی اس کی اقتدا کروں گا۔ بس فقط اتنا ہی بندوبست رکھوں گا کہ کانچ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اس کے راستے سے علیحدہ کر دوں۔ میں ابھی ابھی محنت یا نوراور دست کاری کے پیشوں کا ذکر کروں گا۔ فی الحال اسمٰعیل کو ہر ایسی مشق کرنے دیجئے جو اس کی جسمانی پھرتی کو ابھارے اس کو ہر پہلو پر بآسانی اور مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا سیکھنے دیجئے۔ کودنے اچھلنے، درختوں اور دیواروں پر چڑھنے کی مشق کرنے دیجئے۔ اپنا توازن ہمیشہ اس کو خود قائم کرنے دیجئے، اور قبل اس کے کہ وہ علم معدن اشیاء کے فعلیات کی تشریح کرنا سیکھے، اس کی جملہ حرکات و سکنات کو قوانین اوزان کا پابند کر دیجئے اپنا قدم زمین پر جمانے اور جسم کو پاؤں پر سہارنے کے ذریعے اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ٹھیک طور پر کھڑا ہے یا غلط، آسان اور ہلکی چال ہمیشہ شاندار اور پرشوکت ہوتی ہے، پائدار ترین وضع ہی ہمیشہ بعید نفیس اور دل پسند ہوتی ہے۔ اگر میں ناچ کا استاد ہوتا تو مارسل (MORCELS) کی ان بندر نما عیاروں کے استعمال سے بالکل ہی انکار کر دیتا جو محض ناٹکوں کے اسٹیج پر جہاں کہ وہ ادا کی جاتی ہیں دکھائی جانے کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ میں تو اپنے شاگرد کو مٹکنا چٹکنا سکھانے کی بجائے کسی پہاڑ کی چٹان کے دامن میں لے جا کر یہ سکھاؤں گا کہ کسی ناہموار دشوار اور سیدھی ڈھلان کے راستے پر چلنے اور نیچے سے اوپر کسی ایک مقام سے دوسرے مقام پر چھلانگ مار کر پہنچنے کے لئے اپنا توازن کس طرح قائم رکھنا چاہیئے اور سر اور دھڑ کو کیوں کر سنبھالنا چاہیئے۔ اور یہ کہ اس غرض کے لئے پہلے پاؤں اور پھر ہاتھ کس طرح رکھنا چاہیئے۔ اسمٰعیل کو جنگلی بکری کی نقل کرنی چاہیئے۔ ڈوم ڈھاڑی کی نہیں۔

باصرہ

قوت لامسہ کا عملی دخل آدمی کے محض ماحول متصلہ ہی تک محدود رہتا ہے، اسی طرح نظر کی وسعت ان حدود سے تجاوز کئے ہوئے ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظر کو مغالطہ میں ڈالتی اور بھٹکا دیتی ہے، ایک نظر میں آدمی نصف افق تک دیکھ لیتا ہے، ان ایکا ایکی نقوش یا عکسوں یا ان کے بھڑکائے ہوئے تخیلات کے ہجوم میں گھر کر وہ قوت بے وقت کی غلطیوں سے کیوں کر محفوظ رہ سکتی ہے؟ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ حواس میں قوت بصری ہی ہماری سب سے زیادہ غیر معتبر حس ہوتی ہے اور یہ محض اس لئے

کہ اس کے حدود وسیع ترین واقع ہوئے ہیں۔ دیگر حواسوں کی نسبت یہ جس اپنا کام کہیں پہلے انجام دینا شروع کر دیتی ہے، اور اس کا کام اس قدر شاداب اور بڑے پیمانہ کا ہوتا ہے کہ جملہ دیگر حواس بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر ہم فاصلہ معلوم کر کے ایک قلعہ کا دوسرے قلعہ سے مقابلہ کرنا چاہیں تو یہی فریب نظریاں ہمارے لیے لازم و ملزوم ہو جاتی ہیں۔ دور فاصلہ پر تشبیہات کے علاوہ ہم کو اور کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی ہے اور جسامت اور بعدوں کے مدارج قائم کئے بغیر ہم فاصلہ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ورنہ ہمارے لئے فاصلہ کا کوئی وجود یا حقیقت ہی نہ ہو گی، اگر دو درخت ایک ایک سو گز کے فاصلہ پر اور دوسرا دس گز کے فاصلہ پر ایک ہی قد و قامت کے نمایاں نظر آئیں تو ہم یہی خیال کریں گے کہ وہ پہلو بہ پہلو آ گئے ہیں۔ اگر چیزوں کی صحیح لمبان اور چوڑان ہمیں ایک ہی مقام سے دکھائی دینے لگے تو ہم کو فاصلہ کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو سکے گا کیوں کہ پھر ہر شے ہم کو ہماری آنکھوں کے قریب ہی دکھائی دینے لگے گی۔

ہماری نگاہ اور شئے مقصودہ کے مابین جو زاویہ قائم ہوتا ہے صرف اسی کے ذریعہ ہماری نظر شئے مقصودہ کی جسامت اور فاصلے کا اندازہ لگاتی ہے۔ اور کیوں کہ یہ زاویہ مشترک اسباب کا مسبب ہوتا ہے۔ اور ہم جس فاصلہ پر پہونچتے ہیں وہ ان مرکب اسباب کو متمائز نہیں کرتا ہے، اس لئے ہم غلطی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیوں کہ محض دیکھ کر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ جس زاویہ سے مجھے ایک شئے دوسری شئے کی نسبت چھوٹی نظر آتی ہے وہ زاویہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ شئے فی الواقعی چھوٹی ہی ہے یا زیادہ فاصلہ پر ہے۔

اس جگہ ہم کو اپنی سابقہ کارروائی بالکل الٹ دینی ضروری ہے، اس احساس کو سہل بنانے کی بجائے ہمیشہ اس کو تقویت پہنچانی چاہیئے، اور دوسرے حواس کے ذریعہ اس کی توثیق کرا لینی چاہیئے۔ آنکھوں کو ہاتھوں کا مطیع بنائیے، یا بالفاظ دیگر اول الذکر کی سرعت پر آخر الذکر کی ہلکی اور زیادہ معقول رفتار کا لنگر ڈالئے کیوں کہ اس کی عدم مہارت کے باعث ہمارا نظری اندازہ اور پیمائش بالکل غیر مکمل ہی رہتا ہے، بیک نظر ہم کسی شئے کی لمبائی چوڑائی اونچائی اور اس کے فاصلہ کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ اور یہ واقعہ کہ انجنیر سرویئر۔ اور کیٹیکٹ معمار اور مصور جو ایک ہی نظر دیکھ کر فاصلہ کا صحیح اندازہ لگانے کے قابل ہو جاتے ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ قصور ہماری آنکھوں کا نہیں بلکہ ان کو استعمال کرنے کا ہوتا ہے، ان لوگوں کو ان کا

تربیت و مہارت بخشتا ہے جس کی مہم میں تمام رہتی ہے اور وہ نادیہ نگاہ کے مشکوک نتائج کی پڑتال کے متعلق اُن تجربات کے ذریعہ کر لیتے ہیں جو نادیہ متعلقہ کے ہر دما بیاب کی وجوہ کو ان کی نظر میں لیتے ہیں، ان امور کی انجام دہی کے لئے بچہ ہر وقت کمربستہ رہتا ہے، اس کو آزادی کے ساتھ میں رکھیے۔ فاصلہ ناپنے اور اس کو محسوس کر کے اندازہ لگانے کے لئے اس کی دلچسپی میں اضافہ کے بے شمار طریقے ہیں، مثلاً ایک بڑا اونچا بیری کا درخت لیجیے، اس کے بیر کس طرح توڑ کر اکٹھے کئے جائیں؟ کیا کھلیان میں رکھی ہوئی سیڑھی سے یہ مقصد پورا ہو سکے گا؟ یا ایک عریض اور چھوٹا نالا ہے اس کے پرلے کنارے پر کیوں کر پہونچیں؟ صحن میں جو تختہ رکھا ہے کیا وہ نالے کے اس کنارے سے کنارے تک پہو پہنچنے کے لئے کافی ہو جائے گا؟ اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہم ملحقہ کھائی میں سے پانی کھینچنا چاہتے ہیں اہم کو کس قدر لمبی ڈوری کی ضرورت ہوگی، میں دو درختوں کے پاس جھولا ڈالنا چاہتا کیا اس کے لئے بارہ فٹ لمبی رسی کافی ہو جائے گی، ایک شخص کہتا ہے کہ اس کا نئے مکان کے کمرہ کا ۲۵ مربع فٹ ہے، کیا آپ کے خیال میں ہماری رہائش کے لئے وہ کمرہ کافی ہو سکے گا؟ اور کیا وہ ہمارے موجودہ کمرے کی نسبت زیادہ وسیع ہوگا؟ ہم کو بہت بھوک لگ رہی ہے، سامنے دو قصبے دکھائی دے رہے ہیں، کھانا کھانے کے لئے قریب تر ان میں کون سا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ

سستی کا ایک سبق ایک کاہل الوجود اور سست بچے کو دوڑنا سکھانے کی ضرورت تھی۔ گو اس کو فوج کے لئے تیار کیا جا رہا تھا لیکن فوج کے کام یا کسی اور ورزش اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ معلوم کس طرح اس کے دل میں یہ خیال بس گیا تھا کہ اس کے مرتبے کے شخص کے لئے نہ کچھ جاننے کی ضرورت ہے اور نہ ....کوئی کام کرنے کی یعنی اس کی نجات ہی کے ہاتھ پاؤں اور رہر بھلائی کے لئے کافی تھے۔ چیران (CHIRAN) کی فنی مہارت بھی نوجوان کو سباک یا ایچیلیز (ACHILLES) نہیں بنا سکتی تھی، کسی قسم کا حکم نہ دینے کے ارادے نے اور بھی دشواری میں پھنسا دیا تھا، وعظ و نصیحت۔ تخویف۔ ترغیب تحریص یا کسی اور قسم کی ہدایت دینے کے تمام حقوق سے میں دست کش ہو چکا تھا۔ اب فرمائیے کہ بغیر کہے اس میں دوڑنے کا

شوق میں کیوں کر پیدا کرتا؟ اگر میں خود دوڑنا شروع کروں تو ممکن ہے کہ وہ میری اقتدا نہ کرتا علاوہ ازیں اس میں اور خرابیاں بھی موجود تھیں، اور مجھے ایسے ذرائع معلوم کرنے ضروری تھے کہ جن کی مشق کرانے سے میں اس کے ذہن اور جسم دونوں سے اکٹھا کام لینا سکھا سکتا، پس میں نے یا اس استاد نے جس نے یہ نظیر میرے سامنے پیش کی حسب ذیل طریقہ عمل اختیار کیا۔

سہ پہر میں جب میں تفریح کے لئے اس کو باہر لے جایا کرتا تھا تو اکثر جیب میں اس کے چند مرغوب ترین کیک رکھ لیا کرتا تھا، اور جب ہم باہر ہوتے تھے تو ہم میں سے ہر ایک، ایک ایک کھایا کرتا تھا۔ اور تفریح کے بعد ہم ہنسی خوشی واپس آجایا کرتے تھے، ایک دن اس نے دیکھا کہ میرے پاس تین کیک تھے، اس قسم کے وہ چھ کیک تک بآسانی کھالیا کرتا تھا، پس اس نے اپنے حصے کا کیک جلدی سے کھالیا اور مجھ سے دوسرا مانگنے لگا تو میں نے جواب دیا۔ نہیں میاں اس کو میں خود ہی کھا سکتا ہوں، یا خیر دونوں میں تقسیم بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن میرا ارادہ تو اس کیک کے لئے ان دونوں چھوٹے چھوٹے بچوں کی دوڑ کرانے کا ہے"۔ پس میں نے ان دونوں بچوں کو بلا لیا۔ اور کیک دکھا کر ان کو ترغیب دی کہ وہ دونوں اس کو حاصل کرنے کے لئے مسابقت کی دوڑ دوڑیں جو آگے نکلے وہ اس کو لے لے، وہ دونوں یہ تجویز سن کر بڑے خوش ہوئے، ایک بڑے پتھر کی حد مقرر کر کے اس پر کیک رکھ دیا۔ اور دوڑنے کا مقام مقرر کر کے ہم دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے، میرے اشارہ کرتے ہی وہ دونوں دوڑ پڑے، اور جیتنے والے نے تماشائیوں اور شکست خوردہ رقیب کے سامنے ہی کیک حاصل کر کے بلا تکلف کھا لیا۔

کھیل کیک سے زیادہ مزیدار تھا۔ لیکن اس کا فوری نہ کوئی اثر ہوا اور نہ کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوا۔ بہر حال میں بھی اس سے شکستہ دل نہ ہوا۔ اور نہ میں نے اس کے متعلق کسی جلدی سے کام لیا۔ تربیت دینا یا علم سکھانا ایک ایسا سودا ہے کہ آدمی کو اس میں اپنا وقت ضائع کر کے ہی لطف اندوز ہونے کے قابل ہو جانا چاہئے۔ ہماری سہ پہری چہل قدمی بلا وقفہ برابر جاری رہی، کبھی ہم تین کیک لے جاتے تھے کبھی چار اور مسابقت کرنے والوں کے لئے وقتاً فوقتاً کبھی ایک کیک بچتا تھا کبھی دو۔

دوڑنے والوں کے لئے انعام کوئی زیادہ ترغیب آمدہ نہ تھا لیکن جیتنے والے کا دل بہت بڑھایا جاتا تھا اور خوب شاباش دی جاتی تھی۔ الغرض ہر کام بڑے زور کی دواھتمام کے ساتھ انجام پاتا تھا۔ دوڑ میں دلچسپی پیدا کرنے اور فاصلہ میں وسعت دینے کے لئے میں نے ایک طویل محمد خان زد کر دیا تھا چند جلیبی فاتحین کو اور شامل کر لیا تھا۔ ابھی یہ بچے دوڑنے والوں کی فہرست میں شامل ہونے تھے کہ راستہ چلنے والے بھی تماشہ دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، اور تالیاں بجانے اور شور و غل مچا کر دل بڑھا نے سے ان کی مزید حوصلہ افزائی کی جانے لگی بعض اوقات جبکہ کوئی کسی سے آگے نکلنے والا ہوتا تو میں نہ شاگرد کو بھی جوش میں نعرے لگاتے ہوئے اچھلتا کودتا اور چلاتا ہوا دیکھتا تھا۔ اس کے لئے گویا اولمپک کی دوڑوں کا ایک نمونہ تھا۔

یہ مسابقت کرنے والے بہرحال ہمیشہ دیانت داری سے کام نہ لیتے تھے کبھی کوئی کسی کے آڑے آتا تھا کوئی کسی کو گرا دیتا تھا یا راستہ میں پتھر ڈال دیتا تھا، اس لئے مجھکو انہیں جدا جدا مقام سے دوڑانا پڑا، تاکہ مقررہ مقام کے لئے وہ مختلف مقامات سے مساوی فاصلہ دوڑ کر طے کر سکیں، اس رویے کا سبب آپ کو بہت جلد ابھی ظاہر ہو جائے گا، کیونکہ مجھے اس اہم معاملہ کی تفصیل بیان کرنی بہت ضروری ہے۔

محبوب کیکوں کو اس طرح آنکھوں کے سامنے روزانہ ہضم ہوتے ہوئے دیکھتے دیکھتے عاجز ہو کر کم سن صاحب زادے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تیز دوڑ میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہے، اور یہ دیکھ کر کہ خدا نے اس کو بھی دو ٹانگیں عطا فرمائی ہیں، اس نے چپکے چپکے دوڑنے کی مشق شروع کر دی، جان بوجھ کر میں اس سے انجان رہا لیکن یہ ضرور جان گیا کہ میری حکمت عملی اپنا کام کر رہی ہے پس جب اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ بھی دوڑنے کے قابل ہو گیا ہے اور میرا بھی یہی خیال ہو چکا تھا تو اس نے مجھ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی کہ دوسرا کیک میں اس کو دیدوں میں نے انکار کیا تو اس نے مزید اصرار کیا، اس پر بالآخر مجھ پر کہنے لگا۔ بہت اچھا آپ اس کو پتھر پر رکھ دیجئے اور دوڑنے کا فاصلہ مقرر کر دیجئے۔ پھر دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے بھی ہنس کر جواب دیا "اچھا تم

دوڑ ش سے تم کو بھوک تو خوب لگ آئے گی لیکن تم کیک نہ جیت سکو گے۔ میرا یہ فقرہ اسے کچھ چبھ سا گیا۔ اس نے دل کڑا کیا اور بآسانی انعام جیت لیا، اس لئے کہ میں نے اس کے لئے فاصلہ بہت کم رکھا تھا اور یہ بھی خیال رکھا تھا کہ دوسرا تیز سے تیز دوڑنے والا بھی اس تک پہلے نہ پہونچ سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ابتدا کے بعد اس کو اس مشق میں مشغول رکھنا کوئی دشوار کام نہ تھا، جلد ہی وہ اس ورزش کا اس قدر دلدادہ ہو گیا کہ بلا رو رعایت بڑے سے بڑے فاصلے کی دوڑ میں بھی دیہاتی بچوں کو ہمیشہ ہرانے کا کامل یقین رکھنے لگا۔

اس خوبی کے حصول کے ساتھ ہی ساتھ ایک غیر متوقع دوسری خوبی کی بھی مزید رونمائی ہوگی جب تک وہ کبھی کبھار ہی انعام جیتا کرتا تھا اپنے دیگر ہم چشموں کی طرح اس کو بذات خود ہی کھا لیا کرتا تھا، لیکن جب وہ متواتر جیتنے کا عادی ہو گیا تو وہ بڑا سخی اور مخیر بن گیا۔ اور اکثر ہارے ہوئے سابقین کے ساتھ وہ انعامی کیک تقسیم کر کے کھانے لگا، اس چیز سے مجھے ایک اخلاقی سبق ہاتھ آ گیا اور سخاوت کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی۔

ومرلین ۔ اقدار ۔ اس کی

قسط نمبر ۲

تعلیمی خدمات

نصار مہدی

نشہ داراور بچہ

لندن کی ایک عدالت صرف نوخیز مجرموں کے مقدمات کا ہی فیصلہ کرتی ہے۔ آج عدالت میں بڑی چہل پہل ہے۔ ملزموں کے کٹہرے میں چودہ سالہ (TIM) کھڑا ہے، پیشانی پر بل۔ بھویں سکڑی ہوئیں۔ آنکھیں فرش کی طرف اور جسم اکڑا ہوا تھا۔ یہ ہے کہ رُوئیں رُوئیں سے نفرت ٹپک رہی ہے، سامنے ایک طرف پولیس افسر ایک ایک کے اس کے جرائم گنا رہے ہیں، فلاں دوکان سے مال چوری کیا۔ فلاں مکان میں گھس گیا۔ فلاں فلاں چیزیں برباد کیں اور آخر رات کو ایک تالا توڑتے ہوئے گرفتار ہوا۔ دوسری طرف ہاتھوں لٹے ہوئے دوکان دار فریاد کر رہے ہیں، ایک طرف ایک دُبلی پتلی کمزور سی عورت کھڑی ہے، چہرے پر مایوسی جسم میں کپکپی اور آنکھوں میں آنسو، یہ ٹم کی بدنصیب ماں ہے۔ رو رو کر بیٹے کی بے راہ روی کی تصدیق کر رہی ہے، اور آخر میں ٹم کو کسی اصلاحی ادارے میں بھیجنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے۔

بچوں کی نفسیات کا مطالعہ ہومرلین کا محبوب مشغلہ تھا، یہ شوق کبھی کبھی اسے بچوں کی عدالت میں کھینچ لایا کرتا تھا، آج بھی ہومرلین عدالت میں ٹم کا مقدمہ سن رہا تھا، لہذا مجسٹریٹ نے ٹم کو ہومرلین کے حوالے کر دیا۔ تاکہ بچوں کی دولت مشترکہ میں داخل کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔

اسی عدالت کے ملحق کمرہ میں ایک کرسی پر ہومرلین بیٹھا ہے، سامنے ٹم اسی شان بے نیازی کے ساتھ نفرت کے جذبات سے بھرا ہوا کھڑا ہے۔ ایک طرف بدنصیب ماں شدت غم سے گنگ

ٹکٹکی باندھے ہومرلین کو دیکھ رہی ہے۔ ہومرلین نے آٹھ کر ایک پونڈ کا سکہ لڑکے کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہا۔

"ادھر سنو! اس وقت اپنی ماں کو گھر لے جاؤ۔ کل اسکول چلے آنا۔ بس ایورشاٹ (EVERSHOT) کا نام یاد رکھنا۔ یہاں سے ایک گاڑی نو بجے جاتی ہے اور دوسری ایک بجے اگر ایک بجے کی گاڑی . . . . . سے آؤگے تو میں بھی تمہیں اسٹیشن پر مل جاؤں گا، اور ہم دونوں ایک ساتھ اسکول چلیں گے۔ اور اگر نو بجے کی گاڑی سے جانے کا اتفاق ہو تو اسکول کا راستہ دریافت کر لینا۔"

کیا خیال ہے آپ کا؟ یہ بظاہر عادی مجرم لڑکا پولیس اور ہومرلین کے پنجے سے نکل کر کسی دوکان کا تالا توڑنے پہونچ گیا ہوگا، یا بچوں کی دولت مشترکہ گیا ہوگا؟ جی ہاں ٹم دوسرے دن اسکول گیا اور ہمیشہ کے لئے تالا توڑنے سے توبہ کر کے گیا۔ ایک بجے کی گاڑی سے مسکراتا ہوا اترا اور بڑی گرم جوشی سے ہومرلین سے ملا، صرف یہی نہیں بلکہ ٹکٹ سے بچے ہوئے پیسے بھی ہومرلین کو واپس کر دیئے آخر یہ کیا تماشا تھا؟ اس درجہ بگڑا ہوا لڑکا چند منٹ میں کیوں کر راہ راست پر آگیا؟ بات صرف اس قدر ہے کہ شروع شروع میں سخت گیر باپ نے بچے کو راہ راست پر رکھنے کے لئے اور پھر پولیس نے راہ راست پر لانے کے لئے طاقت اور خوف کا استعمال کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بچے کے دل میں طاقت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور اس جذبے کی تسکین کے لئے وہ تخریبی افعال پر اتر آیا، چونکہ لڑکے کو سزا اور طاقت کے استعمال سے ستایا گیا تھا، لہٰذا اپنے جذبۂ انتقام کو تسکین دینے کے لئے دوسروں کے ستانے میں اسے لذت محسوس ہونے لگی۔ یہ تھی اس کی مجرمانہ حرکات کی بنیاد، اس کی سماج دشمن حرکات کا یہ اثر ہوا کہ ہر شخص نے لڑکے پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا، لہٰذا اس کی نفرت کا جذبہ سخت سے سخت تر ہو گیا۔ ہومرلین نے صرف ایک موثر اور بر وقت تدبیر سے اسے صحیح طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا۔

عدالت کے کمرے میں ہومرلین کے سامنے جج دل میں یہ یقین لئے ہوئے کھڑا تھا کہ اس شخص کا طرزِ عمل بھی دوسرے لوگوں سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ یہ جبراً اپنے ساتھ اسکول لے جائے گا اور وہاں اس کا سلوک بھی ٹھکانہ ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہومرلین سے بھی متنفر نظر آتا تھا مگر لڑکے کی امید کے خلاف ہومرلین نے مکمل اعتماد اور ہمدردی کا مظاہرہ کرکے لڑکے کی وہ حالت کردی جو ایسے شخص کی ہوتی ہے جو پوری طاقت سے رسی کو کھینچ رہا ہو اور مدمقابل دوسرا سرا چھوڑ دے۔ لڑکا سخت رویہ کے مقابلے کے لئے آمادہ تھا مگر ہومرلین نے حد درجہ نرمی کا مظاہرہ کیا تو لڑکا خود اپنی طاقت کے جھونک میں چاروں شانے چت گرا۔ اور اس کی نفرت کا خول چور چور ہوگیا۔ ہومرلین سمجھ چکا تھا کہ لڑکا بیرونی اقتدار کا باغی ہوچکا ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ خود اس کے اندر چھپے ہوئے اقتدار کے سامنے اسے جھکنے پر مجبور کیا جائے، نتیجہ یہ نکلا کہ بیرونی دباؤ ہٹ جانے کے بعد اس کا اندرونی اقتدار اُبھر آیا اور خود اس کے ضمیر نے اس کو اسکول جانے پر مجبور کردیا

تعلیمی احساس کمتری

جج :۔ "ملزم کا کیا جرم ہے؛ اسے عدالت کے سامنے کیوں پیش کیا گیا ہے؟"

ادارہ کی نگراں (MATRON) :۔ محترم رات کے سوا گیارہ بجے ملزم کے کمرے میں روشنی ہورہی تھی، حالاں کہ دولت مشترکہ کا قانون یہ ہے کہ رات کے دس بجے کے بعد کسی کمرے میں روشنی نہ ہو۔ ملزم نے صریحی قانون شکنی کی ہے۔ لہٰذا مناسب سزا کا مستحق ہے؟

جج ملزم سے :۔ "جری (JERRY) تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؛ تم اتنی رات گئے کیا کر رہے تھے؟"

جری (ملزم) محترم میں حساب کے کچھ سوالات حل کر رہا تھا، میں سوالات میں اتنا محو ہوگیا کہ وقت کا اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ میں نے عمداً قانون شکنی نہیں کی ہے" ابھی ملزم کے لبوں سے الفاظ بھی ادا نہ ہوئے تھے کہ عدالت کے ایک گوشے سے قہقہہ بلند ہوا۔ ملزم نے قہر آلود نظروں سے قہقہہ لگانے والے کو دیکھا اور جج نے فوراً نشانہ خاموش! حاضرین کی نظریں ہنسنے والے کی تلاش میں

[illegible] میں ایک ادھیڑ عمر کا انسان بیٹھا تھا جو اپنی نامناسب حرکت پر پشیمان نظر آرہا تھا۔ یہ تھا ہومرلین دولت مشترکہ کا مہتمم، نیچ اسی ادارے کا ایک چودہ سالہ طالب تھا۔ اور ملزم ایک تیرہ سالہ طالب علم جس کا نام جری تھا۔

دولت مشترکہ میں داخل ہونے سے قبل جری کمزور طلباء کے ایک مدرسے کا طالب علم تھا۔ لکھنے پڑھنے سے سخت بیزار اور مدرسہ سے متنفر، جب بھی موقع ملتا اسکول سے بھاگ نکلتا مسلسل سزائیں دی گئیں۔ مگر یہ خوئے بد پختہ سے پختہ تر ہوتی گئی، جب اصلاح کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو بچوں کی دولت مشترکہ میں داخل کر دیا گیا، جری دولت مشترکہ کے لئے عجیب دلچسپ معمہ تھا، زندہ دِل۔ بذلہ سنج کھیلوں میں دولت مشترکہ کی روح رواں اور دستکاری کا صرف شائق ہی نہیں بلکہ کام میں جدت پسند اور پختہ کار، مگر جب مدرسے کے کمرہ میں داخل ہوتا تو اس کی جدت پسندی اور زندہ دلی رخصت ہو جاتی، پسینہ آنے لگتا، جب استاد کچھ کہتا تو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا، کتاب کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا، مگر اس کی سمجھ میں خاک نہ آتا، خاص طور سے حساب میں صفر تھا معمولی سے معمولی سوال بھی اس کی دسترس سے باہر تھا، ادارے کے استاد ہمت ہار چکے تھے، ہومرلین کی متعدد کوششیں بھی رائگاں ہو چکی تھیں، مگر ایک معمولی واقعے سے ہومرلین کو اس کا علاج سوجھ ہی گیا۔

ایک دن جری ہومرلین کے کمرے میں داخل ہوا۔ آنکھوں میں چمک، چہرہ شگفتہ اور ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ۔ بڑی بے تکلفی سے بولا:

ذرا مشترکہ کمرہ (COMMON ROOM) تک چلئے۔ میں آپ کو ایک تماشہ دکھاؤں، بچے نے ہومرلین کو ایک میز کے سامنے کھڑا کر دیا، میز پہ ایک معمہ کھلا پڑا تھا، معمہ خاصا مشکل تھا، مگر ہر مہرہ ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پہ تھا، جری نے فاتحانہ انداز میں اعلان کیا۔

استانی سر مار کر عاجز آگئی۔ مگر مہرے درست نہ کر سکی، میں نے پورا ایک گھنٹہ صرف کر کے اس کو حل کر دیا ہے۔

ہومرلین یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا، اس لئے کہ جری کے علاج کا نسخہ ہاتھ آگیا تھا۔ اپنے کمرہ میں واپس آکر استانی کو بلایا اور حساب کا ایک معمولی سوال دے کر ہدایت کی کہ یہ سوال تعلیم کے دوران میں جری کو دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ حل نہ کر سکے گا، اس صورت میں اسے کچھ اس انداز سے ہومرلین کے پاس روانہ کر دیا جائے جیسے سزا کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔

جیسا خیال تھا وہی ہوا، دوسرے دن جری سوال لئے ہومرلین کے کمرے میں داخل ہوا ہومرلین خلاف معمول بڑی سختی سے پیش آیا، سوال دیکھ کر بولا:۔

تم اتنے بڑے ہو کر اتنا معمولی سوال نہیں حل کر سکتے؟ دیکھو ابھی ابھی میں اس سوال کو زبانی حل کر کے تمہیں شرمندہ کرتا ہوں۔

سوال حل کرنا شروع کیا تو عمداً ٹھوکریں کھانا شروع کیں، ہومرلین کا حال دیکھ کر لڑکے کو دلچسپی پیدا ہوئی، جب سوال زبانی حل نہ ہو سکا تو ہومرلین نے پنسل اور کاغذ اٹھا لیا، پھر بھی ایسی کھلی کھلی غلطیاں کرنے لگا، جن پر لڑکے نے اسے ٹوکنا شروع کیا۔ آخر ہومرلین نے بڑے اضطراب کا اظہار کیا، ادھر ادھر دیکھ کر بولا،

دیکھو مجھے یاد ہی نہیں رہا، میرا گھوڑا بیمار ہے، مجھے اس کے متعلق معلوم کرنا ہے تم خوامخواہ میرا وقت خراب کر رہے ہو۔ لے جاؤ اپنا سوال اور اب کبھی اس طرح میرا وقت خراب کرنے مت آنا لڑکا یہ سن کر مسکرایا، ہومرلین تو باہر نکل گیا۔ مگر لڑکے کو یقین ہو گیا کہ گھوڑے کی بیماری محض بہانہ تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف یہ سوال جری نے حل کر لیا بلکہ حساب میں اس کی دلچسپی کا یہ حال ہو گیا کہ رات کے سوا گیارہ بجے تک سوال حل کرتا رہتا تھا، اسی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ہومرلین شہری عدالت میں اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔

جری کو اسکول سے اس لئے نہیں نفرت تھی کہ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ اس لئے نہیں پڑھ سکتا تھا کہ اسے مسلسل سزاؤں کی وجہ سے اسکول سے نفرت ہو گئی تھی، اسی وجہ سے جماعت کے کمرے میں اس کا دماغ بالکل بے کار ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی معاملے میں

اسے کسی طرح احساس کمتری پیدا ہوگیا، خاص طور سے حساب کے معاملہ میں اپنی بے بسی کا بھی طرح احساس ہوگیا، جب تک یہ احساس دور نہ کیا جاتا اس وقت تک اس کی اصلاح ناممکن تھی، مرض کافی پرانا اور سخت تھا، پرانے مرض کا کامیاب علاج اسی صورت میں ممکن ہے جب پہلے مرض کا مادہ پورے طور سے ابھار دیا جائے، اور پھر مرض کی بیخ کنی کے لئے پوری طاقت کی دوا دی جائے اسی لئے ہیڈ مرلین نے ابتدا میں وہ طرز عمل اختیار کیا جس سے لڑکے کا احساس کمتری پوری پوری شدت سے اُبھر گیا، اس کو شرمندہ کیا اور نااہل بتایا اور پھر جب خود حل کرنے بیٹھا تو ایسی ایسی غلطیاں کیں جن تک لڑکے کی نظر بھی پہونچ گئی، اس طرح رفتہ رفتہ لڑکے کو یہ احساس دلایا کہ وہ ہیڈ مرلین سے بہتر جانتا ہے، آخر میں کچھ اس انداز میں پسپائی اختیار کی کہ لڑکے کو اپنی برتری کے اظہار پر پورے طور سے آمادہ کر دیا، چناں چہ لڑکے کا احساس کمتری ختم ہوگیا۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، لہٰذا اس کی اصلی صلاحیتیں بروئے کار آگئیں اور جس کام کو وہ اپنے بس کی بات نہیں سمجھ رہا تھا اسی میں اسے دلچسپی پیدا ہوگئی۔

مذکورہ چند واقعات سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کتنا اہم مسئلہ ہے اگر ایک قدم غلط اُٹھ جاتا ہے تو اکثر حالات میں اس کا خمیازہ بچے کو عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے حقیقت میں بچے کی شخصیت اس طرح لپٹی لپٹائی ہوتی ہے جس طرح ریشم کے کیڑے کے لپیٹے ہوئے تار، بظاہر ان کا کھولنا بہت آسان مگر حقیقت میں بہت مشکل، اگر ریشم خام کسی ہنر مند کے ہاتھوں پڑ جاتا ہے تو اس کی چست اور نرم انگلیاں ایک ایک تار کھول کر سلجھا دیتی ہیں، جب یہی ریشم خام اس کے ہاتھوں میں پہونچتا ہے جو پورے طور سے اس فن کا ماہر نہیں تو کچھ تار سلجھ جاتے ہیں اور کچھ الجھ جاتے ہیں، اس طرح ریشم کی کافی کھپت ہو جاتی ہے، لیکن بدقسمتی سے اگر یہی ریشم کسی اناڑی کے پلے پڑ جاتا ہے تو اس کے کھردرے ہاتھ نرم و نازک تاروں کو اس طرح الجھا دیتے ہیں کہ جلا کر راکھ کرنے کے علاوہ وہ کسی اور مصرف کا نہیں رہتا، یہی حال بچے کا ہے، اگر بچہ کسی نااہل مربی کے چنگل میں پھنس جاتا ہے تو مربی کی نااہلی بچے کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر اسے معاشرے کے لئے

عذاب بنا دیتا ہے۔ بصورت دیگر اگر کوئی بچہ کسی نیم حکیم کا تختۂ مشق بنتا ہے تو اس کی بعض صلاحیتیں
پس پیکر تباہ ہو جاتی ہیں اور صرف چند صلاحیتیں ابھرنے پاتی ہیں، البتہ اگر خوش قسمتی سے کوئی مکمل
مربی مل جاتا ہے تو بچے کی شخصیت کے نازک سے نازک تار کو بھی اس طرح سلجھا دیتا ہے۔ کہ
اس کی معمولی سے معمولی صلاحیت بھی فنا نہیں ہونے پاتی، لہٰذا اگر کسی کے دل میں باپ یا استاد
بننے کا شوق ہے تو بچے کی نفسیات اور بچے کی صحیح تربیت کے متعلق معلومات بہم پہونچانا بھی اس کا
فرض اولین ہے •

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

پیشہ ورانہ تعلیم

پچھلے دنوں جمہوریہ آئرلینڈ کے وزیر معارف نے کولان اور بال بگین میں دو تکنیکی اداروں کا افتتاح کیا۔ ان دونوں اداروں کے افتتاح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آئرلینڈ میں پیشہ ورانہ یا تکنیکی تعلیم کافی فروغ پا رہی ہے ۱۹۳۹ء سے ۱۳ نئے پیشہ ورانہ مدرسے کھل چکے ہیں لیکن پھر بھی مزید اداروں کی مانگ بڑھ رہی ہے، اس بڑھتی ہوئی مانگ کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے چار مدرسوں کی تعمیر میں لوگوں نے رضاکارانہ طور پر کام کیا۔ ۱۹۳۰ء میں پیشہ ورانہ تعلیمی ایکٹ منظور ہوا اور اس سال سے اس ملک میں پیشہ ورانہ تعلیم کو بھی فروغ ملنا شروع ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۲۷ء میں پیشہ ورانہ اداروں کی تعمیر و تجدید کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی، اس ایکٹ نے اس کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے اس عہد کے مدارس کو نئی زندگی اور نیا رنگ دے کر بخشا جبکہ پیشہ ورانہ تعلیم کو پھیلانے کے لئے اس ایکٹ کے مطابق پیشہ ورانہ تعلیمی انجمنیں قائم ہوئیں، ان انجمنوں کا کام ان اداروں کا نظم و نسق اور ان کی مالیات کو دیکھنا ہے، اس کے علاوہ ان کا کام طلبا کے لئے نصاب مقرر کرنا بھی ہے، اس قانون کی رو سے وزیر معارف کو یہ بھی اختیار ہے کہ تعلیم مزید کو جاری رکھنے کے لئے ۱۴ سال سے ۱۶ سال کی عمر کے بچوں کے لئے جو کسی منظور شدہ مدرسے میں موجود ہوں اسے لازمی قرار دے سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۲ء تک اس ملک میں ۲۰۷ پیشہ ورانہ مدارس قائم ہوئے جن کی تعمیر میں ۴۵۸۲۵۰۱۰ پونڈ لاگت آئی۔ ان میں سے بعض مدارس تین یا چار کمروں پر مشتمل تھے جن کی تعمیر میں ۲۵۰۰ پونڈ سے ۴۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے، قصبوں اور شہروں میں ان مدارس سے کہیں زیادہ بڑے

بعدوں کی فرحت ہے اس قانون کی رو سے جو نئے اچھے ادارے قائم ہوئے تیر ہوئے ان میں سے
ایک کالج آف اسکول آف کامرس اینڈ ڈومیسٹک سائنس (گھریلو سائنس اور اقتصادیات کا ادارہ) اور
دوسرا ڈبلن کا میری ڈومیسٹک سائنس کالج ہے، ان دونوں کالجوں کی تعمیر میں علی الترتیب
.....، پونڈ اور ..... پونڈ صرف ہوئے۔

قصبوں اور شہروں میں ٹریڈ یونین اور آجرین کے تعاون سے کارآموزی کی تربیت کا انتظام
بھی کیا گیا ڈبلن میں اس طرح فن تعمیر، چھپائی، گھڑی سازی جیسے پیشوں کی تربیت کا اہتمام ہوتا
ہے۔ گالوے میں جہاز رانی کی تربیت کا ایک مخصوص کورس ہوتا ہے، اور کارک میں بحری انجینئرنگ کی
تربیت دی جاتی ہے اور بعض مقامات پر تو شکر سازی کے کارخانوں اور بجلی کے محکموں میں کارآموزی
کی تربیت دی جاتی ہے، ۱۹۴۸-۴۹ء میں طلبا کی مجموعی تعداد جو مختلف پیشوں کی تربیت میں شامل
ہوئی ۸۰۹۶۲ تھی

تعلیمی آزادی

برلن کے تعلیمی سینیٹر ڈاکٹر نائی برٹیس کا یہ اعلان کہ وہ یونی ورسٹی کے متعلق اپنے مجوزہ مسودہ قانون کو
واپس لیں گے ٹیکنیکل کالج اور فری یونی ورسٹی کی بہت بڑی جیت ہے، اس مجوزہ قانون کا مقصد برلن
ٹیکنیکل کالج اور فری یونیورسٹی کی آزادی کو محدود کر دینا تھا، اس اقدام سے انھوں نے میونسپل کارپوریشن
کے حکام کو تعلیمی اداروں کے اندرونی نظم ونسق اور ان کے نظام کار میں دخل دینے سے روک دیا۔
ڈاکٹر نائی برٹیس کا خیال ہے کہ نازیوں کے عہد اقتدار اور دوران جنگ میں یہ پرانا ٹیکنیکل کالج
اپنے انتظام وانصرام میں کچھ بے راہ سا ہو گیا ہے، اس لئے اس کی بے قاعدگی کو دور کرنا ضروری ہے
۱۹۴۸ء میں حالات کچھ ایسے ہنگامہ خیز تھے کہ فری یونی ورسٹی کو غیر معمولی طور پر آزاد پبلک کارپوریشن
کا درجہ حاصل ہو گیا، جہاں چہ سینیٹر موصوف نے اس کے نظام کار کو از سر نو مرتب و منظم کرنے کے لئے
یہ مسودہ قانون پیش کیا، اس سے ان اداروں کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، لیکن ڈاکٹر نائی برٹیس
اداروں کے باشندوں کی بہت سی وجہ سے مقام حاصل ہو جاتا ہے اس لئے اس کے حصول کے لئے دو ...

بنیادی چیزوں کو ختم کرنے کے درپے تھے ۔۔۔ لیکن ڈاکٹر ٹائی برٹیس نے اسے محسوس کر لیا اور اس میں فری یونی ورسٹی کو کچھ آہنی کوششیں نہیں کرنی پڑیں ۔ فری یونی ورسٹی فی الحقیقت اس علاقے میں مغربی افکار و خیالات کی نمائندہ ہے اور سوسی حلقے کی ہم بولٹ یونی ورسٹی کا بدل سمجھی جاتی ہے ، قدیم ٹیکنیکل کالج نے اس جدید ادارے کا اثر قبول کر لیا اور دونوں کے ریکٹر نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا کہ یونی ورسٹی کے متعلق جو مسودہ قانون پیش ہونے والا ہے ہمارے لئے مہمل اور غیر ضروری ہے ۔

برلن میں جو کچھ شروع ہوا وہ وہیں ختم ہو جاتا ، اگر مغربی جرمنی کے مقامی حکام (متعلق بہ زمین) اس وقت ہیڈل برگ ، فرائی برگ اور توبن جن یونی ورسٹیوں میں اساتذہ کے تقرر میں براہ راست دخل دینا شروع نہ کر دیتے ، ان اداروں نے حکام کے اس رویے کے خلاف احتجاج ہی نہیں ، اس کا مقابلہ بھی کیا ان کے سامنے برلن کی مثال تھی اور اس مثال سے ہی ان میں انتی تاب مقاومت بھی پیدا ہو گئی ۔

ڈاکٹر ٹائی برٹیس نے جو کنکر پھینکا اور اس سے جو لہریں پیدا ہوئیں ، وہ دور دور تک پھیل گئیں اور یہ اسی لہر کے اثرات ہیں کہ یونی ورسٹی ریکٹرز کی کانگرس کے ایجنڈے پر سب سے پہلی چیز یونی ورسٹی اور حکومت کے تعلقات اور ان کے اختیارات کا مسئلہ ہے ۔ ان ریکٹرز نے برلن میں حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی اور کہا کہ حکومت یونی ورسٹیوں کو مزید زبردست بنانے کی کوشش نہ کرے ، اور یونی ورسٹیوں کو جو آزادی تعلیمی چارٹر کی رو سے میسر ہے ان سے نہ چھینی جائے ۔

ریکٹرز کانگرس میں مغربی جرمنی اور برن کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نمائندے موجود تھے ، یہاں جو کچھ طے ہوا اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا ، ڈاکٹر ٹائی برٹیس کا مسودہ قانون کو واپس لینے کا اقدام بھی نہایت مستحسن ہے ، اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک مخصوص بیان بھی دیا اس میں انہوں نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جسے یونی ورسٹی کے نمائندوں نے پہلے منظور نہ کر لیا ہو ، حتیٰ کہ طلبہ کی جماعتوں نے بھی اسے اپنا لیا ہے ۔

مدرسین کی کمی

مدرے ہاؤس ٹریننگ کالج ہیڈن برا کے ناظم تعلیمات ڈاکٹر انگلیس نے ایڈن برا صوبائی تعلیمی کمیٹی کا

خواست پر ایک یادداشت مرتب کی ہے جن میں ایسے امور کا ذکر ہے جن کا پیشے سے براہ راست تعلق
ہے، اس میں موجودہ اساتذہ کی کمی کو بھی نگاہ میں رکھا گیا ہے۔

اس یادداشت کی رو سے محکمۂ تعلیم کے ملازمین کے حالات اور ان کی ملازمتوں کے متعلق تحقیقات
ضروری سمجھی گئی ہے، یہ درست ہے کہ درس و تدریس کے سلسلے میں بہت سی ایسی باتیں پیدا ہو گئی
ہیں جن سے اس پیشے کی جاذبیت کم ہوتی جاتی ہے۔ پچھلے چند سال سے نوجوانوں کو اور دوسری
ملازمتیں مل جاتی ہیں اس لئے مدرسی کے پیشے کی طرف لوگ کم توجہ دیتے ہیں اور نوجوانوں کے
ہی مخصوص گروہ سے اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا، اس سے پہلے دوسری ملازمتوں کی نسبت لوگوں کو
اس پیشے میں کچھ فائدے حاصل تھے لیکن موجودہ سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے ان میں یا تو کمی
کر دی گئی ہے یا انہیں بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔

اس یادداشت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موجودہ تعلیمی اور تدریسی ترقیوں نے معلم اور صدر معلم
کے جذبۂ خود کاری کو محدود کر دیا ہے، مدرسے کی انفرادیت کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کی بجائے اب ایک
یا نظام تعلیم منظر عام پر آگیا ہے، اس نئے نظام میں یا تو پورے ملک یا پورے شہر کے لئے ایک ہی نظام اور
ایک ہی طریق کار ہوتا ہے اور یہ مدرسے ناظم تعلیمات اور محکمے کے دوسرے افسروں کی تجویزوں کے مطابق اور
ان کے مشوروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کام کرتے ہیں، ایسے نظام کار میں بھی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

مدرسین کو بالعموم یہ شکایت رہتی ہے کہ انھیں ایک نہیں بیسیوں آقاؤں سے سابقہ پڑتا ہے
ابتدائی مدارس میں مخصوص مضامین کے نگراں کے تقرر میں معتدبہ اضافہ، جماعت میں مدرس کے
کام کو بے وقیع کر دیتا ہے، اس سے کام میں تعطل اور جمود پیدا ہو جاتا ہے اور۔ اس نظام کے زیر اثر
اس کے خطرات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔

اس یادداشت میں مدرسین کے معیار، ان کی فراہمی اور ملازمت کی شرائط کے متعلق بھی تفصیلات
موجود ہیں، اور یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ..... اس یادداشت کو مرکزی عاملہ اور صوبائی انجمنوں کے پاس
ان کے تنقید و مشورے کے لئے بھیجا جائے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

نیڈ ۔ ۱۸/۱۸۱۱ — ۲۱ اپریل ۱۹۵۳ء

گورنر پنجاب نے جناب ایس ۔ ایم ۔ شریف ۔ ایم ۔ اے (کینٹب) ناظم تعلیمات پنجاب اور سیکریٹری شعبہ تعلیمات حکومت پنجاب کو یونیسکو کی مجلس عاملہ میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائی ۔ مجلس عاملہ کی یہ میٹنگ پیرس میں منعقد ہو گی ۔ ۶ اپریل ۵۳ء سے ۲۵ اپریل ۵۳ء تک کا زمانہ سرکاری کام کی انجام دہی میں شمار کیا جائے گا ۔

جناب ایس ۔ ایم ۔ شریف کی عدم موجودگی میں میاں سراج الدین بی ۔ اے ۔ بی ٹی (آکسن) پی ۔ ای ۔ ایس ۔ درجہ اول (سلیکشن گریڈ) بحیثیت ناظم تعلیمات پنجاب اور سیکریٹری شعبہ تعلیمات حکومت پنجاب کام کریں گے ۔

جناب ایس ۔ ایم ۔ شریف ۵ اپریل ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ہوں گے اور وہیں سے بعد دوپہر وہ اپنے عہدہ کا چارج دے دیں گے ۔

نیڈ ۔ ۸۵۷۸ — ۲۸ اپریل ۵۳ء

گورنر پنجاب نے م ۔ ایم ۔ اے مخدومی ایم ۔ اے ۔ ایم ۔ ایڈ (لیڈز) انسپکٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوشن پنجاب کو بارہ دن کی رخصت مرحمت فرمائی اور ۱۳ اپریل سے ۲۰ اپریل تک تعطیل مشاہرے کی طبی رخصت عطا فرمائی ۔

م ۔ ثناء اللہ خاں ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ای ۔ ایس ۔ (دوم) افسر بکار خاص دفتر ناظم تعلیمات پنجاب کو پی ۔ ای ۔ ایس (اول) میں (بمشاہرہ ۳۵۰ ۔ ۲۰ ۔ ۵۰۰/۴۰ ۔ ۹۵۰ ۔ ۵۰ ۔ ۱۲۰۰) ترقی ملی اور وہ یکم اپریل ۵۳ء تا ۳۰ اپریل ۵۳ء م ۔ ایم ۔ اے ۔ مخدومی کی جگہ قائم مقام انسپکٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوشن کے کام کریں گے ۔

ایس ۔ شبیر حسین ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ای ۔ ایس (دوم) ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز گجرات بحیثیت افسر بکار خاص دفتر ناظم تعلیمات پنجاب ۔ م ۔ ثناء اللہ خاں ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ای ۔ ایس (اول) کی جگہ بدستور کام کرتے رہیں گے ۔

نیڈ ۔ ۱۰۴۸۷ — ۲۷ مارچ ۵۳ء

ایس ۔ شبیر حسین ۔ ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی ۔ پی ۔ ای ۔ ایس (دوم) ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز گجرات م ۔ ثناء اللہ خاں کی جگہ قائم مقام افسر بکار خاص دفتر ناظم تعلیمات پنجاب بمشاہرہ خود مقرر ہوئے ۔ اس سلسلے میں انھیں ۔۔۔ روپے مخصوص تنخواہ ملے گی ۔

نیڈ ۔ ۱۲۶۹۷ — ۳۰ اپریل ۵۳ء

چودھری عبدالوحید بی ۔ ایس سی ۔ بی ۔ ٹی ۔ پی ۔ ای ۔ ایس (دوم) ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز جہلم

ڈاکٹر غلام حسین خاں نیازی پی۔ای۔ایس (دوم) کی جگہ جن کا تبادلہ بحیثیت اے۔ڈی۔او (ایم) دفتر ناظم تعلیمات پنجاب میں ہو چکا ہے ۱۷ اپریل ۵۳ء سے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز لائل پور مقرر ہوئے۔ بشاہرہ خود۔

۱۰۵۸۰- / ۲ مارچ ۵۳ء — م۔ عبدالعزیز ایم۔اے۔بی۔ٹی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال (ضلع شیخوپورہ) آزمائشی پی۔ای۔ایس (دوم) نیا اسکیل ۲۵۰--۲۰--۴۵۰/۲۵--۶۰۰/۲۵--۷۵۰ روپے ایک خالی اسامی پر ۲ جنوری ۵۳ء سے اس تنخواہ میں مستقل ہوئے۔

کالج ———— شعبہ نساء

۱۳۰۹ / ۴ اپریل ۵۳ء — ڈاکٹر (بیگم) کنیز صدیقی ایم۔اے۔ڈی۔ٹی۔(لکھنؤ) ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی (شکاگو) سینیئر لکچرار و قائم مقام پرنسپل گورنمنٹ کالج فار وی من۔ راولپنڈی۔ پی۔ای۔ایس (دوم) بشاہرہ ۴۰۰--۲۵--۵۵۰--۲۵--۷۵۰ پرنسپل گورنمنٹ کالج فار وی من (بشاہرہ ۶۰۰--۴۰--۱۰۰۰/۵۰--۱۲۰۰) پی۔ای۔ایس۔ اول میں ۱۶ فروری ۵۳ء سے مقرر ہوئیں۔

۱۳۸۸۸- — مس نگہت راتا بٹ ایم۔اے (فارسی) ایم۔او۔ایل۔ لکچرر گورنمنٹ کالج فار وی من ملتان۔ (آزمائشی) بیگم عروج کی جگہ لکچرر گورنمنٹ کالج فار وی من گجرات مقرر ہوئیں۔ بشاہرہ خود۔ (تاریخ حاضری سے)

بیگم عروج ایم۔اے (فارسی) بی۔ایڈ لکچرر گورنمنٹ کالج فار وی من گجرات (آزمائشی) مس نگہت بٹ کی جگہ لکچرر گورنمنٹ کالج فار وی من ملتان مقرر ہوئیں۔

۱۲۳۰۲ بلیو- / ۱۱ اپریل — مس تاج بیگم ایم۔اے (فارسی) ایم۔او۔ایل۔ لکچرر لاہور کالج فار وی من۔ لاہور۔ پی۔ای۔ایس (دوم) آزمائشی (۲۵۰--۲۰--۴۵۰/۲۵--۶۰۰/۲۵--۷۵۰ روپے) ایک خالی آسامی پر یکم مارچ ۵۳ء سے اپنے اس عہدہ پر مستقل ہوگئیں۔

مس ثریا سلطانہ فضل ایم۔اے (تاریخ) لکچرر لاہور کالج فار وی من لاہور۔ پی۔ای۔ایس (دوم) آزمائشی بشاہرہ (۲۵۰--۲۰--۴۵۰/۲۵--۶۰۰/۲۵--۷۵۰ روپے) ایک خالی آسامی پر یکم مارچ ۵۳ء سے اپنے اس عہدہ پر مستقل کی گئیں۔

مس اقبال ایم ڈار ایم۔اے (فلسفہ دوم) لکچرر لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور۔ پی۔ای۔ایس (دوم) آزمائشی بشاہرہ (۲۵۰--۲۰--۴۵۰/۲۵--۶۰۰/۲۵--۷۵۰ روپے) ایک خالی اسامی پر اپنے اس عہدہ میں مستقل کی گئیں۔

بیگم سعیدہ رشید ایم۔اے (معاشیات) لکچرر لاہور کالج فار وی من۔ پی۔ای۔ایس دوم

دانشمند) بمشاہرہ ۲۵۰-۲۰-۴۵۰/۲۵-۶۰۰-۲۵/۷۵۰ روپے ایک خالی اسامی پر اپنے اس عہدے پر مستقل ہوئیں۔

کالج ______ شعبۂ رجال

زیڈ ۱۲۴۰۸ ۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء — جناب ایس۔ ایم۔ شریف صاحب ایم۔ اے کی واپسی پر گورنر پنجاب نے میاں سراج الدین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ لٹ (آکسن)، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کو یکم مئی ۱۹۵۳ء سے ان کے مزید فرائض سے سبک دوش ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ میاں سراج الدین صاحب اس وقت تک بحیثیت ناظم تعلیمات پنجاب اور سیکریٹری محکمہ تعلیم حکومت پنجاب کام کرتے

زیڈ ۱۵۰۸۶ ۲۲ مئی ۱۹۵۳ء — میاں اظہار الحسن صاحب بی۔ ایس سی (انجینئری کلچر) بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (اول) رجسٹرار محکمۂ امتحانات دفتر ناظم تعلیمات پنجاب۔ م۔ محمد محسن کی جگہ، جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ انسپکٹر آف ورنیکلر ایجوکیشن (دفتر ناظم تعلیمات پنجاب) مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے۔ میر محمد محسن، بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی، پی۔ ای۔ ایس (اول) انسپکٹر آف ورنیکلر ایجوکیشن (دفتر ناظم تعلیمات پنجاب) میاں اظہار الحسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، رجسٹرار محکمۂ امتحانات دفتر ناظم تعلیمات پنجاب مقرر ہوئے۔ تاریخ حاضری سے۔

ڈی/۱۶۳۱۰ ۲۸ مئی ۱۹۵۳ء — م۔ سعد اختر لکچرر جغرافیہ گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں بمشاہرہ ۲۲۵-۱۵-۴۵۰۔ ایس۔ ایس۔ اے۔ ڈی سیکشن ایک نئی آسامی پر جسے حکومت پنجاب نے بحوالہ چٹھی نمبر ۲۷۶۳ منظور کیا ہے، گورنمنٹ کالج منٹگمری کے ملٹری ونگ میں ۲۷ اپریل ۱۹۵۳ء سے سینیئر انسٹرکٹر بمشاہرہ ۳۵۰-۲۰-۴۵۰/۲۵-۶۰۰-۲۵/۷۵۰ مقرر ہوئے۔

ڈیڈ/۱۵۳۴۱ ۱۹ مئی ۱۹۵۳ء — م۔ محمد افضل ایم۔ اے۔ لکچرر گورنمنٹ کالج منٹگمری، ایک آسامی پر جسے حکومت پنجاب نے بحوالہ چٹھی نمبر ڈبلیو/۱۵۰۸۲، منظور کی قلیل وقتی لکچرر گورنمنٹ زنانہ کالج منٹگمری مقرر ہوئے، ان کی تنخواہ ۹۰ روپیہ مقرر ہو گی۔

ڈیڈ ۱۴۳۶ ۷ مئی ۱۹۵۳ء — م۔ عبد القدیر بیگ ایم۔ ایس سی (آنرز) اسسٹنٹ ماسٹر سینئر اسکول لارنس کالج گھوڑا گلی بمشاہرہ ۲۲۵-۵-۴۵۰/ (اس کے علاوہ ۵۰ روپے مخصوص الاؤنس) اپنے آزمائشی زمانے کے ختم ہونے پر اسی گریڈ میں ایک سال کے لئے مزید عارضی مستقل اسسٹنٹ ماسٹر مقرر کئے گئے۔

ڈیڈ ۱۵۶۲۶ ۲۱ مئی ۱۹۵۳ء — م۔ محمد زمان شیخ۔ قائم مقام لکچرر شعبۂ کیمیا گورنمنٹ کالج راولپنڈی ڈاکٹر ظفر الدین احمد ایم۔ ایس سی پی ایچ ڈی کی جگہ جن کا حق ملازمت ایس۔ ای۔ ایس کالج کیڈر گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے گورنمنٹ کالج لائل پور منتقل کیا گیا، قائم مقام لکچرر کیمیا گورنمنٹ کالج لائل پور مقرر ہوئے۔ تاریخ

Regd. No. L.5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دوھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سر پرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل / اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

ارہ ۳] لاهور [جون ۱۹۵۳ء

اس شمارہ میں

: بشیر هاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
ادم - اے - عزیز

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جون سنہ ۱۹۵۳ء

جلد ۶

شمارہ ۳

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

غیر سرکاری مدارس

پچھلے دنوں محکمہ تعلیم پنجاب نے لاہور شہر اور ضلعے کے منظور شدہ مدارس کا معائنہ کیا، اس معائنے کی نوعیت عام سالانہ معائنوں سے مختلف تھی، لاہور شہر میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز لاہور نے مختلف مدرسوں پر یورش کی جس میں کارپوریشن اور مقامی انجمنوں کے مدارس شامل تھے، اور چوں کہ ان مدارس کے ارباب اقتدار کو محکمے کے اس اقدام کا قبل از وقت علم نہیں تھا، اس لئے انہیں چند ناگزیر کوتاہیوں کی پردہ پوشی کے لئے مناسب موقع نہ ملا، اور جو رنگ مصنوعی ملمع کاری سے چھپ جاتا، اس کا صحیح رنگ روپ نمایاں ہوگیا، اس سلسلے میں ڈی، آئی، ایس۔ لاہور نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس کے چند اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں اور غالباً اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اگر حکومت، کارپوریشن اور دوسری مقامی حکومتوں (لوکل باڈیز) نے مدارس کے موجودہ حالات کو بدلنے کی کوشش نہ کی تو اس کے نتائج مجموعی طور پر قوم کے لئے مضرت رساں ہو سکتے ہیں، اس وقت صرف لاہور شہر میں مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد: ۵۲۲۶ ہے، لیکن چوں کہ موجودہ مدارس شہر کی بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لئے بچوں کی بہت بڑی تعداد تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے، ایسے طلبہ کی تعداد جنہیں کسی مدرسہ میں داخلہ نہیں ملا ۲۹۶۶۱ ہے، یعنی بچوں کی کل تعداد کے نصف سے کچھ اوپر۔ لاہور کارپوریشن کے زیر اہتمام اس وقت ۸۵ ابتدائی مدارس ہیں جن میں سے ۱۵ مدرسوں کی عمارتیں اچھی کہی جاسکتی ہیں۔ باقی ۷۰ عمارتیں کم سے کم کسی مدرسے کی عمارت کہلانے کی

مستحق نہیں ہیں، ان میں سے بیشتر ٹوٹی پھوٹی اور ناقابل استعمال ہیں، اس لئے مجبوراً بچے کھلے ہوئے میدان میں بیٹھتے ہیں، اور دھوپ کی تمازت اور باد و باراں میں انہیں بالعموم چھٹی مل جاتی ہے .....
ان حالات کے پیش نظر حکومت کارپوریشن سے کم از کم مزید پچاس ابتدائی مدارس کھولنے کا مطالبہ کرے۔
شہر کی بڑھتی ہوئی تعلیمی مانگ کو پورا کرنے کی خاطر کارپوریشن کو کچھ نئے منصوبے بنانے ہونگے
موجودہ مدارس کی توسیع اور نئی عمارتوں کی تعمیر کے لئے اگر کارپوریشن ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کرے تو وہ ان میں سے بہت سی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے، اس مجوزہ منصوبے کی رو سے ہر سال پندرہ نئی عمارتیں تعمیر ہوا کریں، جن میں سے پانچ نئے مدارس کے لئے مخصوص ہوں اور دس موجود مدارس کے لیے، ایک عمارت پر کم و بیش پچاس ہزار روپے لاگت آئے گی، اس طرح کارپوریشن کا تعمیری میزانیہ آٹھ لاکھ روپے سالانہ ہو گا۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کارپوریشن کو اپنے موجودہ سترہ فی صدی میزانیے کو بڑھا کر ۲۵ فی صدی کرنا ہو گا اور حکومت کو بھی حسب ضرورت زر امداد میں قابل قدر اضافہ کرنا ہو گا۔

اس رپورٹ میں کارپوریشن کے اراکین اور اس کے کارکنوں کو اور زیادہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ بچوں کی تعلیم ہر صورت مقدم ہے اور فی الحقیقت جس تعلیم میں بچوں کو اپنے ذہنی اور جسمانی قویٰ کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع نہ ملے اور جس میں اخلاق و صحت دونوں کی تعمیر و تکمیل کے لئے ماحول سازگار نہ ہو ایسی تعلیم ہمارے لئے نہایت مضر ہے، قوم کے کاروبار کی عنان کچھ دنوں کے بعد انہیں بچوں کے ہاتھوں میں ہو گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ تعلیم انہیں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل بنا سکے؟"

اس رپورٹ کے مطابق لاہور جیسے شہر میں پانچ نئے ہائی اسکولوں کی ضرورت ہے" یہ مدارس گل برگ کالونی، سمن آباد، مصری شاہ، راوی روڈ اور فتح چند زنانہ کالج میں کھولے جا سکتے ہیں فتح چند زنانہ کالج کی عمارت محکمہ بحالیات کے تصرف میں ہے۔ اور گورنمنٹ ہیون مجلس قانون ساز پنجاب کے ایک رکن کے قبضہ میں ہے، اگر محکمۂ تعلیم ان عمارتوں کو خالی کرائے تو سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے

رلے والے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہو سکتا ہے؟

ممکن ہے بے خبر عوام کے لئے نئی اور حیران کن ہو لیکن جو لوگ تعلیم و تعلم سے براہ راست متعلق ہیں
ر جو لوگ قوم کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے آرزو مند ہیں، وہ ان خرابیوں سے پہلے ہی واقف ہیں بلکہ
ن کی نگاہوں میں اس تعلیمی پس ماندگی اور اس بے راہ روی کے اسباب وعلل کی جزئیات بھی ہیں۔ ان کے لئے
ن اداروں کے غیر مطمئن حالات کا علم نیا نہیں ہوا ہے۔ اور اس روداد میں تو محض ان مدارس کا جائزہ لیا
لیا ہے جو منظور شدہ ہیں اور جنہیں محکمہ باقاعدہ امداد دیتا ہے، ان میں ان بے شمار تجارتی اداروں کا تو ذکر ہی
ہیں ہے جو اس صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں بکثرت موجود ہیں اور جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت
ہیں تعلیم و تربیت کی سودا بازی ہوتی ہے، لوگوں کو عام طور پر مدارس کے غیر صحت مند ماحول، تنگ و تاریک جگہ
معقول اور تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی فیس کی بڑھتی ہوئی شرح، اور مقررہ فیس کے علاوہ دوسری مدوں
کے لئے چندے جمع کرنے کی ایک نہیں بیسیوں شکایات تھیں لیکن محکمے کے اس ناگہانی معائنے سے یہ
الزام محکم تر ہو گئے۔

عبوری دور میں بالعموم اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، اس سے مایوس یا کبیدہ خاطر
نہیں ہونا چاہئے۔ مانا کہ اب سے کوئی پانچ چھ برس پہلے ان تعلیم گاہوں کے نظم و نسق میں اتنی
خامیاں نہیں تھیں لیکن آج طلبہ کی تعداد میں اضافہ، تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی اور تدریسی
لوازم کی عدم فراہمی، انتظامی بے سلیقگی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔
اس کے باوجود اگر ہم ایک مرتبہ ان خرابیوں کو دور کرنے کا ارادہ کر لیں تو یہ خامیاں دور ہو سکتی ہیں
کیوں کہ لاہور کے ان بے شمار بچوں کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانا۔ اگر حکومت کے فرائض میں داخل ہے
تو عوام بھی اس ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتے، انہیں بھی حسب مقدور آگے بڑھنا چاہئے
ہمیں یقین ہے کہ دونوں کی مشترکہ مساعی سے یہ دقتیں بھی دور ہو جائیں گی اور بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت
کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

ایک مقامی اخبار نے نجی ادارے کے عنوان سے اپنے اداریے میں موجودہ تعلیمی مسائل پر بحث

کرتے ہوئے لکھا ہے "ہمیں یقین ہے کہ محکمے نے جس عزم اور مستعدی سے اس کام کو شروع کیا ہے اس پر کاربند رہے گا اور جو لوگ اور جو ادارے اس بدنظمی کے ذمہ دار ہیں، انہیں اس کی قرار واقعی سزا بھی ملے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ان اداروں کو جو زر امداد ملتا ہے ان کی اپنی ضروریات کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے حکومت کو زرامداد کے طریق کار پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ جب تک ان اداروں کے زرامداد میں اضافہ نہیں ہوگا، ان بے قاعدگیوں کا سدباب مشکل نظر آتا ہے اور انہیں آپ تشدد سے دبا بھی نہیں سکتے"

اس میں شک نہیں کہ ان اداروں کی آمدنی کم اور ذرائع محدود ہیں، اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انہیں نئے نئے وسائل کا جائزہ لینا ہوتا ہے لیکن اسے صرف زرامداد کے ناکافی ہونے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کی توسیع میں نجی اور عوامی اداروں کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اور انہیں قوم کی تعلیمی ترقی میں بقدر استطاعت حصہ لینا چاہیئے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اچھے اداروں کے قیام کے لئے مشترکہ کوششیں کی جائیں، لاہور کارپوریشن بھی ایک عوامی ادارہ ہے اور ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کی زیادہ ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ اس روداد کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کارپوریشن اپنے سالانہ میزانیے میں سے سترہ فی صدی رقم تعلیم پر صرف کرتی ہے لیکن جو تصویر کارپوریشن کے تعلیمی اداروں کی ہمیں اس رپورٹ میں نظر آتی ہے وہ نہایت گھناؤنی ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو ان اداروں کے اہتمام کے لئے اتنی رقم ناکافی ہے۔ یا کارپوریشن کے نظام کار میں ایسی خامیاں ہیں کہ اسے اپنے محاصل کا صحیح مصرف معلوم نہیں، دوسری انجمنوں کے متعلق بھی یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے اس لئے انہیں بھی اپنے محدود وسائل کے پیش نظر اپنی آمدنی کو اچھے سے اچھے انداز میں خرچ کرنے کا سلیقہ پیدا کرنا چاہیئے۔

جنوری ۱۹۵۳ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور، محکمہ تعلیم پنجاب اور یو۔ ایس۔ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ماہرین تعلیم کا ایک سہ روزہ تعلیمی مذاکرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مذاکرے کی ایک نشست میں ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے مسائل پر کافی بحثیں ہوئیں، اور ہر شخص نے اپنے اپنے نظریات کی توضیح کی

یکن موجودہ اقتصادی بحران اور بڑھتی ہوئی تعلیمی مانگ کے پیش نظر ایک ماہر تعلیم کا یہ مشورہ کہ اگر ہم
علیم کو فی الواقع فروغ دینا چاہتے ہیں اور موجودہ دقتوں پر عبور حاصل کرنے کے... آئندہ مندہیں تو دیہی
فی کس کچھ تعلیمی سیس لگانا ہوگا نہایت معقول اور مناسب ہے، اس رقم سے نئے مدارس کھولے جا سکتے
ہیں۔ پرانی عمارتوں کی مرمت ہو سکتی ہے، اور بچوں کی ضروریات کے مطابق کتابیں خریدی جا سکتی ہیں اور
دوسرے تعلیمی لوازم مہیا کیے جا سکتے ہیں، لاہور کی موجودہ آبادی آٹھ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ اگر صرف
ایک روپیہ فی کس تعلیمی سیس لگایا جائے تو اس سے مجوزہ اسکیم پر بآسانی عمل درآمد ہو سکتا ہے ؎

احادیث نبویؐ میں مسئلہ نصاب

عبدالغفور چودھری

امام غزالی نے اس حدیث پر کہ "تلاش علم کو ہر ایک مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا گیا ہے" تبصرہ کرتے ہوئے نصاب تعلیم کے مسئلہ پر ایک بصیرت افروز بحث چھیڑی ہے[1]۔

وہ اس مسئلے کو یہ سوال پیش کرتے ہوئے اٹھاتے ہیں "وہ علم کیا ہے اور اس کی نوعیت اور ماہیہ کا تعین کون کرے گا؟" اور بحث کو جاری رکھتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ صوفی (SCHOLASTS) محدث اور فقیہ میں ایک دوسرے سے بنیادی اصولوں کے متعلق کیا اختلاف ہے جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا مخصوص شعبہ علمیت ہی وہ علم ہے جس سے آنحضرت کے ارشادات میں مراد لی گئی ہے غزالی کے مطابق یہ کسی خاص شعبہ سے متعلق نہیں ہے اور نہ یہ ہر قسم کے علم کو لازم قرار دیتا ہے" ہر فرد کو وہ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے جو اس کے لئے سماج میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے ناگزیر ہے، ہر ایک پر کوئی مخصوص شعبہ علم لازم نہیں کیا گیا ہے۔ برعکس اس کے یہ چیز (ہر شخص کے) گرد و پیش کے ماحول، وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

اس حدیث کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مخصوص طور پر مذہبی مطالعہ سے متعلق ہے لیکن ہمارے پاس اسی موضوع سے متعلق ایک دوسری حدیث ہے جو بہت واضح اور بے لاگ ہے۔ اور جس میں تلاش کے لئے دور دراز کے سفر اختیار کرنے کی شاندار روایت مضمر ہے "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین میں جانا پڑے"۔

یہاں جس علم سے مراد لی گئی ہے وہ یقیناً مذہبی علم نہیں ہو سکتا، قدرتی طور پر یہاں لفظ علم کا مفہوم

---

[1] احیاء العلوم: درسالہ علم۔

دنیوی علم لینا چاہیئے نہ کہ مذہبی معنوں میں

یہاں تعلیم کے اس بنیادی مسئلہ کے متعلق الغزالی کا رویہ معلوم کرنے کے لیے چند سطور وقف کر دینا بے محل نہ ہوگا، انہوں نے اپنے نتائج کی بنیاد احادیث پر رکھی ہے، اور اس موضوع پر ان کی رائیں ان کی وسیع علمیت، علمی تجربات اور وجدانی وقت نظر سے روشن ضمیری پیدا ہوگئی ہے، اور یہی چیز ہے جو ان کو سرد دلیل اور گرم جوش جذبات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی حیرت انگیز طاقت بخشتی ہے۔ انہوں نے تعلیم کے مافیہ کی قدر و قیمت کا اندازہ افادی نقطۂ نظر سے کیا ہے، جبکہ اجتماعی اور انفرادی مقاصد ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں اور مذہب کے تحت آکر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

جس علم کو ہر مسلم پر فرض کیا گیا ہے وہ الغزالی کے مطابق علم معاملات ہے جو اس تجربہ کا ایک حصہ ہے، جو سماج میں ایک فرد کے دوسرے افراد کے رشتہ سے گہرے طور پر متعلق ہے، اس علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، فرض عین اور فرض کفایہ —— فرض عین بلا استثنا سماج کے ہر فرد پر واجب ہے، یہ وہ فرائض ہیں جن کی انجام دہی اس کی اپنی ذات اور سماج کے لئے ضروری ہے۔ فرض کفایہ جزوی معنوں میں فرض ہے، اس لئے کہ یہ سماج کے ایک حصہ یا اس کے چند افراد پر عاید ہوتا ہے۔ لیکن اس فرض کی جزوی نوعیت سے اس فرد کی ذمہ داریوں میں کسی طرح بھی کمی نہیں آتی جو سماج میں اس مخصوص فرض کی انجام دہی کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔

تعلیم قلب جو مذہبی عقائد اور اخلاقی شعور کی ترقی پر مشتمل ہے فرض عین ہے جو سب پر عاید ہوتا ہے، کیوں کہ کوئی بشر ایسا نہیں جو حسد، غرور، بے اعتمادی، انتقام اور اس قسم کے دوسرے اخلاقی عوارض سے محفوظ ہو، اور الغزالی کے مطابق ان متعدی امراض کا علاج اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ فرد کو اس کے مناسب علاج کی تربیت نہ دی جائے۔

انہوں نے ناقدانہ انداز میں اس قسم کی مذہبی معلومات کا تجزیہ کیا ہے جو ہر فرد پر بطور فرض عاید کی گئی ہیں، جو ایسی درس گاہوں کے برعکس جہاں مذہبی علم کے پورے بوجھ کو طالب علم پر ڈال دینا پسند کیا جاتا تھا، الغزالی نے فرد کی ضروریات اور ان معلومات میں جو اسے بہم پہنچنا چاہئیں

نہایت ہوشیاری سے مطابقت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ اس کی نوعیت اور اضافیہ مختلف افرا
کے لئے مختلف حالات اور ماحول کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہئیں اور کوئی علم اسی وقت فرض ہوتا ہے
جب زندگی کی واقعی صورت حال میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، مثال کے طور پر حج کے متعلق مذہ
رسم و رواج کا جاننا اسی وقت لازم ہوتا ہے جب حج کے لئے جانے کا وقت قریب ہو، نہ کہ اس سے قبل
یا یہ کہ شادی کے متعلق مذہبی احکام سے روشناس ہونا رسم شادی ادا ہو جانے کے بعد ہی لازم ہوتا ہے
درحقیقت وہ علم اور عمل کے باہمی انحصار کو تسلیم کرتے ہیں لیکن خلا کا علم خواہ وہ مذہبی علم ہی کیوں نہ ہو جس کے
گرد تقدس کا ہالہ پڑا ہو، ان کے نزدیک تعلیمی عمل کے ایک نمایاں جزو کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا

علم کے اس حصہ کو جس کا نام انھوں نے علم کفایہ (وہ علم جو سماج کے کسی خاص طبقہ پر واجب کیا گیا
ہو) رکھا ہے۔ آگے چل کر مذہبی اور غیر مذہبی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

غیر مذہبی شعبوں میں علم ادویہ، ریاضی اور زراعت، کپڑا بننا، فصد کھولنا، خیاطی اور دوسرے شعبے
شامل ہیں، جو خالص دنیوی تعلیم کی شکلیں ہیں، وہ اپنے نتائج کی بنیاد آنحضرتؐ کی اس حدیث پر رکھتے
ہیں جس کے ذریعہ علم معاملات ہر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے۔ اس نوع کا دنیوی علم جب معاشرتی فلاح و بہبود
کے لئے سماج کے کسی خاص فرد پر فرض کی طرح عائد کر دیا جاتا ہے تو وہ اتنا ہی ضروری ہو جاتا ہے
جتنا فرض عین، اور اسی لئے وہ تعلیم جو سماج کو برقرار رکھنے اور اس کے تسلسل کی ضامن ہو، خالص
مذہبی نوعیت کے مطالعہ کی حیثیت سے تعلیمی منصوبہ کا ایک ناگزیر جزو ہے۔

ان کے نزدیک مذہبی مطالعہ کے عام عنوان کے تحت آنے والے تمام تعلیمی شعبے لازمی طور
مذہبی نہیں ہوتے، وہ اس مقصد کے لئے مقرر شدہ نصاب کے مافیہ کا ناقدانہ تجزیہ کرنے پر
زور دیتے ہیں، وہ مذہبی مطالعہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، بنیادی یا خاص مضامین، اور
مضامین اور مقدمات۔ انھوں نے اس علم کو جو بجائے خود ایک مقصد ہوتا ہے (یعنی علم برائے علم) آ
علم سے ممیز کیا ہے، جو صرف دوسرے مقاصد کے حصول کے لئے آلہ کار یا ذریعہ کا کام کرتا ہے
علم کی تیسری قسم یعنی مقدمات۔ زبان، علم نحو اور مہارت کتابت پر مشتمل ہے۔

مودّ قمی

انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس وقت کی موجودہ درس گاہوں میں بے کیف معمول ROUTINE
WOR کے ایسے کا مشاہدہ کیا تھا اور یہ دیکھ کر انہیں بڑا صدمہ ہوا تھا کہ طلبہ اپنی پوری زندگی صرف و نحو کے
قائق اور باریکیوں کو سمجھنے پر ضائع کر دیتے ہیں، وہ درحقیقت صحت و صفائی پرستی کے علاوہ کا تعصب
رکھتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ان اعلیٰ روشنیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو ان کی شخصیت کے
عالی ظرف خیالات اور سالمیت کردار سے منور کر دے۔ ان کا تجزیہ ان لوگوں کی آنکھیں کھول دیتا جو
اس قسم کی صحت و صفائی پرستانہ (PURISTIC) علمیت کو روحانی فیض اور آراستہ زندگی میں اس کا
صلہ پانے کے خیال سے حاصل کرتے تھے، انھوں نے اعلان کیا کہ مہارت حاصل کرنے کے اس آلہ کار کو
اصل تعلیم نہ سمجھنا چاہیئے اور نہ انھیں تعلیمی عمل کا خاص مدعا سمجھ کر ان کی پرستش کرنا چاہیئے، کیوں کہ ان میں
ذاتی قیمت نہیں ہے، بلکہ وہ خاص مضامین ہی سے فیض یاب ہوتے ہیں، اور ان کی
قدر و قیمت کا تعین علم کے خاص شعبوں سے متعلق چارہ کار ہی سے ہوتی ہے۔

عربی زبان سیکھنے میں یہ بے سود کوشش نہ کرنا چاہیئے کہ پوری فرہنگ پر عبور حاصل ہو جائے
بلکہ ذہانت کے ساتھ زبان کے روزمرہ کام آنے والے اور شناخت والے الفاظ کے درمیان تمیز کرنا
چاہیئے، اور اتنا ہی سیکھنا چاہیئے جتنا کہ چیزوں کو واضح طور پر سمجھنے اور بات چیت کرنے کے لئے ضروری
ہے، اور زیادہ نادر الفاظ میں سے صرف ان کو سیکھنا چاہیئے، جو قرآن اور احادیث کے مطالعہ کے لئے
ناگزیر ہیں، اتنا سیکھنا ہر عملی مقصد کے لئے کافی ہوگا۔

انھوں نے ان عالموں کے رجحان کے خلاف عظیم الشان طریقہ پر جنگ کی ہے جو مختلف قسم کے مطالعے
کرتے ہیں، اور اپنے مخصوص شعبہ کے لئے دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کو مذہبی تعلیم کا سا تقدس اور آنحضرت کی
پسندیدگی حاصل ہے، اس طرح وہ روحانی عیش اور فضیلت مآبی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اول انھوں
(امام غزالی) نے اس خیال کو باطل ٹھہرایا ہے کہ دنیوی علم کسی طرح بھی مذہبی علم سے کم تر ہے اور بتایا ہے
کہ ان میں سے دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں، اگر ایک تخم ریزی کر کے فصل تیار کرتا ہے تو دوسرا پیس کر پکاتا
ہے اور اسے شیریں بناتا ہے، اس نے چند مطالعے جن کو مذہبی حیثیت دے دی گئی تھی دنیوی علم کے

دائرہ میں منتقل کر دیئے گئے اور ان کو بڑے غور و فکر کے ساتھ مرتب شدہ تقسیم وار منصوبۂ تعلیم میں ایک مناسب جگہ دی گئی، انھوں نے عالموں کو جو اپنی حاصل کردہ مراعات کے بل بوتے پر بہت آسودہ حال تھے یہ اعلان کرکے اور بھی حیرت میں ڈال دیا (ایسی چونکا دینے والی حیرت جو ان کو اپنی زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی) کہ فقہ لازمی طور پر دنیوی علم سے متعلق ہے اس لئے نہیں کہ وہ ابتداءً سلطنت کے بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے کی غرض سے سیکھا جاتا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ سیاسی نظم و نسق سے متعلق تھا نہ کہ اخلاقی ترقی یا شخصیت کی نشوونما سے۔

جس طرح عوام کو قابو میں رکھنے کی غرض سے سلطان کو ان کے لئے قانون بنانا چاہئے، اسی طرح فقیہ کے لئے جس کو سیاسی نظم و نسق پر عبور ہوتا ہے ضروری ہے کہ وہ عدل و مساوات قائم کرنے کے فن میں ماہر ہو جس طرح مملکت کی بقا، اور اس کے نظم و نسق کے لئے سلطان کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح عوام کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لئے فقیہ کا ہونا بھی لازمی ہے جس طرح سیاسی اقتدار کے ساتھ حکمرانی کرنا اعلیٰ مذہبی تصوّرات کے مطابق نہیں ہے، اسی طرح نظم و نسق کے طریقوں اور ذریعوں کا علم جو دراصل فقہ ہے، اعلیٰ قدر و قیمت کا مذہبی مطالعہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس طرح انھوں نے نہ صرف علم کے مختلف شعبوں کی قدر و قیمت کی تشخیص کرنے کے مسئلہ کو حل کرنے میں سب سے پہلی مدد دی بلکہ دنیوی علم کو منصوبہ تعلیم میں ایک معزز فریضہ پر سرفراز کیا اور تعلیم کا ہوشیاری سے تقسیم وار مرتب شدہ منصوبہ بروئے کار لائے، ان کی تصنیف اسلامی تعلیم کے ناقدانہ مطالعہ کے لئے ایک گراں قدر اضافہ ہے، جسے ہمیشہ بنظر تحسین دیکھا جائے گا۔

ان کی رائیں دین دار شخص کے لئے تجلی و عظمت سے پر ہیں۔ اس لئے کہ ان (رائیں) کی وجہ تحریک آنحضرت کی صرف ایک حدیث ہے، ان کے خیالات کی صفائی اور نظریہ کے خلوص کی وجہ سے یہ رائیں بہت نمایاں طور پر معقول اور اعتدال پسند بن گئی ہیں، دراصل ہمارا دیسی نظام اور دوسری درس گاہیں بہت مایوس کن انداز میں ایک نئے جنم کی محتاج ہیں، ان کے مقاصد اور تصوّرات، طریقہ تعلیم اور اس مالیہ کے احیاء کی ضرورت ہے، پچھلے وقتوں میں الغزالی اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی اور داخلی سرچشموں کو

ب مرتبہ ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اس میں سے پر مغز عمل اور سرگرمی کا ایک زبردست دھارا بہہ نکلا۔
نھوں نے اپنی زبردست تصنیف "احیاء" میں ایک بار انقلابی فکر و عمل کو بیدار کیا ہے، اور ہمیں امید ہے
۔ ایک روز ان کا کوئی باہمت جانشین ہمارے دیسی تعلیم کے اس ساکن پانی کو ایک طاقت ور
دھارے میں تبدیل کر دے گا۔ لیکن اس زبردست قوت کا ماخذ قرآن اور احادیث میں مضمر ہے
و اس کی اصل بنیادیں ہیں[۱]۔

قراءت زمانہ قدیم کے لوگوں میں خیالات کا پر زور لہجہ میں اظہار کرنے اور فن تقریر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ قدیم یونانیوں اور رومیوں میں فن خطابت نصاب تعلیم میں
بہت نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ عربوں میں سیاسی خطبات اور ادبی اعلانات نے تاریخ میں ایک
بے مثال کارنامہ انجام دیا ہے، انھوں نے تاریخی واقعات کی رہنمائی کی ہے، اور بعض اوقات
ان کا رخ بھی بدل دیا ہے۔

آنحضرتؐ کی مقدس تعلیم سورہ اقرء کے نزول کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ اقرء باسم ربك الذی خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔ اقرأ وربك الاکرم[۲]۔ یہاں قراءت کا
مفہوم جماعت میں سبق کو بہ آواز بلند پڑھنے سے نہ لینا چاہیے۔ بلکہ ایک ایسی تلاوت جس سے
پوری شخصیت کے جوش و ولولہ کا جذباتی اور ذہنی طور پر اظہار ہو۔

آنحضرتؐ نے بار بار اپنی امت کو کلام پاک پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ "میری امت کے لئے اعلیٰ ترین
عبادت کلام پاک کی تلاوت ہے"[۳] پھر ارشاد ہوتا ہے۔ "تم میں سب سے زیادہ نیک (VIRTUOUS)
وہ ہے جو خود قرآن پڑھتا ہے اور دوسروں کو پڑھاتا ہے۔ اور اس پورے گروہ پر جو تلاوت کلام پاک
کے لئے جمع ہوتا ہے اس روحانیت کی رحمت نازل ہوتی ہے"[۴] ایک عالم کا قول ہے "قرآن کی ہر آیت
جنت کی ایک منزل (STAGE) ہے اور ہمارے گھروں کو منور کرنے والی ہے"

چوں کہ تلاوت قرآن اس زمانہ کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی

۱؎ اس باب کا اصل ماخذ "احیاء" (باب علم کی فضیلت) ہے ۲؎ سورۃ اقراء ۹۶ آیتہ ۱-۳ ۳؎ احیاء جلد اول صفحہ ۲۸۵ ، ۴؎ ابی داؤد،

اس لئے قاریوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو بعد میں ماہرین قرات کے متعدد مدرسوں میں تقسیم ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن اس زمانہ کی تعلیم کا ایک خاص جزو بن گئی تھی اور صحابہ تلاوت کے حد سے زیادہ دلدادہ تھے۔ آنحضرت کو ہدایت جاری کرنا پڑی تھیں کہ اگر کوئی شخص دوران تلاوت میں تھک جائے تو اسے تھوڑی دیر کے لئے رک جانا چاہئے۔ الفاظ کے اظہار اور تلفظ کے طرز آنحضرت کی احادیث کا بہت گہرا اثر پڑا۔ آپ کی تلاوت کو ترتیل کہا جاتا ہے جس کا مفہوم ہر لفظ کو اطمینان اور مقررہ زور کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ جب بچہ پہلے پہل ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بولنا سیکھتا تو آنحضرت ہدایت کرتے تھے کہ اسے بار بار لا الٰہ الا اللہ کہنا سکھانا چاہیئے۔

یہ فقرہ آواز کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی لے میں روانی ہے اور جس کا تلفظ بہت آسان آنحضرتؐ کو ترنم سے دلچسپی تھی، آپ کی متعدد احادیث ایسی ہیں جن سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ آپ نے کلام پاک کو خوش الحانی اور موزونیت سے پڑھنے پر زور دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے خدا نے آنحضرت کو کسی چیز کی اتنی تاکید نہیں کی ہے جتنی قرآن کی موزوں تلاوت کی "۱ جو شخص قرآن خوش الحانی سے نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے" ۲ قرآن کو اپنی آواز کے زیور سے آراستہ کرو پھر ارشاد ہوتا ہے "یقیناً خدا تلاوت قرآن کرنے والے کو زیادہ توجہ کے ساتھ سنتا ہے بمقابلہ اُس استاد کے جو گانے والی لڑکی کی موسیقی کو سنتا ہے" ۵

صحابہ کو تلاوت قرآن کے جمالیاتی پہلو کا پورا احساس تھا اور جب آنحضرتؐ انھیں کوئی ایک آیت پڑھ کر سناتے تو ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ اندر سے اتنی فرحت بخش تھی جتنا میٹھا اور باہر سے ٹھنڈا ہو۔

موزوں تلاوت کا ذوق و شوق بہت عام تھا اور ایک مرتبہ جب آنحضرتؐ نے ایک غلام کو خوش الحانی سے تلاوت کرتے ہوئے سنا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کی امت کو اتنا اچھا آدمی بخشا۔

---

۱ ملاحظہ ہو بخاری ۲ بخاری اور مسلم، ملاحظہ ہو احیاء، جلد اول صفحہ ۲۹۶ ۳ بخاری ۴ احیاء، صفحہ ۲۶۵ ۵ احیاء، جلد اول صفحہ ۲۸۵، ۶ صفحہ ۲۸۶

ابوموسیٰ اشعری اچھی خوش گلوئی کے لئے مشہور تھے اور آنحضرتؐ بعض اوقات ان کی تلاوت سے اس درجہ محظوظ ہوتے تھے کہ سب کچھ بھول جاتے تھے اور جب صاحبان مجلس بتاتے تھے کہ نماز کا وقت قریب آگیا ہے تو آپ پوچھتے تھے "کیا ہم اس وقت یاد الٰہی میں معروف نہیں ہیں؟" آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ ابوموسیٰ کو لحن داؤدی ملا ہوا ہے۔

مسلم معلمین تعلیم میں قرأت کی طرف کافی توجہ دیتے تھے اور ابن خلدون نے اپنے دیباچہ PROLOGOMENE میں اس مسئلہ کے ناقدانہ مطالعہ کے لئے ایک باب وقف کیا ہے ؎ اس عہد کے مختلف ممالک میں قرأت کی تعلیم کے طریقوں کا جو بصیرت افروز تجزیہ کیا گیا ہے اس سے تعلیمی اصولوں پر مکمل عبور اور مسائل کے ایک سائنسی اور غیر جانب دار مطالعہ کی صلاحیت کا انکشاف ہوتا ہے، یہی وہ صحت بخش اثرات تھے۔ جن کے تحت اسلامی اداروں نے زبانی اظہار (ORAL EXPRESSION کی ایک شاندار روایت قائم کی۔

بدقسمتی سے قوم کی موجودہ درس گاہوں نے خواہ وہ دیسی طرز کی ہوں یا مغربی تعلیم دے رہی ہوں اس فن کو کھو دیا ہے، اور وقت آگیا ہے کہ الفاظ کے ذریعہ شخصیت کے اسی بے تکلف اور پرمسرت اظہار کے طریقہ کو دوبارہ واپس لایا جائے جس کی معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے کسی بھی جمہوری سماج میں ہمیشہ ایک انوکھی اہمیت برقرار رہے گی اور جو ایک مکمل شخصیت کی تعمیر کے لئے ایک راستہ کھول دیتا ہے،

آنحضرتؐ اور آپ کے صحابیوں نے اپنی امت کو قرآن، احادیث اور اپنے خطبات کی شکل میں ایک بیش قیمت ورثہ بخشا ہے جن کا طرز بیان روحانیت سے پر، سادہ اور غیر مبہم ہے اور جو اخلاق کریم جوشی اور خود باقی اعتدال کی روشنی سے منور ہیں، موجودہ زمانہ کی درسی کتابوں کے مصنفین کو ان میں تلاش کرنے سے ایک ایسے ادب کا وافر سامان ہاتھ آئے گا جو زمانہ مابعد کے مغالطہ آمیز (SOPHISTICATED) ادب کے مقابلے میں بچے کے عنصری مجموعے (ELEMENTAL MAKE UP) سے قریب تر ہے

صدیوں سے مسلم بچہ اپنی مکتبی زندگی کا آغاز قرآن کے ایک پارہ سے کرتا ہے لیکن مسلمانوں کے دل میں جو قرآن کا احترام ہے، اس سے اکثر بچے کی مربوط تعلیم پر الٹا اثر پڑتا ہے، جب اس کی ابتدائی

؎ ابن خلدون (حصہ سوم باب ۳۲

تعلیم کے خاص مضمون کی حیثیت سے قرآن خصوصاً اس کے آخری پارہ کا انتخاب کیا جاتا ہے جو مشکل، اختصار، اور صراحت کا مجموعہ ہے، قاضی ابوبکر ابن عربی جیسے معلمین (EDUCATORS) نے معلمانہ بنیادوں پر اس رواج پر جرأت آمیز نکتہ چینی کی ہے اور تجویز کیا ہے کہ ان مضامین کو فوقیت دی جائے جو بچہ کی فطری دلچسپیوں کو براہِ راست اور پر زور طور پر اپیل کرتے ہیں، اور جو بچے کے لئے افادی نقطۂ نظر سے اعلیٰ تر قدر و قیمت رکھتے ہیں، انھوں نے قرآن کو تیسری منزل پر رکھا تھا، اس سے مقدم منزلیں مادری زبان اور ریاضی کی ہیں [1]

[1] ابن خلدون جلد سوم باب ۳۴

مریکہ میں جرائم اطفال

فضل احمد

جدید نفسیاتی تحقیقات نے جرم و تعزیر کے مفہوم میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا
ہ مہذب دنیا میں ہر جگہ قید خانوں کے پرانے تصور کو بیکار خیال کیا جانے لگا ہے۔ اب یہ ایک طے شدہ
قیقت ہے کہ بالکل جس طرح جسمانی بیماری کی صورت میں مریض کو پرہیز اور دوا کے علاوہ خوشگوار
ول کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے، بالکل اسی طرح ذہنی امراض کے مریضوں کو بھی ان چیزوں کی
رورت ہے، ہر مجرم درحقیقت ایک ذہنی مریض ہے جس کی ذہنی صحت کی بحالی کے لئے مناسب
ا دارو اور خوشگوار فضا ضروری ہے، اس سے انتقام لینے کے لئے اسے قید خانے میں ٹھونس
نا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی بخار کے مریض کو یہ کہہ دیا جائے کہ چونکہ تمہاری بیماری نے
ارے گھر کے کئی ایک لوگوں کو پریشان کیا ہے، اس لئے تمہیں ایک مہینہ کے لئے قید خانے
ں بھیجا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے اس کی بیماری تو کیا دور ہوگی صحت اور بھی بگڑے گی۔
ٹھیک اسی طرح ذہنی امراض کے بیماروں کو ایک مقررہ میعاد تک قید خانوں میں بند کرنے سے
ہنی صحت کی بجائے بدتر ذہنی فساد پیدا ہونے کے امکانات کہیں زیادہ ہیں۔ یہ انہی نفسیاتی
قائق کے احساس کا نتیجہ ہے کہ تعزیر کا مقصد اب انتقام کی بجائے اصلاح قرار پایا ہے۔

ان جدید نفسیاتی تصورات سے قطع نظر بچوں کے معاملہ میں قدیم ضابطہ تعزیرات بھی مختلف
انداز کار کا حامی تھا، وجہ بالکل ظاہر ہے۔ افراد کو ان کے اعمال کا ذمہ دار اسی صورت میں
ٹھہرایا جا سکتا ہے، جب وہ فہم و فراست سے کام لینے کے قابل ہوں اور چونکہ کم عمر بچے بالعموم

طرح پختہ ذہنی قویٰ کے مالک نہیں ہوتے ، اس لئے ان کے بارے میں جرائم کا مواخذہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا جس طرح بالغوں سے ۔ یہ اسی اصول کا صدقہ ہے کہ مختلف مذاہب نے نابالغ اشخاص کو اپنے احکام سے بری قرار دے رکھا ہے ۔ لیکن بلوغت کی حد عمر کے کس سال سے شروع ہوتی ہے ؟ اس سوال کا جواب ہمیشہ ایک نہیں رہا ۔ بلکہ مختلف اوقات اور مختلف ملکوں میں بدلتا رہا ہے ۔ مہذب دنیا میں اب بالعموم بلوغت کو ذمہ دار شہری حقوق کی بنا قرار دیا گیا ہے ۔ گویا بالغ ہونے کے بعد ہی حق رائے دہی مل سکتا ہے ۔ امریکہ میں یہ عمر ۲۱ سال قرار دی گئی ہے ۔

بلوغت کی اس قانونی حد بندی کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اس سے ہر کم عمر شہری کی تعلیم کا بندوبست کرے ، کیونکہ جب تک وہ پختہ فہم نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس کی موزوں تعلیم و تربیت ضروری ہے ۔ اور ایک ترقی یافتہ مہذب ریاست میں یہ فرض خواہ مخواہ ریاست کے ہی ذمہ عائد ہوتا ہے ۔ مگر سچ یہ ہے کہ امریکہ کا سا دولت مند اور ترقی یافتہ ملک بھی ابھی اس نصب العین کو نہیں پہونچا ۔ اگرچہ وہ اس کے بہت قریب پہونچ چکا ہے ۔

ہمارے ہاں نظری طور پر ابتدائی تعلیم لازمی ہے ۔ مگر عملاً ابھی آپ کو سینکڑوں ہزاروں ایسے بچے گلی کوچوں میں گھومتے نظر آئیں گے جنھیں قانوناً مدرسے میں ہونا چاہیئے تھا ۔ اگرچہ آزادی ملنے کے بعد ہم نے اس سمت میں کافی پیش قدمی کی ہے ۔ مگر گوناگوں سیاسی مشکلوں اور اقتصادی بے بسی نے پاؤں جکڑ رکھے ہیں اس لئے یہ پست نصب العین بھی ابھی کوسوں دور ہے ۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں ثانوی تعلیم لازمی اور مفت ہے ۔ اکثر ریاستوں میں لازمی تعلیم کی حد اٹھارہ برس کی عمر تک ہے ۔ اور بعض میں سولہ برس کی عمر تک ، گویا اس عمر تک ریاست کے ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے مدرسے میں جانا قانوناً لازمی ہے اور یہ قانون محض سرکاری جبر و دل بہت ہی محدود نہیں بلکہ اس پر اس طرح عمل کیا جاتا ہے کہ اوقات مدرسہ میں آپ کسی بازار یا تفریح گاہ میں نکل جائیے ۔ آپ کو مدرسے جانے کی عمر کا کوئی لڑکی یا لڑکا نظر نہیں آئے گا

تاوقتیکہ خود والدین نے کسی خاص وجہ سے اسے ایک آدھ دن کے لئے گھر پر نہ رکھ لیا ہو، مدعا
یہ ہے کہ والدین کی تحریری اجازت حاصل کئے بغیر مدرسہ بھی اس بات کا مجاز نہیں کہ بچوں کو مدرسے
سے باہر کہیں بھیجے، ہمارے ہاں اکثر اساتذہ طلبہ کو اپنے نجی کاموں کے لئے بازار میں یا مدرسے
سے باہر کسی اور جگہ بھیج دیتے ہیں، مگر امریکہ میں یہ بات ناممکن ہے۔ اس امر کی وضاحت کے لئے
ایک دو مثالیں غالباً دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

میں ڈیلاویئر یونیورسٹی کے ٹیچرز کالج میں نفسیات کی جماعت کو دیکھنے گیا۔ اس روز جماعت کو
۱۰ - ۱۱ سال کے بچوں کی ذہنی کیفیات کا عملی مشاہدہ کرنا تھا اور اس غرض سے مقامی اسکول کی
چوتھی جماعت سے کوئی ایک درجن طلبہ بلائے گئے تھے۔ طلبہ کے ساتھ ان کی معلمہ بھی آئی
اثنائے سخن میں اس نے پروفیسر سے معذرت کی کہ مطلوبہ تعداد سے ایک طالب علم کم ہونے کی
وجہ بڑی حد تک میری سستی ہے، مجھے چاہئے تھا کہ والدین کو ذرا پہلے اطلاع دیتی۔ میں نے
کل ہی خط لکھے، اس لئے ایک بچے کے والدین کی طرف سے بروقت اجازت نامہ نہیں پہونچ
سکا۔ اس لئے اسے ساتھ نہیں لا سکی۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ میں ایک روز نائی کی دوکان پر گیا، دوپہر کا
وقت تھا، اتنے میں ایک لڑکا بھی دکان میں آیا، اس کی عمر کوئی گیارہ برس کی ہوگی، نائی نے
بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہو میاں صاحب زادے اس وقت کس طرح
آنا ہوا! لڑکے نے کہا بال کٹوانے آیا ہوں، اس پر نائی بولا کہ یہ تو تمہارے مدرسے کا وقت ہے،
تم باہر کس طرح گھوم رہے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر کل ہمارا امتحان
شروع ہو رہا ہے اور آج تیاری کے لئے جلد چھٹی مل گئی۔ مگر اس جواب سے نائی کو اطمینان
نہ ہوا، اس نے لڑکے سے اس کا نام، جماعت اور اسکول پوچھا، پھر ٹیلیفون پر اسکول کے دفتر
سے اس کے بیان کی تصدیق کی تب کہیں وہ اس کے بال کاٹنے پر رضا مند ہوا۔

غرض امریکہ میں یہ اصول بڑی حد تک عملاً تسلیم کیا جا چکا ہے کہ بلوغت کو پہونچنے سے پہلے تک

تعلیم و راہ نمائی کی بیشتر ذمہ داری ریاست پر ہے اور اس زمانہ میں ہر قسم کی ذہنی و جسمانی کوتاہی کی اصلاح کا کام بھی اسی کے ذمہ ہے، چناں چہ ذہنی اصلاح کے لئے ہر ریاست میں "عدالت اطفال" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے جو ہر قسم کے نوعمر مجرموں کو عام عدالت کی بجائے اس خاص عدالت کے حوالے کیا جاتا ہے، یہاں عام عدالتوں کی طرح بیانات قلم بند نہیں ہوتے اور نہ وکیلوں کی جرح ہوتی ہے، بلکہ یہ عدالتیں تمام تر کوششیں اس امر پر صرف کرتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح نوعمر مجرم کی ذہنی صحت کو بحال کیا جائے، ان ذہنی محرکات کا کھوج لگایا جائے جنہوں نے اسے جرم پر ابھارا، اور ان کے ازالہ کی تدبیر کی جائے، غرض ان عدالتوں کا کام جرم کو ثابت کر کے سزا تجویز کرنا نہیں بلکہ تعلیمی کام سر انجام دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان عدالتوں کی کارروائی منظر عام پر نہیں آنے پاتی، ان کے اجلاس مکمل طور پر خفیہ ہوتے ہیں جن میں نمائندگان جرائد یا کسی اور شخص کی رسائی نہیں، ہاں عدالت خود ضروری واقفیت یا مواد جمع کرنے کے لیے کسی شخص کو طلب کرے تو یہ الگ بات ہے، اس رازداری کی وجہ بالکل صاف ہے، ان نوعمر اشخاص کو ابھی زندگی میں جگہ پیدا کرنا ہوتی ہے، اس لئے اگر اسی مرحلہ پر ان کا نام داغدار ہو جائے تو بقیہ زندگی بہت تلخ ہو جائے اور غالباً اصلاح کے امکانات بڑی حد تک ختم ہو جائیں، یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گو ہر مدرسہ اپنے ہر طالب علم کے متعلق ہر قسم کے ضروری کوائف جمع کرتا رہتا ہے اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد جب یہ طلبہ تلاش روزگار میں مختلف تجارتی یا صنعتی اداروں میں جاتے ہیں تو کارخانہ دار مدرسے سے ان لوگوں کے ریکارڈ طلب کرتے ہیں. مگر کیا مجال جو مدرسہ کسی کو یہ اطلاع دے کہ یہ طالب علم فلاں موقع پر فلاں جرم کے سلسلے میں عدالت اطفال میں بھیجا گیا تھا۔

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ مختلف ریاستوں میں لازمی تعلیم کے ختم ہونے کی عمر مختلف ہے مثلاً ریاست کنکٹی کٹ میں کوئی طالب علم سولہ برس سے پہلے مدرسہ نہیں چھوڑ سکتا، اس لئے سولہ برس کو پہونچنے تک کسی طالب علم سے خواہ کچھ بھی جرم صادر ہوا ہو، عدالت اطفال کے ہی حوالے کیا جائے گا، عام عدالتوں کے ججوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اٹھارہ برس تک کے

مجرموں کو بھی "عدالت اطفال" کے حوالے کر دیں۔

ملک کے تعلیمی طبقوں میں یہ خیال دن بدن زور پکڑ رہا ہے کہ "عدالت اطفال" کا دائرہ عمل اٹھارہ سال کی بجائے اکیس سال کی عمر تک بڑھا دینا چاہیے کیوں کہ جب ملکی قانون اکیس سال سے پہلے حق رائے دہی نہیں دیتا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عمر سے پہلے کسی شہری کو اس قدر بالغ النظر نہیں سمجھتا کہ وہ سیاسی زندگی میں موثر حصہ لینے کا اہل قرار دیا جا سکے تو اس قانون کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اکیس برس تک تعلیم لازمی ہو، چنانچہ غالباً ایک ریاست نے ثانوی تعلیم کا نصاب بارہ برس کی بجائے چودہ برس کر دیا ہے اور باقی ریاستوں میں بھی اس چیز کا مطالبہ ہونے لگا ہے ، اس وقت امریکی ثانوی مدرسوں کا نصاب بارھویں جماعت پر ختم ہو جاتا ہے (ہمارے ثانوی مدارس اپنا نصاب دسویں جماعت پر ختم کرتے ہیں) اب اس نصاب کو مزید دو سال کے لئے بڑھایا جا رہا ہے ، ملک کے کئی ... مقامات پر یہ دو جماعتیں جونیئر کالج کے نام سے بڑھائی گئی ہیں جونیئر کالج ایسے طلبہ کی تعلیم کا نقطۂ آخریں قرار دیا گیا ہے جو آگے کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے نہ جانا چاہیں ، تعلیم کے ان آخری دو سالوں میں تمام تر توجہ طلبہ کے فنی اور صنعتی رجحانوں کی ترقی اور پختگی پر صرف ہوگی۔

ان سطور کے مطالعہ سے شاید بعض قارئین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جس ملک میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا اہتمام اس توجہ اور ہمہ گیری سے ہو رہا ہو وہاں جرائم اطفال کا وجود ہی نہ ہونا چاہئے ، یہ خیال انسانی فطرت کے متعلق ضرورت سے زیادہ خوش فہمی کی بنا پر ہی پیدا ہو سکتا ہے کیوں کہ انسانی کمزوریاں معاشری زندگی کے بلند زینوں پر بھی بالکل اسی طرح کارفرما رہتی ہیں جس طرح نچلے زینوں پر۔ معاشری ترقی ان کمزوریوں کو رد کنے اور ان کی شدت کو کم کرنے کے لئے عمدہ اور سلجھے ہوئے انتظامات کر سکتی ہے ، ان کو جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتی ، چنانچہ امریکہ میں جرائم اطفال کا وجود بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی دوسرے ملک میں ، اور یہ اسی حقیقت کے احساس کا نتیجہ ہے کہ تعلیمی اور انتظامی اداروں نے باہمی تعاون و تعامل سے اس برائی کی

روک تھام اور اس کے مضر اثرات کو زیادہ سے زیادہ محدود کرنے کے لئے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ ہر مدرسہ اپنے طلبہ کے متعلق ہر قسم کے ضروری کوائف، وہ اس کی ذہنی، جذباتی اور بدنی صحت کی رفتار ترقی کا پورا نقشہ تیار کرتا ہے۔ اور اس کام میں ملک کے تمام ادارے اس کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔

امریکہ میں جرائم اطفال کی رفتار کیا ہے؟ اس وقت سارے ملک کے لئے اعداد و شمار پیش نظر نہیں البتہ ملک کی عام حالت کا کچھ اندازہ غالباً ایک ریاست پر نگاہ ڈالنے سے ہو سکے گا۔ کچھ دن ہوئے ریاست کنی ٹی کٹ کی عدالت اطفال کے ایک ذمہ دار افسر نے ایک گفتگو کے دوران میں بتایا کہ پچھلے سال اس عدالت نے کوئی پانچ ہزار طلبہ کی دست گیری کی۔ اس افسر کے بیان کے مطابق ہر سال اوسطاً ریاست کے تمام طلبہ کی تعداد کا کوئی ایک سے لے کر دو فی صد کا حصّہ اسی عدالت کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہ لینا چاہئے کہ یہ تمام طلبہ بہت سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جن قصوروں کے لئے ہمارے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحبان خود طلبہ کو بدنی سزا دے لیا کرتے ہیں، امریکہ میں ایسے قصوروں کی سزا خود مدرسہ نہیں دیتا بلکہ یہ معاملہ عدالت اطفال کو سونپ دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی طالب علم مدرسے کے کسی چھوٹے موٹے سامان کو توڑ دے تو اسے جرمانہ کرنے یا بدنی سزا دینے کی بجائے عدالت اطفال کے حوالے کیا جائے گا۔ تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ وہ کون سے نفسیاتی مؤثرات تھے جنہوں نے اس نوعمر شخص کو اس فعل پر ابھارا۔

عدالت اطفال مجرموں کے ذہنی فساد کا پتہ کرنے کے لئے جرائم کی نوعیت پر اس قدر زور نہیں دیتی جس قدر مجرموں کے معاشری پس منظر پر۔ جرم کی حیثیت محض علامت مرض کی سمجھی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی طبیب محض علامتوں کو دیکھ کر نسخہ تجویز نہیں کرے گا بلکہ ان اسباب کا کھوج لگائے گا جن کی بنا پر یہ ظاہری علامتیں پیدا ہوئیں۔ اس نکتہ کی مزید شرح غالباً مثالوں سے ہو سکے گی "عدالت اطفال" کنی ٹی کٹ میں دو طالب علم پیش کئے گئے، ایک نے ایک موٹر کار

[ک]رائی تھی اور دوسرے نے مدرسے کی کھڑکی کے دو شیشے توڑ دیئے تھے، بادی النظر میں پہلے لڑکے کا
[قص]ور بہت سنگین تھا مگر معاشری پس منظر کا کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ ذہنی فساد کے اعتبار سے دوسرا
[لڑ]کا زیادہ خطرناک ذہنی مرض کا شکار ہے، اس کا باپ شرابی تھا اور ماں ایک بدکار عورت۔ گویا اس کی
[تر]بیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں محبت، اعتماد، سکون اور مثبت ضبط کا گذر نہ تھا، یہ تمام
منفی مؤثرات اس کی ذہنی ساخت کا جزو بن چکے تھے، اگرچہ بظاہر اس کا قصور بہت معمولی تھا مگر
یہ ایک ایسے ذہنی خلجان کا پتہ دیتا تھا جو وقت پا کر بہت خطرناک نتائج کا موجب ہو سکتا تھا۔
اس کے مقابلے میں پہلے لڑکے کا قصور گو بظاہر زیادہ سنگین تھا مگر معاشری پس منظر کی روشنی میں یہ
جرم فی الحقیقت اس قدر سنگین نہ تھا، یہ لڑکا ایک اچھے پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کی
تربیت خاصے سلجھے ہوئے ماحول میں ہوئی تھی، مدرسے میں اس کا ریکارڈ بہت تسلی بخش تھا، وہ مجلس طلبہ کا
ایک نمایاں رکن تھا، مدرسے کی علمی ادبی اور غیر نصابی کارروائیوں میں اس نے ہمیشہ حصّہ لیا
تھا، اور چوری کا فوری سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کار غیر مقفل پڑی تھی اور وہ ذہنی اکساہٹ پر
قابو نہ پا سکا، اس تجزیہ کی روشنی میں ظاہر تھا کہ اس طالب علم کی ذہنی صحت کی بحالی کے لئے کوئی
لمبا چوڑا عقن درکار نہیں تھا، جبکہ اس کے ساتھی کے ذہنی فساد کا علاج بہت لمبے اور ماہر معالج
کا محتاج تھا۔

عدالت اطفال کا کام صرف ذہنی مرض کی تشخیص ہے، اس کے بعد اگلا قدم علاج کا ہے یہ
کام "سرکاری گھروں" میں ماہرینِ نفسیات کی زیرِ ہدایت انجام پاتا ہے، جرائم کی پاداش میں
طلبہ کو قید خانوں میں نہیں بلکہ "سرکاری گھروں" میں بھیجا جاتا ہے۔ عرصہ قیام کا فیصلہ ماہرینِ
نفسیات کی رائے پر موقوف ہوتا ہے، ان "سرکاری گھروں" میں تمام تر توجہ موزوں صحت بخش اور
قدرتی ماحول پیدا کرنے پر صرف کی جاتی ہے، تاکہ مضر معاشری ماحول سے پیدا شدہ ذہنی ساخت
رفتہ رفتہ بدل جائے اور آئندہ فکر و نظر میں مطلوبہ تبدیلی پیدا ہو جائے، اس وقت ریاست کنی ٹی کٹ کے
سرکاری گھروں میں کوئی پانچ ہزار ذہنی مریض ہیں، کوئی اڑھائی ہزار ایسے مریض مذہبی اداروں کی

تحویل میں ہیں، اس کے علاوہ ۰۰۰،۲۷ ضعیف العقل نوجوان سرکاری اداروں میں موجود ہیں۔

جرائم کی نوعیت کا ذکر کرتے ہوئے سرکاری ترجمان نے بتایا کہ اس فہرست میں پہلا نمبر چوری کا
ہے، دوسرا اشیاء کی توڑ پھوڑ اور لڑنے جھگڑنے کا، تیسرا شراب خوری کا، چوتھا جنسی جرائم کا اور ا
بعد متفرق جرائم کا مذکورہ تناسب جرائم یوں ہے کہ ہر لڑکی کے مقابلے میں کوئی پانچ لڑکے جرم
ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکے زیادہ مجرم طبع واقع ہو
ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اول تو لڑکیوں کے معاملے میں شبہ کرتے وقت بہت زیادہ احتیاط ر
کام لیا جاتا ہے، دوسرے یہ کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ عام مشاہدہ کی نگاہ سے اوجھل رہتا ہے
سرکاری ترجمان نے بتایا کہ لڑکیوں کے معاملے میں عدالت اطفال کو بہت زیادہ دقت کا سامنا
کرنا پڑتا ہے، ان کے معاشرتی پس منظر کا صحیح کھوج لگانے اور ان کے ذہنی الجھاؤ کو بدلنے کے
معاملے میں لڑکوں کی نسبت زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔

چوری کے بارے میں یہ امر دلچسپ ہے کہ جہاں لڑکے ہر اس چیز کو چرا لیتے ہیں جو
ہاتھ لگ جائے، خواہ وہ کام کی ہو یا نہ ہو، وہاں لڑکیاں صرف وہی چیزیں چراتی ہیں جو ان کے
مطلب کی ہوں۔ مثلاً زیورات، لباس، جوتے، سنگار کا سامان وغیرہ۔ امریکہ کی ہمہ فروش دکانیں
اب اس معاملے میں زیادہ محتاط ہو گئی ہیں، اور ہر دکان میں کچھ اشخاص صرف اس کام پہ مامور
ہوتے ہیں کہ خریداروں پر نگاہ رکھیں، چوں کہ دکان کے اندر کسی سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا
اس لئے چور اطمینان سے اپنا تھیلا بھرتا چلا جاتا ہے، مگر جوں ہی دروازہ سے قدم باہر رکھا
دکان کے کسی ملازم نے آ کر دامن پکڑا اور بی صاحبہ دھر لی گئیں۔

آخر میں جرائم اطفال کے اسباب پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا، یہ ماننا
پڑے گا کہ نفس کی اکساہٹ اکثر اوقات اچھے بھلے متوازن مزاج لوگوں کو بھی بہکا دیا کرتی ہے
اس طرح نوعمروں کا اس کے مقابلے میں بے بس ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ مگر اس کے علاوہ
اس وقت امریکی معاشرتی زندگی میں بعض ایسے عوامل کارفرما ہیں جو براہ راست بہت سے جرائم کے لئے

ار میں معاشری زندگی اس وقت جس انقلاب میں سے گذر رہی ہے ، اس کی مثال امریکی تاریخ میں
ملتی گذشتہ چند دہائیوں کی سائنسی اور ٹکنولوجیکل ترقیوں نے معاشی اور انتظامی زندگی کی کایا
، دی ہے ، اب تک امریکی اجتماعی زندگی کی ساری عمارت آدم اسمتھ کے معاشی فلسفہ انفرادیت
ری تھی ، اب یکایک یہ بنیاد غائب ہے ، اس انقلاب نے زندگی کی بہت سی روایتی اقدار کو
زلزل کر دیا ہے ۔ کنبے اور مذہب کے بندھن جنہوں نے اجتماعی زندگی کے مختلف ٹکڑوں کو جکڑ
اتحاد و فعت ڈھیلے پڑ گئے ہیں اور ان کی قوت ماسکہ دن بدن ختم ہوتی جا رہی ، اس انقلاب کا
ے بدیہی اثر یہ ہوا ہے کہ اکثر بچوں کو نشو و نما کے زمانہ بہار میں وہ ساز گار فضا میسر نہیں آتی
حت مند تخلیق کردار کی جان ہے ۔ انہیں گھر پر جذباتی اور مادی سلامتی نصیب نہیں ہوتی اور نہ . . .
ت ضبط کا کوئی نشان نظر آتا ہے ، اس کا قدرتی نتیجہ مفلوج اور بگڑی ہوئی ذہنی ساخت کی شکل
ں سامنے آتا ہے ۔

بعض امریکی مفکرین یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ معاشری برائیوں کی اصل جڑ ہماری مادیت پرست
فی تہذیب ہے جس کے دامن میں کوئی مثبت روحانی اقدار موجود نہیں ، ان کا خیال ہے ۔ کہ
ب تک یہ تہذیب ایمان و یقین کے حیات بخش عناصر کو اپنے اندر جذب نہیں کرے گی اس وقت
ے اس کی معاشری الجھنوں کا خاتمہ نہ ہوگا ، اگرچہ اس بارے میں دوسروں کے لئے کچھ رائے زنی
رنا مشکل ہے تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پچھلی چند دہائیوں میں امریکہ نے ٹکنالوجی اور
سائنس کے میدان میں جو انقلاب انگیز پیش قدمی کی ہے ۔ معاشری فکر اس کا ساتھ دینے سے
قاصر رہا ہے ، تاہم یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں کہ ملک اس فکر کی صلاحیت سے بھی عاری ہے
دنیا کی تاریخ میں کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ دوسرے گوشوں کو بہت پیچھے
چھوڑ گیا لیکن جہاں کسی قوم کو اپنی اجتماعی زندگی کی اس غیر متوازن حالت کا احساس ہو رہا ہے
یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ زود یا بدیر دوسرے گوشوں کو آگے دھکیلنے کی راہیں بھی پیدا کر لی
جائیں گا ۔

عربی زبان کی تعلیم پر تمہیدی بحث

عبدالرحمٰن طاہر (سورتی)

ہر غیر ملکی زبان کو سکھانے کے لئے "نصابِ تعلیم" بنانے سے قبل چند اہم تمہیدی مراحل ہیں جن کو سنجیدگی سے طے کر لینے کے بعد ہم کامل نصابِ تعلیم بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، یوں تو ہر غیر ملکی زبان کو مسلسل محنتوں اور پیہم کوششوں کے بعد طویل مدت میں سیکھ ہی لیا جاتا ہے۔ مگر قدیم و جدید طریقوں میں یقیناً کچھ آسان طریقے بھی ہیں جن سے دوسروں کے بہ نسبت زیادہ جلد زبان سیکھی جا سکتی ہے، ذیل میں ہم مذکورہ بالا تمہیدی مسائل کو درج کرتے ہیں اور پھر ان پر بالترتیب سرسری بحث کریں گے۔

١- زبان سیکھنے کا مقصد۔

٢- زبان کا اوسط معیار

٣- طالب علم کی استعداد

٤- زبان کا مزاج

٥- طریقۂ تعلیم

١- زبان سیکھنے کا مقصد کوئی زبان کس غرض کے تحت سیکھی جا رہی ہے، اس کا علم کورس بنانے میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے جس سے کورس تیار کرنے غیر ضروری بحثوں، غیر مفید قاعدوں، لاطائل قصوں سے بچتا ہوا۔ یکسوئی سے اس مقصد تک پہونچنے کی کوشش کر سکتا ہے جو اس زبان کو سیکھنے کا اولین مقصد ہے۔

٢- زبان کا اوسط معیار ہر زندہ زبان ایک بحرِ بے پایاں سے مشابہ ہے اور جس میں ایک طالب علم

یا ئے زبان میں غوطہ زنی سے قبل کم از کم اس قدر استعداد ضرور پیدا کر دینی چاہیئے جس کے
یعہ اس میں خود اعتمادی کے ساتھ اس بحرِ ذخار کی موجوں سے مقابلہ کی تاب کے علاوہ بے باکانہ
رنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے / زبان میں اس قسم کی صلاحیت پیدا کرانے والی قوت کا نام
م زبان کا "اوسط معیار" رکھتے ہیں۔ اس اوسط معیار کے کورس کی ابتدا ضروری الفاظ و قواعد کی
شق سے ہوگی، اور انتہا اس زبان کی ایسی ڈکشنری سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پر ہوگی
جس میں الفاظ کی شرح اسی زبان میں کی گئی ہو۔

۳۔ طالب علم کی استعداد کسی غیر ملکی زبان کا کورس بنانے میں ہم کو اس زبان کے سیکھنے والے طالب علم کی علمی استعداد کا خیال رکھنا از حد ضروری اور مفید ثابت ہوگا، اور اس کورس میں جو کہ مادری زبان سے بخوبی واقف طالب علم کے لئے تیار کیا جائے، اس کورس سے بہت بڑا فرق ہونا چاہیئے جو مادری زبان سے ناواقف طالب علم کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ عموماً غیر ملکی زبان وہی طلبہ سیکھتے ہیں جو مادری زبان سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، لہٰذا ایک کامل کورس وہی ہو سکتا ہے جس میں طالب علم کی صلاحیت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

۴۔ زبان کا مزاج کسی زبان کے مزاج سے ہماری مراد اس زبان کے وہ ممتاز و مخصوص اصول اور ایسے بنیادی قواعد و ضوابط ہیں جن کو سمجھ لینے سے طالب علم زبان کے اجزائے ترکیبی سے مانوس ہو کر اس کو آسان سمجھنے اور اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے، ہر زبان کا اپنا ایک مزاج علیحدہ ہوتا ہے جس کو پہچاننا بلاشبہ وقت طلب امر ہے، اور وہی اسے پہچان سکتا ہے، جو اس زبان کے اصول و مبادی سے پوری طرح واقفیت۔ لغت میں درک، ادب پر وسیع نظر اور پڑھنے لکھنے بولنے میں قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ زبان کو آسان طریقہ سے سکھانے کی کوشش بھی کر چکا ہو۔ اور زبان کے نشیب و فراز سے مطلع ہونے کے لئے فکر کے ساتھ کوشاں رہا ہو
زبان کے مزاجوں کو دیکھتے ہوئے ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک طریقہ جو عربی زبان کو آسانی سے سکھانے کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ وہی اگر انگریزی سکھانے کے لئے استعمال کیا جائے گا

قواعد بھی مشکل تر ہو جائے گی۔

۵۔ طریقۂ تعلیم: مندرجہ بالا امور کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ سب سے آسان اور سیدھا طریقۂ تعلیم وہی ہوگا جو طالب علم کی استعداد اور زبان کا مزاج مدنظر رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے گا۔

دماغ پر کم سے کم زور ڈال کر زیادہ سے زیادہ الفاظ کی مشق کرانا۔ طالب علم کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا، غیر ضروری قواعد سے گریز، غیر مانوس و ثقیل اصطلاحات سے اعراض، الفاظ کی جملوں میں مشق کے ساتھ ضروری صرف و نحو کے مسائل کی آمیزش۔ رٹائی سے اجتناب، یک وقت ضرورت سے زائد الفاظ یا قواعد کی بھرمار نہ کرنا، اسباق میں قواعد کی ترتیب اور تدریجی ارتقا کی رعایت یہ سب وہ ضروری امور ہیں جن کی رعایت ایک کورس کو کامیاب بنانے کی ضامن ہے۔ غیر ملکی زبان کو ملکی مروجہ زبان کی طرح پڑھانا ممکن ضرور ہے لیکن خرابی بسیار کے بعد۔ لہٰذا میں ابتدائی مراحل مادری زبان کے واسطے سے ہی طے کرانے چاہئیں کیوں کہ یہی آسان اور مناسب طریقہ ہے۔

ان سب کے علاوہ طریقۂ تعلیم میں ایک بہت بڑا عامل خود استاد ہے جو اپنی صلاحیت و قابلیت اور محنت و دیانت سے طالب علم کو آگے بڑھانے میں بہت زیادہ ممد و معاون ہوتا ہے، وہ اپنی تجربہ کاری اور مہارت سے کام لے کر طالب علم کو سنگلاخ راہ سے بھی اس طرح گذار سکتا ہے کہ طالب علم کو دشواری راہ کا احساس بھی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان کو دلچسپ بنانے میں استاد کا بڑا دخل ہے۔

یہاں اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی ایسا ابتدائی کورس جو کسی ملک میں اسی دیس کی ملکی زبان سکھانے کے لئے رائج ہو، غیر ملک میں اس زبان کو سکھانے کے لئے بھی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا، اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے غیر ملکی زبان کو مشکل تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔

عربی زبان

ہم آگے مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں پاکستانی مسلمانوں کے لئے عربی زبان کے مسئلہ پر بحث کریں گے۔

مسلمانوں میں عربی زبان سیکھنے کا سب سے قوی داعیہ اس کی دینی اہمیت ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اس کے رب کا فرمان، قرآن مجید، نیز احادیث رسول اکرمؐ جو قرآن مجید کی حکیمانہ شرح ہیں عربی زبان میں ہیں، اور دن میں پانچ وقت کی نمازوں میں تمام عبارتیں اور دعائیں عربی میں ادا کرنی پڑتی ہیں اور دانشمندی کا یہی تقاضا ہے کہ کسی عبارت کو عمر بھر تک بغیر سمجھے سوچے نہ پڑھا جائے۔

دوسرا داعیہ وہ علوم عربیہ ہیں جن کو مسلمان اپنے اسلاف کا بے بہا سرمایہ اور گراں قدر میراث خیال کرتے ہیں، نیز اس کا مطالعہ قرآن مجید و احادیث کے فہم میں ممد و معاون اور اپنے جذبۂ دینی کو بیدار و متحرک کرنے میں معاون جانتے ہیں۔

تیسرا جاذبہ اس زبان کی بین الاسلامی اہمیت ہے، جو کہ اس زبان کو قرآن مجید، احادیث نبویہ، فقہ اور تاریخ اسلام کے حامل ہونے کی وجہ سے از خود حاصل ہو گئی، یہ فضل خداوندی کے تحت تمام عالم اسلامی کی ایک مشترکہ زبان بن چکی ہے۔

ان تین عام اسباب کے علاوہ کچھ اور بھی ذیلی اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً عربی ممالک سے کاروبار اور وہاں اپنا پروپیگنڈہ وغیرہ۔

جہاں تک عربی زبان کے مزاج کا تعلق ہے میرے خیال میں وہ نہایت سادہ اور سیدھا ہے۔ اس کی نحو کا بڑا حصہ تین حرکات (زبر۔ زیر۔ پیش تنوین) اور ایک جزم کے مقام کو معلوم کرنے پر مشتمل ہے اور صرف کا حصہ مادہ اور اس کے مشتقات پر، دراصل وہ مادہ اور اس سے مشتقات ہی عربی زبان کی ایک ایسی ممتاز لچک ہے جس کے ذریعہ بغیر رٹائی کے طالب علم کو وسیع النظر اور سیکڑوں الفاظ ہی نہیں بلکہ ان کے معنوں کا بھی مالک بنایا جا سکتا ہے، عربی صرف میں تعلیل کا کٹھن مرحلہ

بھی اس کے طفیل بڑی خوشگواری سے طے کیا جا سکتا ہے، اور چوں کہ عربی کی تمام معتمد علیہ ڈکشنریاں مادہ کی ترتیب سے مرتب ہوتی ہیں لہٰذا اسی کے ذریعہ ہم طالب علم کے وسط معیار یعنی عربی سے عربی کی ڈکشنری کے مطالعہ کی قابلیت بھی پیدا کرا سکتے ہیں، ضروری قواعد کی مشق نیز مادہ اور اس سے مشتقات کے خواص بتا کر ہی ہم طالب علم کو عربی زبان کی ہر کتاب بغیر کسی لسانی دشواری کے پڑھنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔

جہاں تک طریق تعلیم کا تعلق ہے، ہمیں عربی زبان کے مزاج، مادہ کی لچک دار طالب علم کی استعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک مناسب کورس مرتب کرنا چاہیے جس میں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔ اساتذہ ٹرینڈ ہوں اور زیادہ بہتر ہو کہ تعلیمیافتہ عربوں کی صحبت میں رہے ہوں۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا عموماً غیر ملکی زبان وہی لوگ سیکھتے ہیں جو مادری زبان سے واقف ہوتے ہیں، لہٰذا ننھے بچوں، گونگوں اور بہروں کے لیے مستعمل ڈائرکٹ میتھڈ ..... قطعاً نامناسب ہوگا، ایسے طلبہ کے لیے جو کورس بنے گا اس میں طبعاً ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا پڑے گا جو کہ مادری زبان جاننے والوں سے امید کی جاتی ہے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ عربی زبان نہیں آئے گی بلکہ وقت کی تضییع اور خام علمی صلاحیت پیدا ہوگی جس کے نمونے ہم نام نہاد ڈائرکٹ میتھڈ سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔

ہمارے موجودہ کورسوں کی بہت سی خامیوں میں سے چند اصولی خامیاں یہ ہیں کہ ان میں مقصد کا تعین نہیں جس کی وجہ سے کورس لامتناہی سلسلہ بن جاتا ہے اور برسوں اس کے چکر میں پھنس جانے کے بعد بھی قرآن مجید و احادیث رسول کی زبان سے بیگانگی رہتی ہے، زبان کا مزاج نہ سمجھنے کی بنا پر ہمیشہ زبان کو مشکل ہی سمجھا جاتا ہے اور برسوں کی تعلیم کے بعد بھی لغت کی کتابوں سے استفادہ کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، طریقہ تعلیم میں اعتدال نہیں، ایک طرف فن قواعد صرف و نحو پر دارو مدار ہے تو دوسری طرف محض الفاظ کی مشق ہے اور قواعد سے یکسر انحراف، ایک طرف ہمیشہ ہمیشہ مادری زبان کو واسطہ بنایا جاتا ہے تو دوسری طرف سرے سے مادری

زبان کا واسطہ اڑانے کی کوشش ہے۔

اس خود رائی، جدت طرازی اور ترقی پسندی کے دور میں اگر واقعتہً مسلمانوں کو عربی زبان کا مکمل آسان اور مقصد تک پہونچانے والا کورس درکار ہے تو اس کے لئے میرے ذہن میں صرف ایک ہی فیصلہ کن تجویز ہے علاوہ یہ کہ موجودہ و قدیم کورسوں میں جو کامیاب ترین کورس ہیں ان کو سامنے رکھ کر علماء (دین و لغت) کی کمیٹی ایک جدید نصاب ترتیب دے۔ علمائے لغت میں سے وہی لوگ کمیٹی میں شریک کئے جائیں جنھوں نے عربی کو آسان کرنے کی کوشش قلمبند کی ہو اور علمائے دین میں سے کمیٹی میں وہی علماء شامل کئے جائیں جو عربی زبان و ادب سے بھی دلچسپی رکھتے ہوں، یہ کمیٹی مقصد کے تحت مکمل کورس مرتب کر کے مسلمانوں کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دے گی کیونکہ بلاشبہ مسلمانوں کو مسلمان بنانے اور ان کے جھگڑے چکانے کا یہی ایک معقول طریقہ ہے کہ عوام قرآن مجید و احادیث کی روشنی سے براہ راست مستفید ہوں۔ والحمد للہ رب العلمین۔

قسط نمبر ۴

عراق میں لازمی تعلیم

محمد عبد العزیز

قومی تعلیمی کونسل کا قیام

سنہ ۱۹۴۶ء کی تعلیمی کمیٹی نے حکومت کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وزارت معارف کی تعلیمی پالیسی کو مربوط اور مضبوط بنانے کے لئے قومی تعلیمی کونسل کا قیام ضروری ہے جو ناظم تعلیمات، اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نگراں، دوسری وزارتوں کے نمائندوں، پارلیمان کے مندوبین نیز ملک کی دوسری معروف شخصیتوں پر مشتمل ہو۔ اس کونسل میں دوسری وزارتوں کے نمائندوں کی شمولیت کی یوں اور بھی ضرورت ہے کہ ان سب کے تعاون اور اشتراک سے ہی اس تعلیمی مہم کو سر کیا جا سکتا ہے۔ اس کونسل کا اہم فرض نظام تعلیم کو استوار بنیادوں پر قائم کرنا اور اسے مربوط اور ہم آہنگ بنانا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ قومی تعلیمی کونسل ایک ایسا ادارہ ہوگی جو تعلیمی نظام میں اشتراک و تعاون کی ضامن ہوگی اور وزیر معارف کی انفرادی یا سیاسی خواہش ... اسے جھٹکا دے کر نہیں توڑ سکے گی۔ عراق میں اب تک کسی ایسی قومی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں نہیں آسکا جس کے سامنے ایک متعین نصب العین ہو۔ اس قسم کے ادارے اکثر قائم ہوئے اور ختم ہو گئے ان اداروں کی ناکامیابی کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بالعموم وزیر معارف عوامی رجحانات کا ساتھ دیتا ہے اور ماہرین تعلیم کی رائے پر عمل کرنے سے عموماً گریز کرتا ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جس کی بیشتر آبادی جاہل ہے، جو ملک کے سیاسی اور تعلیمی امور میں زیادہ حصہ نہیں لے سکتی، اس کے متعلق اس قسم کی رائے قائم کر لینا دانش مندی نہیں۔

بہر صورت اس وقت تو ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا وزارت کا پہلا فرض ہے۔ اگرچہ

ں فرض کو پیدا کرنے کا احساس مدت سے ملایا جا رہا ہے۔ مگر اب تک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔
یمی تقاضوں کو پیدا کرنے کے لئے ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جو وزارت معارف کو پورے تعلیمی
ختیارات دے سکے، اس قانون میں ایک متوازن قومی تعلیمی کونسل کے قیام کی سبیل کی جائے، یہ کونسل
سب موقع اپنے اجلاس کرتی رہے، اور اس کے اختیارات متعین ہوں، یہ تعلیمی کونسل اس وقت
پنے احاطۂ اثرات کو وسیع کر سکتی ہے جب مدیر معارف کے لیے تعلیمی نظام میں کسی اہم تبدیلی کے پیش نظر
ونسل سے مشورہ لینا لازمی قرار دے دیا جائے، اور فیصلہ کونسل کے ارکان کی اکثریت کے ہاتھوں
یں ہو، اور تعلیمی ترقی کی مختلف اسکیموں کو منظر عام پر لانے سے پہلے کونسل سے منظوری لینا ضروری
ہو، اور اگر کونسل کسی تعلیمی مسئلے پر بحث اور مشورہ ضروری سمجھتی ہو تو اسے یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وزیر معارف
ی دعوت کا انتظار کئے بغیر خود ہی اس قسم کا ایک اجلاس بلا کر مسئلہ زیر بحث کو سلجھانے کی سعی کرے۔
اب اس قسم کے مشاورتی ادارے کے قیام کا وقت آگیا ہے، جو لوگ تعلیمی توسیع و ترقی کے ذمہ دار
یں اور جن کے ہاتھوں میں عنانِ اقتدار ہے، وہ سب اسے شدت سے محسوس کر رہے ہیں
وزارتِ معارف کے ایک تعلیمی اجتماع میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ میں نے ان سب کی گفتگو اور
ان کے اندازِ کار سے یہ نتیجہ نکالا کہ اب ماہرینِ تعلیم کے مشوروں کو قبول کرنے اور ان کی تجویزوں کو
منظور کرنے کا وقت دور نہیں ہے اور اگر مستقبل قریب ہی میں ایک ایسی کونسل کا قیام عمل میں آگیا۔ تو
عراق اپنی بہت سی تعلیمی خامیوں کو دور کرے گا۔

تعلیمی نظام کے اہم پہلو

اگر وزیر معارف کی رہنمائی اور مشورے کے لئے ایسی کونسل قائم ہو جاتی ہے تو ایک قومی پالیسی کا انصرام ممکن ہو جائے گا، بہرصورت اس سے پہلے کہ یہ اصلاحات بروئے کار آسکیں، وزارت معارف کے موجودہ تصور میں تھوڑی سی تبدیلی ضروری ہے، اس وقت وزارت معارف تو محض ایک قومی تعلیمی ادارہ ہے تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام کار کی ترتیب و تدوین اس کے احاطۂ کار میں شامل نہیں ہے، محکمے کے بیشتر حکام بعض ایسے فروعی اور معمولی

انتظامی تفصیلات کے اس چکر میں کسی تعلیمی منصوبہ بندی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ابتدائی مدارس اور ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ انتظامی کام جو مرکزی وزارتِ معارف کے حکام انجام دیتے ہیں، انھیں صوبائی ناظمین تعلیم کے سپرد کردیا جائے ابتدائی تعلیم علاقائی ہوتی ہے، مرکزی نہیں، اگر ان امور کو صوبوں کے سپرد کردیا گیا تو مرکزی عملے کو تعلیمی پالیسی مرتب کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے اور وہ اپنی قوتوں اور اپنی صلاحیتوں کو اچھے اور مفید کاموں میں صرف کرسکتے ہیں، اگر ابتدائی تعلیم کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا محض سوچنے کا کام نہیں بلکہ حقیقت ہے تو تعلیم کی اس مرکزیت کو ختم کرنا ضروری ہوگا، اور تعلیم کو اس انتشار سے بچا کر کسی سوچے سمجھے راستے پر ڈالنا ہوگا، اگر وزارت معارف کے حکام وزیر معارف کو اچھے مشورے دینے کا موقع پاسکیں۔ قومی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آجائے، ابتدائی تعلیم کو مقامی تعلیمی نظامت کے سپرد کردیا جائے تو عراق کا تعلیمی افق روشن اور تابندہ ہوسکتا ہے۔

زراعتی اور دیہاتی تعلیم کے متعلق بھی بہت کچھ سوچنا اور وسائل کا جائزہ لینا ہے، آگے چل کر ابتدائی لازمی تعلیم کے متعلق بھی ایک لائحہ عمل مرتب کرنا نہایت ضروری ہوگا، اور یہ اہم کام اس وقت تک انجام نہیں پاسکتے، جب تک وزارت معارف اپنے دور ازکار فرائض سے نجات نہیں پا جاتی۔

مقامی تعلیمی حکومت

عراق میں اس وقت تعلیم عوامی حلقوں میں مقبول ہو رہی ہے اور اس کی مانگ اس قدر بڑھتی جارہی ہے کہ موجودہ حالات میں حکومت اس قومی تقاضے کو پورا نہیں کرسکتی، لیکن تعلیمی توسیع کی تحریک لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور وہ اس کے قیام و انصرام کے لئے دامے درمے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں چنانچہ وزارت معارف اور اس کے ذرائع سے قطع نظر مقامی آبادیاں اپنے علاقوں میں ابتدائی تعلیم کا بندوبست کرسکتی ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ تکمیل کار کا جذبہ بھی ان لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے، اور ہر علاقے میں ایسے وسائل و ذرائع بھی ہیں کہ اگر انہیں کام میں لایا جائے تو

دہ ہوسکتی ہے ۔ ۱۹۴۵ء میں صوبائی انتظامی قانون منظور ہوا اور اس کی رو سے صوبائی کونسل
س کونسل کو کسی حد تک اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محصولات کے حصول کا حق
یا تعلیم بھی شامل ہے لیکن تعلیمی ترویج کے لئے اب تک لوگوں سے اس قسم کا محصول کم
یا ہے ۔ اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کونسل کے ہر صوبے کو مزید اختیارات دے
ں کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق محصولات لگا سکے ، اور اپنے نظام کو معیاری اور قابل قدر
س میں تعلیم اور بالخصوص ابتدائی تعلیمی نظام بھی شامل ہے ۔ توقع کی جاتی ہے کہ جب اس
تیارات میں اضافہ ہو جائے گا تو مقامی تعلیم کی یہ زبوں حالی بھی کسی حد تک ختم ہو جائے گی
ی و توسیع کے مناسب مواقع ہی نہیں ملیں گے بلکہ لوگوں کے مفاد اور مقامی تقاضوں
نے کی کوشش کی جائے گی ، اگر مقامی آبادی کو ان کی اپنی تعلیم اور نظام میں دخل دینے اور
بھی مرتب کرنے کا حق دے دیا جائے تو اس روکھے پھیکے نظام میں جان سی پڑ جائے
کو چاہیے کہ وہ اپنے اراکین میں سے ایک صوبائی تعلیمی انجمن قائم کرے جو ابتدائی تعلیم
اور اس کے جملہ انتظامات کی ذمہ دار ہوں ، اس سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی یہ توقع
سکتی ہے ۔

قامی آبادی کو اپنے تعلیمی نظام کار کو خود چلانے کا حق اور اختیار دے دیا گیا تو لوگوں میں
پی اور بڑھ جائے گی ، دلوں میں تعلیم کو فروغ دینے کا جذبہ پیدا ہو جائے گا ۔ اور
داد کے علاوہ محصول اور تعلیمی سیس کے ذریعہ تعلیمی ترویج کے لیے زر کثیر جمع کیا جا سکتا ہے ۔
مقامی تعلیمی ضروریات کو پورا کیا جا سکتا ہے ، اور آگے چل کر یہی تعلیمی حکومتیں لازمی ابتدائی
یہ بن سکتی ہیں ۔ لازمی ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے مقامی تعلیمی حکومتوں کا قیام اور
ستحکام نہایت ضروری ہے ، ورنہ کسی مرکزی نظام کے ماتحت اس مقصد میں کامیابی
ممکن نہیں ۔ موجودہ بڑھتی ہوئی ضروریات اور مقامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مقامی
مفید مطلب ثابت ہو سکتے ہیں ، اس لئے مقامی وسائل سے استفادہ کرنا اور انہیں اپنی

ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بنانا مناسب اور موزوں ہے لیکن ماہرین تعلیم کے بعض حلقے اس طریق کار سے متفق نہیں ہیں، ان کے خیال میں یہ تعلیمی تقسیم موجودہ نظام کو درہم برہم کر دے گی اور ایک نئے نظام کی تعمیر و تشکیل کے لیے نئے طریقوں اور نئی راہوں کی ضرورت ہوگی، ان خطرات کے حق و مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر جمہوری ملکوں میں چھوٹی سے چھوٹی انجمن اور ننھے ننھے جغرافیائی حصے اپنی علاقائی ضروریات کے پیش نظر اپنی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کا حق ہوتا ہے، اس طرح ہر شخص کو کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے، دوسروں کی بڑھتی ہوئی رفتار کو دیکھ کر اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور زندگی جامد منجمد اور معطل نہیں۔ مربوط۔ ہم آہنگ اور رواں دواں رہتی ہے اس لئے مقامی تعلیمی حکومت کا قیام ایک قوم کی تعلیمی زندگی میں اور بالخصوص ابتدائی تعلیم کی ترویج کا واحد موثر ذریعہ ہے۔

نئے تعلیمی نظام کی معاشی اور اقتصادی حالت

قومی اور مقامی اخراجات

ممالک عراق میں جو تعلیمی بیداری پیدا ہو رہی ہے، اس کے پیش نظر مقامی تعلیمی حکومت کا قیام عمل میں آجائے گا، مگر ان تعلیمی انجمنوں کا قیام ہی تعلیم کی توسیع و ترویج کی ضمانت نہیں ہو سکتا، دیکھنا یہ ہے کہ ان تعلیمی رجحانات کی تعمیر و تشکیل کے لیے کتنی رقم درکار ہوگی اور اس کے حصول کے ذرائع کیا ہوں گے، اگر ہر صوبے میں ایک تعلیمی انجمن کے قیام کا فیصلہ کر لیا جائے تو یہ ضروری ہے کہ صوبائی کونسل کی طرف سے اس انجمن کو محصول کے نفاذ اور اس کے حصول کا پورا حق ہو، اس سے مقامی تعلیمی حکومتوں کی مالی حالت بہتر ہو جائے گی اور یہ جمع شدہ رقم نیم سرکاری اور نیم مقامی ہوگی۔ اور قومی اور مقامی میزانیے میں تعلیمی اخراجات کی صحیح تقسیم کے لئے "زرامداد" کا اصول مرتب کرنا مفید ہوگا، اس اسکیم کے ماتحت ہر صوبائی تعلیمی کمیٹی کو مرکزی تعلیمی میزانیے سے ضرورت کے مطابق رقم ملے گی۔ جسے وہ اپنے مختلف منصوبوں کی تکمیل پر صرف کر سکتی ہے۔

میزانیۂ امور عظمیٰ

عمارتی زرِ امداد اب تک یہ ہوتا آیا ہے کہ تیل سے جو حق شاہی ملتا ہے اسے میزانیۂ امور عظمیٰ کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے، لیکن اس وقت تک اس میزانیے میں سے کوئی رقم تعلیمی توسیع کے لئے خرچ نہیں کی جا سکتی تھی، یعنی نہ اس رقم سے مدرسوں کی عمارتیں تعمیر ہو سکتی تھیں اور نہ معلمین کے لئے مکانات ہی بنائے جا سکتے تھے۔ پچھلے سال اس میزانیے میں خسارہ ہوا، اس حالت میں تعلیم کے لئے کچھ حاصل کرنا مشکل ہی تھا، لیکن اب یہ توقع کی جاتی ہے کہ اگلے چند سال میں یہی رقم ممکنی ہو جائے گی۔ ایک فہیم اور معدبر وزیر معارف پارلیمان کو مجبور کر سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ رقم تعلیم کے لئے مخصوص ہونی چاہیے جو لازمی ابتدائی تعلیم کی توسیع و ترویج میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

مدرسوں میں طلبہ کی حاضری یہ صحیح ہے کہ اس منصوبے کے ابتدائی ایام میں طلبہ کے داخلے کا مسئلہ بہت اہم ہوگا، اس لئے وزارت معارف کے ارباب بست و کشاد کا پہلا فرض داخلے کے سلسلے میں بچوں کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچانا اور اُن بچوں کی حسب ضرورت تھوڑی بہت امداد کرنا ہوگا جو مفلس اور نادار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان حالات میں اگر مقامی تعلیمی حکومتوں کو اگر ضرورت مند بچوں کی خوراک اور ان کے لباس پر کچھ خرچ کرنے کی اجازت مل جائے تو مناسب ہوگا اس طریق کار سے مقامی تعلیمی انجمنوں کو بچوں کی ضروریات اور ان کی کفالت کے وسائل کا تجربہ ہوگا یوں کہ آگے چل کر محکمۂ تعلیم کو نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ عبوری دور محکمے کو آنے والی ذمہ داریوں کی تربیت دے گا۔

لازمی تعلیم کے علاقے عراق میں لازمی تعلیم کی توسیع و ترویج کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ اور اس وقت تو یہ ممکن بھی نہیں ہے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا جا سکے، اس وقت تو صرف موجودہ بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے مدرسوں اور پڑھانے والوں کی کمی کو پورا کرنا ہے۔ اور کسی نئے اقدام سے پہلے مرکزی نظام تعلیم کو وقتی ضروریات کے مطابق ڈھالنا بھی

کچھ کم اہم نہیں ہے، اور انھیں کے پہلو بہ پہلو مقامی نظام تعلیم کی داغ بیل ڈالنا بھی ضروری ہے جب تعلیم کے ان مختلف شعبوں میں ضروری ترمیم و تنسیخ ہو جائے گی تو دوسرے شعبوں میں بھی قدم گزارنا ممکن ہوگا، عراق کی موجودہ حالت کے پیش نظر یہ ممکن نہیں کہ کسی صوبے کو لازمی تعلیم کا علاقہ قرار دیا جائے اس کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے، مثلاً بغداد میں ابتدائی تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد کل تعداد کا ہے یعنی صرف ۴۰ فی صدی بچے زیر تعلیم ہیں۔ اس شہر میں ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے ۶۰ فی صدی بچوں کی تعلیم کے لئے نئے مدرسوں کی ضرورت ہوگی، اور فی الحال ایسے انتظامات دشوار ہیں، اس کے برعکس بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے شہر ہیں جہاں طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے، اور بقدر ضرورت مدرسے بھی موجود ہیں مثلاً شمالی علاقے کے ایک شہر میں مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد ۲۵۰۰ ہے اس میں ۲۰۰۰ بچے اس وقت مدرسوں میں تعلیم پارہے ہیں، اسی طرح اگر چھ مزید ابتدائی مدارس کھول دیئے جائیں اور ہر مدرسے میں طلبہ کی تعداد ۲۰۰ ہو تو بہت آسانی سے لازمی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، اسی طرح اور بہت سے شہر ایسے ہیں جہاں دو چار نئے مدارس کے قیام کے بعد تعلیم لازمی قرار دیا جاسکتا ہے، یا بعض حالات میں موجودہ عمارتوں میں تھوڑی بہت توسیع کے بعد یہ مشکل حل ہوسکتی ہے۔

اگر ان انتظامی اصلاحات کی کوشش کی گئی تو مجوزہ تعلیمی کمیٹی کو سب سے پہلے ان مقامات میں اپنی اسکیم کو جاری کرنا چاہئے، جہاں صرف چند نئے مدارس کے قیام کے بعد ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا جاسکے جن گاؤں، قصبوں یا شہروں میں کافی مدرسے قائم ہو جائیں، وزارت معارف اس علاقے کو لازمی تعلیم کا علاقہ قرار دے اور مقاصد کے حصول کے لئے صوبائی تعلیمی کمیٹی کو ایک ایسا افسر مقرر کرنا ہوگا جو مدرسہ اور گھر کے درمیان ہم آہنگی اور ارتباط قائم رکھ سکے اور ایسے والدین کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرسکے جو اپنے بچوں کو مدرسہ بھیجنے سے گریز کرتے ہیں، اس طرح ابتدائی تعلیم ایک مدت تک تو محض چند مخصوص علاقوں میں ہی لازمی قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اسے پورے ملک میں پھیلایا جاسکتا ہے۔

...ں کی تعلیم

قبائلی علاقوں کی تعلیم کا انتظام کیے بغیر عراق میں تعلیم کو فروغ دینا اور اسے عالمگیر بنادینا کم و بیش ناممکن ہے، اس لئے قبائل کی تعلیمی ضروریات کو محسوس ...سی ایسے قبیلے میں جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ ابھی وہ تادیر قبائلی زندگی بسر کرتے رہیں گے ...شتی مدرسے کی بنیاد ڈالی جائے جو ان کے ساتھ ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر ...ہے، اس گشتی مدرسے سے تعلیم بالغاں کا شعبہ بھی متعلق ہو، جو جاہل نوجوانوں اور ...بھی تعلیم سے روشناس کرانے کی سعی کرے، اور اگر یونیسکو ایسے گشتی مدارس کی کچھ امداد ...ر ہوگا، عراق تعلیمی کام کرنے والوں کی تعلیم کے ساتھ ہر ممکن اشتراک کرے گا۔

طویل میعادی پالیسی

...ک تو محض، ان تجویزوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں مختصر سی مدت میں عملی جامہ پہنایا جا سکتا ...ل مقصد کا یہ طریق محض قلیل میعادی ہے اور اس تعلیمی تگ و دو میں نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ...ے خود منزل نہیں ہے، ان میں سے بعض تجویزیں فوری اقدام کی محتاج ہیں اور بعض ...ہیں کسی سازگار وقت کے لئے ملتوی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب مل جل کر عراق کی تعلیمی ...ی روح پھونک سکتی ہیں، اس لئے اب ہمیں ان تجویزوں کا جائزہ بھی لینا چاہیے جو ...ی پستی دور کرنے میں تو سب سے زیادہ مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن ان کی ...لئے طویل مدت درکار ہے، اچھے مدارس کے قیام اور صحیح تعلیم کے فروغ کا یہی ایک ذریعہ ہے ...ن کے منصوبے کو اس طرح پھیلایا جائے کہ کم سے کم وقت اور کم سے کم دشواریوں میں ...مدہ نتائج حاصل ہو سکیں۔

...فتہ اساتذہ

اس ملک کی تعلیمی پستی کی ایک وجہ عراقی اساتذہ کی علمی بے مائگی اور اچھے تربیتی اداروں کی کمی ہے، وزارت معارف اپنے آسلائی احد میں ہی ...روف رہتی ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف توجہ نہیں دے سکتی۔ اگر وزارت معارف کو

انتظامی کام دیا رکے ان گونا گوں دھندوں سے بچا لیا جائے تو اسے تعلیمی پستی کے بہت سے مسائل حل
کرنے کا موقع مل جائے اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے وہ ان مسائل کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے
جو تعمیر و ترقی میں سب سے زیادہ مفید اور موزوں ثابت ہو سکیں، ان میں ... تربیت اساتذہ سب سے اہم ہے
[illegible]ء میں عراق کے مختلف تربیتی اداروں میں ۲۵۷، اساتذہ نے تربیت حاصل کی، اس میں
شک نہیں کہ بعض تربیتی ادارے بہت عمدہ اور مفید مطلب کام انجام دے رہے ہیں لیکن ان کے
سامنے سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ متعلمین کی بیشتر تعداد ثانوی تعلیم کی تکمیل سے بھی محروم رہتی ہے
چنانچہ ان اداروں کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ ان طلبہ کی کمی کو پورا کریں، بظاہر تو اس کمی کو پورا
کرنے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر حق یہ ہے کہ ان طریقوں سے تربیت گاہوں کے کام میں
براہ راست خلل واقع ہوتا ہے اور جس مقصد کے لئے انہیں بنایا گیا ہے، وہی باقی نہیں رہتا۔ پھر آ
ان اداروں میں اور دوسری ثانوی تعلیم گاہوں میں فرق کیا ہوا، اور جو لوگ ثانوی تعلیم کی تکمیل
کر لیتے ہیں وہ ان اداروں کی بجائے ثانوی تعلیم گاہوں سے متعلق تربیتی اداروں میں ایک سالہ نصاب
کی تکمیل کے لئے داخل ہو جاتے ہیں، ان اداروں میں تعلیم و تدریس اور اساس کے طریقوں کی تدریس
کے لئے مناسب مواقع اور ضروری ساز و سامان نہیں ہوتا، ایسی تدریس اس وقت مناسب کہی جا سکتی
ہے جب ملک کی تعلیمی ضروریات بہت زیادہ بڑھ جائیں۔ نئے مدارس کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ
ہو رہا ہو، اس وقت تو مدرسین کی تعداد کے بڑھانے کا یہی ایک طریقہ قابل عمل اور موزوں ہوتا ہے
تربیت کی اس کمی کا احساس اس وقت ہوتا ہے، جب مدرس نہایت بھونڈے انداز میں درس کا
سلسلہ شروع کرتا ہے۔ بہت کم اساتذہ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اس بے مائگی کو اپنی شخصیت اور
اپنے ذہن رسا کی بدولت دور کر لیتے ہیں، ورنہ حق یہ ہے کہ مقررہ نصاب سے ہٹ کر وہ بچوں کے
لئے کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتے، اور اگر بچوں نے چند الٹے سیدھے فقرے کچھ منی پرانی کہانیاں
اور ریاضی کے دو ایک طریقے سیکھ لئے تو اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا، ان مدارس کو تو اصول تعلیم
[illegible]

طریقوں پر غور ثانی کرے، اس سلسلے میں جو اقدام نہایت ضروری ہیں، انہیں مختصر طور پر درج ذیل کیا جاتا ہے۔

، کم دنوں کے لئے وسطانی جماعتوں کے طلبہ کے لئے موجودہ نصاب کو ختم کر دینا چاہئے۔ اور اس کی بجائے پیشہ ورانہ نصاب کو داخل درس کر دیا جائے جس میں داخلے کی شرط ثانوی مدارس کے امتحانات کی تکمیل قرار دی جائے۔

)) مابعد ثانوی مدارس کی تربیت کے یک سالہ نصاب کو دو سالہ نصاب میں تبدیل کر دیا جائے۔

)) ان اداروں کے پروگرام اور ان کے نظام کار کو از سر نو ترتیب دیا جائے، لیکن اس کی ترتیب و تدوین کے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ابتدائی مدارس میں پڑھنے والے بچوں کی زیادہ تر تعداد دیہاتوں میں رہنے والی ہو گی، اس لئے گھریلو صنعتوں اور دوسرے دیہاتی علوم کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہو گا۔

)) اس وقت عراق میں دیہاتی اساتذہ کی تربیت کے لئے دو تربیتی ادارے ہیں۔ تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ان تربیتی اداروں کو پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں میں تبدیل کر دیا جائے اور ان میں سب سے زیادہ زراعتی علوم کی تربیت کی طرف توجہ دی جائے، لیکن داخلے کے لئے طالب علم کے پاس کم سے کم وسطانی جماعت کا سرٹیفکٹ ہو۔ ان میں ایک ادارہ بہت ہی برے ماحول میں قائم ہے، اسے اس کے موجودہ ماحول سے کسی ایسے مقام پر منتقل کر دیا جائے، جہاں زراعتی اور دیہاتی علوم کی تدریج و ترقی کا کام ہو رہا ہے۔

، دیہاتی علاقوں میں تعلیم کی مانگ بڑھ رہی ہے، اس لئے دیہاتی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے لئے مزید تربیتی ادارے قائم کرنے ضروری ہیں، لیکن ایسے تعلیمی و تربیتی اداروں کے قیام کے لئے ایسے مقامات کا انتخاب کرنا چاہئے جو جدید تعمیراتی پروگرام کے مراکز ہوں۔ ان تعمیری ترقیوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی رہائش کے لئے مکانات کی تعمیر بھی ضروری ہے۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں میں رہائش کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ بعض اساتذہ کو بلا قامت کے کسی کمرے میں بچوں کے ساتھ ہی رہنا پڑتا ہے اور بعض حالات میں بہت ہی گندے اور غیر صحت مند ماحول میں زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ قوم کی

ترقی و تعمیر میں مدرس جو اہم پارٹ ادا کرتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اس کی رہائش کا انتظام نہایت ضروری ہے یہ حالات کچھ ایسے ناگفتہ بہ ہیں کہ بعض اساتذہ اسی وجہ سے گاؤں میں اور ایسی جگہوں پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جہاں انہیں رہائشی دقتیں ہوتی ہیں، اگر رہائش کا معقول انتظام ہو تو دیہاتی علاقوں میں بھی اچھے مدرسین کام کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

ابتدائی مدارس میں تدریسی طریقوں کو بہتر بنانا

ابتدائی مدارس کی معاشری زندگی

مدرسے کی معاشری زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ طلبا اور اساتذہ کا گہرا اور مربوط تعلق ہے۔ اور کسی سماج کی ترقی اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے ان کا تعاون اور اشتراک عمل ضروری ہے، اگر مدرس آئے دن ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں منتقل ہونے کی فکر میں رہے گا تو وہ مدرسے کی سماجی زندگی میں کوئی نمایاں حصّہ نہیں لے سکتا، ابھی تو بچوں سے اس کی دو ایک ملاقاتیں ہی ہونے پاتی ہیں کہ وہ کسی دوسرے ادارے میں جانے کے لئے اپنا رخت سفر باندھ لیتا ہے، نہ بچے اس سے روشناس ہونے پاتے ہیں اور نہ ان کے دلوں میں استاد کا احترام اور وقار پیدا ہوتا ہے، استاد کو بچے کی انفرادیت کے جاننے اور اسے ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا موقع ہی نہیں ملتا، انجام کار وہ اس علاقے کی معاشری زندگی کو اپنانے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ دیہاتی مدارس میں اساتذہ کے لئے مکانات تعمیر کئے جائیں اور انہیں کچھ "دیہاتی الاؤنس" بھی دیا جائے اس طرح اچھے اور تربیت یافتہ اساتذہ دیہاتی تعلیمی ترقی میں حصّہ لینا شروع کر دیں گے، اگر اس قسم کے انتظامات کئے گئے تو دیہاتی مدارس بہت جلد عراق کی سماجی زندگی میں اونچا مقام حاصل کر لیں گے۔

مدرسوں کے لئے آزادی کار

اگر مدرسوں کی تربیت اور ان کی رہائش کا معقول انتظام کر دیا گیا۔ اور انھیں ان تفکرات سے نجات مل گئی تو وہ زیادہ عمدگی سے اپنے پروگرام کو مرتب کر سکیں گے۔ اور اس سے مدرسے کے مشاغل اور اس کی تعلیم و تربیت میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا

دجائے گی، حالاں کہ دیہاتی اور شہری مدارس اور لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب میں کوئی فرق نہیں
پھر بھی اس تعلیمی ماحول میں بھی آزادیٔ کار کے مختلف مواقع موجود ہیں، جن سے فائدہ اٹھا کر سماجی زندگی
و بہتر بنایا جا سکتا ہے، یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بہت جلد ایک ایسا وقت بھی آجائے گا جب وزارت معارف
مرکزی نصاب کو ختم کر کے علاقائی ضرورتوں کے پیش نظر نیا نصاب اور اساتذہ کی رہنمائی کے لئے ایک مشاورتی
پروگرام مرتب کرے گی، اگر اس قسم کا نصاب اور پروگرام مرتب کر لیا گیا اور مدرسوں کو بھی اپنا اپنا طریق کار
متعین کرنے کی اجازت مل گئی تو اس سے ان کے پروگرام میں نیا جوش پیدا ہو جائے گا، اس سے اساتذہ
بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگیں گے، اور ان بے رونق مدرسوں میں زندگی کی ایک لہر بھی دوڑ
جائے گی۔ اور اگر وزارت معارف اس تجویز کو اتنا مفید نہ سمجھے یا ہر مدرسے کو اپنی اسکیم بنانے کی اجازت نہ
دے تو کم سے کم ہر صوبے میں اساتذہ کا ایک مشاورتی بورڈ ضرور مقرر کر دیا جائے، جو اپنے علاقوں کے لئے
پروگرام مرتب کر سکے اور ان صوبائی پروگراموں کو مرکزی حکومت بھی منظور کر لیا کرے۔

اساتذہ اور ان کی ضروریات درس و تدریس کے سلسلے میں اساتذہ کی تربیت اور رہائش کے لئے مکانوں کے اہتمام سے قطع نظر ان کے لئے علمی اور معلوماتی خوراک مہیا کرنا
بھی ضروری ہے، انہیں اپنے ماحول سے پوری پوری واقفیت ہو، اپنے پیشے سے وابستگی ہو، طلباء کے
رجحانات کا علم ہو اور باہمی تعاون و اشتراک سے وہ ایک نئی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوں۔

المختصر عراق میں لازمی ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے سب سے پہلے ملک کے معاشی اور
سماجی مسائل کو حل کیا جائے۔ اس کے بعد ہی صوبائی تعلیمی کمیٹی لازمی تعلیم کے لئے راہ ہموار
کر سکتی ہے۔ اس لئے صوبائی تعلیمی کمیٹی کا قیام نہایت اہم ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے کم سے کم دو
صوبوں میں "مثالی لازمی تعلیمی ترقی" کی تجویز کو بروئے کار لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ان میں سے
ایک صوبہ شمال میں ہو اور دوسرا جنوب میں۔ اسی طرح رفتہ رفتہ پورے ملک میں لازمی تعلیم کو
جاری کیا جا سکتا ہے۔

امیل
یا
روسو کی تعلیم

ترقیمہ مرزا ازرقی

سلسل نمبر ۲۲

ہر ایک کے لئے دوڑنے کے جدا جدا مقامات معین کرتے وقت وہ یہ نہیں معلوم کر سکتا تھا کہ دوڑنے کے فاصلے غیر مساوی ہیں اور معینہ مقام پر پہونچنے کے لئے جس کسی کو طویل ترین فاصلہ دوڑنا ہوتا تھا وہ ٹوٹے میں ہی رہتا تھا اور باوجودیکہ میں نے اپنے شاگرد کو جس مقام سے وہ چاہے دوڑنے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن وہ اس سے فائدہ اٹھانا نہ جانتا تھا وہ محض بالحاظ فعل ہمیشہ صاف اور ہموار ترین سیدھی راہیں اختیار کرتا تھا پس انتخاب کے قبل ہی میں پیشین گوئی کر سکتا کہ وہ کونسی راہ اختیار کرے گا۔ اور تقریباً اپنی اپنی مرضی سے جتوا یا ہرا سکتا تھا، اس حکمت عملی میں مجھے ایک سے زائد مقاصد مدنظر تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ان فاصلوں کی کمی بیشی کو وہ خود محسوس کرے پس اس سے واقف کرانے کی میں نے سعی کی۔ عام طور سے گو وہ آرام طلب اور سست ضرور تھا لیکن اس کھیل میں اس کو اس قدر انہماک ہو گیا تھا اور مجھ پر اس قدر کامل بھروسہ رکھنے لگا تھا کہ یہ محسوس کرانے کے لئے کہ میں اس کو دھوکے میں رکھتا تھا، مجھے خود بڑی ہی دقت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر جب اس کے اظہار میں مجھے کامیابی حاصل ہو گئی تو وہ باوجود اس قدر جوش و خروش رکھنے کے مجھ سے ناراض ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ تم کس بات کی شکایت کرتے ہو؟ کوئی عطیہ یا انعام اگر میں کسی کو دینا چاہتا ہوں تو اس انعام کے متعلق شرائط عائد کرنے کا کیا میں بذات خود مختار مطلق نہیں ہوں؟ تمہیں دوڑنے کو کس نے کہا ہے؟ کیا میں نے کسی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں سارے فاصلے مساوی

رکھوں گا؟ کیا میں نے تمہیں بالکل آزادانہ اختیار نہ دے رکھا تھا؟ کیا تمہیں یہ نہیں دکھائی دیتا کہ تم پر میری کس قدر عنایت ہے؟ جس عدم مساوات کا تم گلا کرتے ہو کیا وہ تمہارے ہی فائدے کے لئے نہ تھی، بشرطیکہ تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔" اس سے معاملہ بالکل صاف ہوگیا۔ آئندہ سے اس بچے کو دوڑنے کا مقام انتخاب کرنے کے لئے زیادہ احتیاط سے کام لینا ضروری ہوگیا۔ ابتداءً اُس نے اپنے قدموں سے فاصلوں کو ناپنے کی کوشش کی لیکن بچے کے قدم چھوٹے اور غیر صحیح ہوتے ہیں۔ اور پھر میں نے بھی ایک ہی دن میں کئی کئی دوڑوں کا اعلان کر دیا، پس چونکہ بچے کو اس کھیل کی ایک لت سی پڑگئی تھی، اس لئے وہ دوڑنے کے وقت کو فاصلوں کے ناپنے میں صرف کرنا پسند نہ کرتا تھا، اس قسم کی تاخیر بچوں کی سریع المزاجی اور ناصبوری سے میل نہیں کھا سکتی ہے، لہذا اس بچے نے غور سے دیکھ کر نظر کے ذریعہ ہی زیادہ صحیح اندازہ لگانے کی مشق شروع کر دی۔ اب بچے کی قوت کو وسعت اور ترقی دینا کچھ زیادہ دشوار معاملہ نہ رہا تھا، بالآخر چند ماہ کی عملی مشق اور اس بچے کی غلطیوں کی تصحیح ہو جانے کے بعد اس کی قوت اندازہ اس قدر بڑھ گئی کہ میں کسی فاصلہ بعیدہ پر صرف ایک خیالی لیک رکھ دیتا تھا تو وہ ایک نظر میں اس فصل کا ایسا صحیح اندازہ لگا دیتا تھا جیسا کہ کوئی پیمائش کرنے والا اپنی زنجیر کے ذریعہ ناپ کر جانچتا ہے۔

جملہ حواس میں فقط نظر ہی وہ حس ہے جس کی تفریق ذہنی فیصلوں کے ذریعہ ہم بمشکل ہی کر سکتے ہیں، لہذا کسی شے کو دیکھنا سیکھنے کے لئے ایک مدت مدید درکار ہوتی ہے، بصارت اور لمس کا موازنہ کرنے اور بصارت کو کسی منظر اور اس کے فصل کے متعلق صحیح اور ٹھیک اندازہ لگانے کی مہارت حاصل کرنے کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے، حرکت انتقالی کئے اور چھوئے بغیر دنیا میں تیز سے تیز نگاہ بھی ہمیں فاصلے کا صحیح تخیل نہیں بخش سکتی ہے، سیپ کے کیڑے کو ساری دنیا ایک ہی نقطہ نظر آتی ہے، اور اس کے پاس اگر انسانی ذہن بھی ہوتا تب بھی اس سے زیادہ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا صرف چلنے چھونے، حساب لگانے اور اشیا کی وسعت کی پیمائش کرنے ہی سے ہم چیزوں کا صحیح اندازہ لگانا سیکھتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف اگر ہم ہر چیز کی ہمیشہ پیمائش ہی کیا کریں۔ تو ہمارے حواس صرف آلات اور اوزاروں پر ہی اکتفا کرنے لگیں۔ اور خود کبھی بھی اعتماد کا اہل

حاصل نہ کرسکیں، نہ ایک بچے کو پیمائش کرتے کرتے ایک دم سے خود بخود اندازہ لگانے لگنا چاہیئے اگر وہ کل فاصلے کا اندازہ نہ لگا سکتا ہو تو اسے اس فاصلے کے علیحدہ علیحدہ اجزا کا اندازہ لگاتے رہنا چاہیئے، اسے پیمائش شدہ مساوی حصص کی جگہ اپنے اندازہ کردہ مساوی حصص قائم کرنے چاہئیں اور ہاتھوں سے پیمائش کرنے کی بجائے آنکھوں سے اندازہ لگانے کا عادی ہونا چاہیئے، بہرحال میں اس کے پہلے اندازے کو پیمائش کے ذریعہ جانچ کرا کے بتاؤں گا تاکہ وہ اپنی غلطی کی تصحیح کر سکے اور اگر اس کے حواس پر کوئی غلط نقش قائم ہو گیا ہو تو اسے زیادہ صحیح اندازے کے ذریعے درست کرے، پیمائش کے فطرتی معیار یعنی انسان کا قدم۔ اس کے ہاتھوں کا پھیلاؤ اور اس کا قد و قامت تقریباً ہر جگہ مساویانہ طور پر استعمال ہوتے ہیں، پس جب کبھی ایک بچہ اپنے کمرے کی چھت کی اونچائی کا اندازہ لگانا چاہے تو پیمائش کا گز خود اتالیق کو ہی بننا چاہیئے۔ اگر وہ بچہ کسی مینار کی بلندی کا اندازہ لگانا چاہے تو اس کا آلۂ پیمائش مکان ہونا چاہیئے، اگر وہ بچہ یہ معلوم کرنا چاہے کہ کوئی سڑک کتنی لمبی ہے تو اسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں اسے کتنے گھنٹے درکار ہوتے ہیں، اور سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اس کے لئے آپ خود کچھ نہ کریں، بلکہ یہ سب کچھ اسے بذاتِ خود ہی کرنے دیجئے۔

مصوّری اجسام کی ہیئت پہچاننا اور ان کی اشکال کی نقل اتارنا سیکھے بغیر کوئی شخص بیک وقت ان کی جسامت کا اندازہ لگانا نہیں سیکھ سکتا ہے، اس لئے کہ نقالی کا انحصار فی الواقع کلیتاً قوانین بصارت پر ہی ہوتا ہے اور ان قوانین کو جانے بغیر فاصلے کا کوئی شخص بھی اندازہ نہیں لگا سکتا ہے، تمام بچے اپنی محدود نقالیوں کے دوران میں مصوّری کی بھی کوشش کرنے لگتے ہیں لہذا محض فن کے لئے نہیں بلکہ صحیح النظری اور انگلیوں میں لچک پیدا کرنے کی غرض سے میں اسمٰعیل کو اس فن کی بھی مشق کراؤں گا، یا بالفاظ عام متذکرہ صدر مشق سے جو نظر کی صحت لطافت جسمانی پاکیزگی اور سبک پن کی عادت پڑ جاتی ہے، وہ اگر اسمٰعیل کو حاصل ہو جائے تو پھر مجھے اس کی فکر نہیں رہے گی کہ وہ اس سے واقف ہے یا نہیں پس میں اس بات کی بڑی احتیاط کروں گا کہ

اسمٰعیل کے لئے میں کسی ڈرائنگ ماسٹر کو نہ رکھوں جو اسے محض نقلوں کی نقل اتارنا اور نقشوں پر سے ہی نقشے بنانا سکھائے گا، استاد قدرت ہی ہوگی اور اس کی نقشہ کشی کا نمونہ اشیا و مناظر ہوں گے، اسمٰعیل کے سامنے اصلی چیز ہونی چاہئے، کسی چیز کی کاغذی نقل نہ ہونی چاہئے، اسمٰعیل کو دیکھ کر گھر درخت اور آدمی کا نقشہ اتارنا چاہئے تاکہ اسے اشیا اور ان کی صحیح حالت دیکھنے کی عادت ہو جائے اور مصنوعی و نمائشی چیزوں کو وہ اصل نہ سمجھنے لگے، میں اسمٰعیل کو اس کی بھی عادت ڈالوں گا کہ وہ صرف انہی چیزوں کا نقشہ اتارے جو اس کے سامنے موجود ہوں، اپنے حافظے کو دخل نہ دے تاکہ مشاہدوں کی تکرار کے باعث اس کے ذہن میں چیزوں کی ٹھیک اور صحیح شکل بیٹھ جائے اور ایسا نہ ہو کہ اصلی اور حقیقی چیزوں کو چھوڑ کر وہ بیکار اور خیالی نقشے اتارنے لگے اور ان اشیا کے مناسب احساس اور قدرتی مذاق کو ضائع کر بیٹھے۔

یہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ کوئی قابل امتیاز چیز تیار کرنے کے قبل وہ انگنت ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور ناقابل امتیاز نقشے ہی اتارے گا، اور یہ کہ ایک نقشہ نویس کے ہاتھ کا بانکپن اور اس کے خاکوں کی قدرت حاصل کرنے کے لئے اسمٰعیل کو ایک عرصہ درکار ہوگا، اور شاید اپنے نقشوں میں جاذبیت نگاہ اور اعلیٰ مذاق تو وہ کبھی پیدا نہ کرسکے گا۔ برخلاف اس کے صحیح النظری، پُروثوق ہاتھ، جانوروں، پودوں اور قدرتی چیزوں کے درمیان شکل و جسامت کے اصلی تعلقات کا علم مع مناظر کے اثرات کی سریع الحسی کے اُسے یقیناً حاصل ہو جائے گا، میں حقیقتاً چاہتا بھی یہی ہوں اور میرا مقصد حقیقی بھی یہی ہے کہ اسمٰعیل نقل اتارنے کی بجائے خود اشیا ہی سے واقف ہو جائے میں تو ایک اعلیٰ نقاش کار کی نسبت ایک ببول کے درخت کی ناقص تصویر ہی بنی ہوئی دیکھنا زیادہ پسند کروں گا۔

علاوہ بریں دیگر مشاغل کی مانند اس شغل میں بھی اسمٰعیل کو میں اکیلا نہ چھوڑوں گا، بلکہ زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے خود میں بھی اس کا ہم سبق بن جاؤں گا، میرے سوا اس کا کوئی رقیب نہ ہوگا، اور میری اس رقابت سے اسے کسی قسم کا خطرہ نہ ہوگا، اس لئے کہ میری شرکت سے

حسد پیدا کئے بغیر اسٹمیل کے مشاغل کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اسٹمیل کی تقلید میں ایک پنسل میں خود بھی اٹھاؤں گا، اور شروع شروع میں بھی اسی کی مانند اناڑی پنے ہی سے کام لوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو میں ایپلیز (APELLES) کے مانند ہو جاؤں گا۔ ابتدا میں ایک آدمی کا خاکہ بالکل ایسا بناؤں گا جیسا کہ بچے دیواروں پر اتارا کرتے ہیں، ہر ہاتھ اور ہر پیر کے لئے ایک ایک لمبی لکیر اور انگلیاں ہاتھوں سے لمبی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم میں سے ایک اس تناسبی نقص کی طرف متوجہ ہو گا، اور ہم یہ مشاہدہ کر لیں گے کہ ٹانگ موٹی ہوتی ہے اور اس کی موٹائی تدریجی اور سڈول ہوتی ہے، اور ہاتھوں کی لمبائی جسم کے تناسب کے مطابق ہوتی ہے، ان ارتقائی مدارج میں یا تو میں اپنے شاگرد کے ساتھ چلوں گا۔ یا محض اتنا ہی اس سے آگے رہوں گا کہ وہ بہ آسانی مجھے پکڑ کر سکے اور بعض بعض اوقات مجھ پر بھی فوقیت حاصل کر سکے، اس کے بعد ہم برش اور رنگ بھی لے آئیں گے اور چیزوں کا خاکہ اتارنے کی بجائے ہم ان چیزوں کے رنگ، روپ کی پوری پوری نقل اتارنے کی کوشش کریں گے، مطبوعہ خاکوں میں رنگ آمیزی کریں گے اور الٹے سیدھے دھبے ڈالیں گے، ان تمام الٹی سیدھی لکیروں کو کھینچتے وقت ہم قدرتی اسرار کی مسلسل جستجو میں بھی رہیں گے، اور جو کچھ کام بھی ہم کریں گے اسی استانی کی نگرانی میں انجام دیں گے۔

ہمارے کمرے کی زیبائش کے لئے ہمیں اس کی آراستگی اور سجاوٹ کی ضرورت ہوگی، ہماری مصوری سے ہمیں تمام سامان تیار مل جائے گا، ان تصویروں کو میں عمدہ اور خوبصورت چوکھٹوں میں جڑوا دوں گا اور شیشے لگواؤں گا۔ تاکہ انہیں کوئی چھو نہ سکے اور وہ ایسی جگہ آویزاں ہوں گی۔ اور سجائی جائیں گی جہاں ہر وقت ہماری نگاہ کے سامنے رہنے کی وجہ سے ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے مال کی حفاظت کا موقع حاصل ہو، ان تصاویر کو جو بیس بیس اور تیس تیس مرتبہ اتاری گئی ہوں گی کمرے میں علی الترتیب چاروں طرف اس طور پر لٹکا دوں گا کہ ہم میں سے ہر ایک مصوّر کی اس وقت سے تدریجی رفتار ترقی کا پتہ چل سکے جب سے کہ اس نے اپنی پہلی تصویر انسان کے بے قاعدہ خاکوں کی

بنائی تھی، پھر مکان کے صدر حصہ کا منظر اتارا تھا۔ اس کے بعد دونوں پہلوؤں کا منظر اتارا۔ اور پھر مکان کا قالب قائم کرکے اس کے اندھیروں اجالوں کا شیڈ دے کر ایک بالکل صحیح اور ٹھیک نقشہ اتارا تھا۔ یہ مدارج ہمیں ایسی تصویریں مہیا کردیں گے جو خود ہمارے لئے بھی ایک جولانی کا باعث ہوں گی، اور دوسروں کے لئے بھی ایک حیرت و استعجاب کا اور جن سے ہمیں اقدام مزید کی اور بھی زیادہ ترغیب ہوگی، ابتدائی اور بھونڈی تصویریں محض نمائش کی غرض سے میں نہایت عمدہ سنہرے چوکھٹوں میں جڑوادوں گا، اور جوں جوں نقالی صحیح تر اور مصوری حقیقتاً عمدہ ہوتی جائے گی، میں تصویروں کو سادہ ترین اور سیاہ چوکھٹوں میں جڑوا تا جاؤں گا، اس لئے کہ ان تصاویر کو ذاتی خوبی کے سوا کسی اور سجاوٹ کی ضرورت نہ ہوگی اور یہ بڑی ہی افسوسناک بات ہوگی کہ تصویر کی ذاتی نفاست اور خوبی کو چوکھٹا جذب کرلے پس ہم دونوں میں ہر ایک کو سادے چوکھٹے ہی کی خواہش رہے گی اور جب کبھی ہم ایک دوسرے کی تصویروں کی ہجو اور مذمت کریں گے تو اس پر سنہرے چوکھٹے کا فقرہ ہی چسپاں کریں گے، یہ سنہرا چوکھٹا کسی زمانے میں ہمارے مابین شاید ایک ضرب المثل ہو جائے گا، اور ہم یہ معلوم کرکے تعجب کیا کریں گے کہ کتنے لوگ ہیں جو سنہرے چوکھٹوں کی خواہش رکھنے کے ذریعہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو آشکارا کردیتے ہیں۔

جیومیٹری یہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ جیومیٹری بچوں کے بس کی بات نہیں ہے لیکن یہ ہمارا اپنا ہی قصور ہے کہ ہم یہ دیکھنے سے محروم رہتے ہیں کہ بچوں کا طرز عمل ہم سے مختلف ہوتا ہے جو ہمارے لئے گیان ہے وہ ہمارے لئے دھیان ہے۔ انھیں اپنا طریقہ سکھانے کی بجائے یہ بہتر ہوگا کہ ہم خود ہی ان کا طریقہ اختیار کرلیں، اس لئے کہ جیومیٹری سیکھنے کا ہمارا طریقہ اتنا ہی خیالی ہے جتنا کہ وہ عقلی ہے، جب کوئی ایک مقالہ بیان کیا جائے تو اس کے ثبوت کا تصور بالذات آپ کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے یعنی آپ کو یہ سوچنا ضروری ہوتا ہے کہ آپ کے پڑھے ہوئے مقالوں میں سے اس کا کس مقالے سے تعلق ہے اور پھر اس مقالے کے جملہ استخراجوں میں سے ایک صحیح مطلوبہ نتیجہ منتخب کرنا آپ کو ضروری ہوتا ہے۔ اس طور پر بڑے سے بڑا منطقی بھی بشرطیکہ وہ جدت پسند نہ ہو

خود کو بھٹکا ہوا پا سکتا ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے یہ کہ خود ہم سے ثبوت معلوم کرانے کی بجائے وہ
ہم سے بیان کر دیا جاتا ہے، اور عقل استعمال کرانے کی بجائے ہم سے ہمارا حافظہ استعمال کرایا جاتا ہے
صحیح شکلیں کھینچیے اور انہیں اکٹھا کر دیکھیے، اور پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر ان کے تعلقات جانچیے
تو آپ کو تعلیق، تعریفوں، مسئلوں یا کسی اور قسم کے مظاہروں کا ایک لفظ بھی معلوم کئے بغیر ایک شے
کے ذریعہ دوسرا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے تمام ابتدائی جیومیٹری آ جائے گی میں یہ نہیں کہتا کہ ایمیل کو
میں جیومیٹری سکھاؤں گا بلکہ وہ خود مجھ ہی کو سکھائے گا، تعلقات کا میں پتہ چلاؤں گا وہ انھیں
معلوم کرے گا، اس لئے کہ میں ان کی تلاش ہی اس طور پر کروں گا کہ وہ انھیں خود ہی معلوم
کر سکے، مثلاً دائرہ کھینچنے کے لئے کسی پرکار کا استعمال کرنے کی بجائے میں ایک ڈوری میں پنسل
باندھ کر اس ڈوری کا ایک سرا ایک کھونٹی سے باندھ دوں گا، اس کے بعد جب میں دونوں
قطروں کا مقابلہ کروں گا تو ایمیل میرا مذاق اڑائے گا، اور مجھے بتائے گا کہ ایک محدود تنے ہوئے
ڈورے سے کوئی دائرہ غیر مساوی قطروں کا نہیں بن سکتا، اور اگر میں ۶۰، درجے کا زاویہ
ناپ کر بناؤں گا تو میں زاویئے کے کنارے قوس کی بجائے پورا دائرہ ہی کھینچ دوں گا، اس لئے
بچوں کے معاملات میں کسی چیز کو مسلم الثبوت خیال نہ کرنا چاہیے، مجھے اس سے یہ معلوم ہو جائے گا
کہ دائرے کا وہ حصہ جو زاویئے کی دو ٹانگوں کے مابین واقع ہوتا ہے وہ دائرے کا چھٹا حصہ ہوتا
ہے، پس اسی مرکز سے میں ایک اور ذرا بڑا دائرہ بناؤں گا تو مجھے معلوم ہوگا کہ اس دائرے کی
قوس بھی جو اس زاویئے کی دونوں ٹانگوں کے مابین قائم ہوئی ہے اس دائرے کا چھٹا حصہ ہے۔
پھر سہ بارہ ایک اور دائرہ کھینچوں گا اس کا بھی حشر ہوگا، الغرض میں دائروں پر دائرے اسی ایک
نتیجہ کے ساتھ کھینچتا چلا جاؤں گا، حتیٰ کہ ایمیل میری حماقت سے متحیر ہو کر مجھے بتائے گا کہ ہر قوس
چھوٹی ہو یا بڑی جو ایک ہی زاویئے کی ٹانگوں کے درمیان قائم ہوگی وہ ہمیشہ اپنے دائرے کا چھٹا
حصہ ہی ہوگی، اس کے بعد ہم چاہیں تو پروٹریکٹر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔
یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ایک خط مستقیم پر دو متصلہ زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں کے برابر

، لوگ یہ دائرہ کھینچ دیتے ہیں۔ میں اس کے برعکس اسمٰعیل کو اسی دائرے کے اندر اس واقعہ کا
ادوں گا، اور اس سے کہوں گا، اگر ہم دائرہ مٹا دیں اور محض لکیروں کو ہی رہنے دیں تو زاویوں
ں کیا فرق پڑ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔
ں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے کہ شکلیں صحیح بنائی جائیں بلکہ انہیں صحیح فرض کر کے محض ان کے
ورد دیا جاتا ہے، اس کے برعکس ہمارے پاس ثبوت وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، ہمارا
م یہ ہوتا ہے کہ نہایت سیدھی اور صحیح لکیریں مکمل اور ٹھیک ٹھیک چوکور مربع اور بالکل صحیح
ت دائرے کھینچیں، ان شکلوں کی صحت کا اطمینان کرنے کے لئے ہم ان کی ہر ایک متوازی میت
ہیں، جس سے ہمیں روز بروز نئی نئی خاصیتیں معلوم کرنے کا موقع مل جاتا ہے، ہم دائرے کے
حصوں کو قطر پا اور مربع کے دو نصف حصوں کو خط بین الزاوتین پر موڑ دیتے ہیں۔ اسمٰعیل
ن دونوں کشیدہ شکلوں کا مقابلہ دیکھنے کے لئے کرتا ہے کہ کونسی شکل کے کنارے نہایت
ٹھیک ملیٹھتے ہیں یعنی ہم دونوں میں سے کس کی بنائی ہوئی شکل صحیح ترین ہے، پھر ہم یہ
تے ہیں کہ آیا یہ مساوی تقسیم مثلث اور متعدد پہلوؤں والی شکلوں میں ممکن ہو سکتی ہے بعض اوقات
م کرنے کے لئے ہم کسی ایک نتیجے کے متعلق پیشین گوئی بھی کر دیا کرتے ہیں، میرے طالب علم
رل اور پرکار کا صحیح استعمال ہی جیومیٹری ہے، اسمٰعیل کو ڈرائنگ جس میں کہ یہ آلات استعمال
۔ تے ہیں اور اس علم کو ہرگز خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ میں جنتری اور پرکار دونوں کو ہی مقفل
تا کہ وہ ان کے ساتھ گڑبڑ کرنے کا عادی نہ جائے۔ لیکن کبھی کبھی ہم اپنی ان شکلوں کو
ہی کے وقت اس غرض سے ساتھ لے جایا کریں گے کہ ہم جو کچھ کام انجام دے چکے ہیں
ندہ دینا چاہتے ہوں ان کے متعلق گفتگو کر سکیں۔
یک نوجوان شخص کو جسے میں نے ٹرین میں دیکھا تھا میں کبھی نہیں بھول سکتا، اقلیدسی
تی اشکال کے کنکیوں میں سے روزمرہ مساوی الاضلاع کیک چلنے کی عادت کے باعث
بچپن ہی سے سطح اور اونچ نیچ کے تعلقات کو جان لیا تھا، اس چھوٹے سے پودے نے

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ سب سے بڑا ایک کونسا ہے ارکیمیڈیز (ARCHIMEDES) کی سار
استادی ختم کردی تھی۔

بچہ جب پتنگ اڑاتا ہے تو اس وقت وہ آنکھ اور ہاتھ دونوں کا صحیح اندازہ معلوم کر
سیکھتا ہے، اور جب وہ لٹو گھماتا ہے تو اس کے ذریعہ وہ اپنی قوت تو ضرور بڑھاتا ہے لیکن
کسی قسم کا علم حاصل نہیں کرتا ہے۔ اکثر میں یہ سوچا کرتا ہوں کہ بچوں کو بھی وہی ماہرانہ کھیل کیوں
سکھائے جائیں جو بڑے آدمی کھیلتے ہیں، یعنی ٹینس۔ بلیرڈ۔ تیراندازی فٹ بال اور آلات
موسیقی وغیرہ کا استعمال وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھ سے کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض کھیل تو بچوں کی
استطاعت کے باہر ہیں اور بعض کے لئے ان کے حواس پختہ نہیں ہوتے ہیں۔
یہ عذر مجھے معقول نہیں جچتے ہیں۔ ایک بچہ آدمی کے قد کا نہیں ہوتا ہے، لیکن کوٹ
وہ اسی نمونے کا زیب تن کرتا ہے جو پورا آدمی استعمال کرتا ہے، میں اسے تین فٹ اونچی بلیرڈ
کی میز پر اپنے کیو سے تھوڑی کھلانا چاہتا ہوں، نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ادھر ادھر مارا مارا پھر
اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ ہمارا ٹینس کا بلا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں ہلاتا پھرے، لیکن کمرے کی
کھڑکیاں بند کرکے بچے کو اس کے اندر کھلائیے اور ٹینس کا بلہ لکڑی کا بنوا دیجیے، پھر کھال کا
بلہ بنوا دیجیے اور مابعد آنت کا جیسے جیسے وہ ترقی کرے آپ کا عمل بھی بدلتا رہنا چاہئے، پتنگ بازی
کو آپ محض اس وجہ سے سبقت دیتے ہیں کہ اس میں نقصان بھی کم ہوتی ہے اور خطرہ بھی کم
لیکن یہ آپ کی دوہری غلطی ہے۔ پتنگ بازی تو عورتوں کا کھیل ہے جو سخت گیند سے بھاگتی
ہیں اور جن کا نازک اور ملائم چمڑا چوٹیں کھا کر سخت ہونے کے لئے نہیں بنا اور نہ ان کا چہرہ زخمی
ہونے کے لئے بنا ہے۔ لیکن ہم مرد تو طاقت ہی کے کاموں کے لئے بنائے گئے ہیں، کیا آپ کے خیال
میں ہم بغیر مشقت طاقت ور بن سکتے ہیں؟ اور ہم پر اگر کوئی حملہ آور ہو یا کوئی آفت آجائے تو کیا ہم
بغیر استعمال قوت اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ جن کھیلوں میں خطرہ اور جوکھم نہیں ہوتا ہے انھیں
لوگ عدم توجہی اور لاپرواہی کے ساتھ کھیلتے ہیں، ایک گرنے والی پتنگ سے کوئی زخمی نہیں

ہو سکتا لیکن سر کی حفاظت کرنے سے بالغوں میں جس قدر لچک اور پھرتی آتی ہے، اور آنکھ کی حفاظت میں جس قدر نگاہ صحیح ہوتی ہے، اتنی کسی اور ورزش میں نہیں ہوتی ہے، ایک کمرے میں اس کونے تک بھاگنا، گیند کے گرنے کے قبل اس کے اچھلنے کا اندازہ لگانا اور پوری قوت اور صحیح انداز سے کے ساتھ گیند کو واپس لوٹانا وغیرہ درحاصل صرف آدمیوں کے کھیلنے ہی کے کھیل نہیں ہیں بلکہ بچے کبھی یہ آدمی بنانے والے کھیل ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ بچے کے اعضاء ملائم اور نازک ہوتے ہیں، بے شک ان کے قویٰ آدمی کے مانند مضبوط اور طاقت ور تو نہیں ہوتے ہیں لیکن جس طرح کہ ہم بچوں سے دیگر اوزاروں کو استعمال کراتے ہیں، اسی طرح ان کے ہاتھوں کو بھی جملہ امور کا لحاظ رکھ کر استعمال کرانا چاہئے، بچوں کو اپنے ہاتھوں کو استعمال کرنے کی مہارت نہیں ہوتی ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بچے فی الواقع اپنے ہاتھوں کو استعمال کرنے کی مہارت حاصل کریں، اس لئے کہ نقص مشق سے آدمی بھی نرا گاؤدی کا گاؤدی رہ جاتا ہے، ہم اپنے اعضا کو استعمال کرنے سے ہی ان کا استعمال صحیح طور پر کرنا سیکھتے ہیں اور محض ایک طویل تجربے کے بعد ہی ہم اپنے بہترین فناتی فوائد سے واقف ہوتے ہیں، اور یہی تجربہ ہمارے مطالعے کا مقصد حقیقی ہے جس میں کہ ہم زیادہ جلد مصروف نہیں ہونے پاتے ہیں۔

جو ایک مرتبہ کیا جا چکا ہے وہ پھر کیا جا سکتا ہے۔ ایسے تیز و طرار اور ہنر مند بچے جن کا ایک ایک عضو پھرتی اور چستی میں پورے آدمی ہی کی مانند ہوتا ہے، بہت عام نظر آتے ہیں، ہر ایک میلے ٹھیلے میں ایسے بچے چھوٹے کی پینگیں بھرتے۔ ہاتھوں کے بل چلتے، کودتے، اچھلتے اور رسیوں پر ناچتے نظر آتے ہیں اٹلی کی قدیم تماشہ گاہوں میں عرصہ دراز تک بچوں کی ٹکڑیاں ہی لوگوں کو تاریخی گیتوں اور رقصوں میں محو اور مسحور کئے رکھتی تھیں، جرمنی اور اٹلی میں وہ کونسا شخص ہے جو نکولینی کی شہرہ آفاق ناٹک کمپنی کے نام نامی سے واقف نہ ہو، کیا کسی کو کبھی یہ بھی خیال گذرا کہ اس ناٹک کمپنی کے بچوں کے کھیل اور ان کی نقل و حرکت بڑے آدمیوں کے مقابلہ میں ناقص تھی یا ان بچوں کی وضع قطع کچھ کم شاندار تھی یا ان کی سماعت غیر صحیح تھی، یا ان کا ناچ زیادہ بھدا اور بدوضع تھا، اگر ابتدائی سن میں ہی بچوں کی

ہتھیلیاں موٹی، چھوٹی اور بھونڈی ہوتیں اور ان کی گہری ہتھیلیاں کوئی چیز پکڑنے کے قابل نہ ہوتیں تو اس سے کیا بہت سے بچے پڑھنے لکھنے سے اس عمر میں محروم ہو جاتے جبکہ دوسرے قلم یا پنسل تھام ہی نہ سکتے ہوں؛ اس کمسن انگریز بچی کو تمام پیرس والے آج تک یاد کرتے ہیں جس نے چنگ کے نادرِل پر حیرت انگیز جسارت کا مظاہرہ کیا تھا، میں نے ایک مجسٹریٹ کے ۵ سالہ بچے کو جو دستر خوان کی طشتریوں میں ایک گڑیا کے مانند بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً اپنے قد کے برابر سارنگی اس قدر عمدگی سے بجاتے ہوئے دیکھا کہ اکثر ماہرینِ فن بھی ششدر ہو کر رہ جاتے تھے، متذکرہ بالا اور بیشمار دیگر مثالوں کی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہمارے بڑوں کے کھیلوں کے متعلق بچوں کی مفروضہ نااہلیت محض خیالی ہے، اور یہ کہ اگر بچے کسی کھیل میں ناکام رہتے بھی ہیں تو یہ محض ناقص مشق ہونے کے باعث ہی ہوتا ہے۔

آپ فرمائیں گے کہ ذہن کی قبل از وقت بالیدگی پر میں جو سابق میں اعتراض کر آیا ہوں اب میں خود بھی جسم کی نشو و نما کے متعلق اسی غلطی میں پڑ رہا ہوں، درحقیقت یہ ہر دو اشکال بالکل مختلف اور جدا ہیں، ایک کی رفتارِ ترقی محض ظاہری ہوتی ہے اور دوسرے کی حقیقی، میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ بچے جس چیز کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ دراصل ان کی ذہنی ترقی نہیں ہوتی ہے، لیکن جو کام وہ کرتے نظر آتے ہیں وہ فی الواقع کرتے ہی ہیں، علاوہ ازیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ نقل و حرکت کو فطرتی ضرورت کے مطابق بآسانی از خود قابو میں رکھنے اور کھیل کود کو پر لطف بنانے کے لئے تغیر و تبدل وغیرہ کا عمل سب کا سب کھیل کھیل کے اندر ہی ہونا چاہیئے، اور اس کھیل کو کام میں تبدیل کرنے کی ذرا بھی کوشش نہ ہونی چاہیئے، اس لئے کہ بچے آخر وہ ایسا کون سا کھیل کھیلتے ہیں جس میں کہ ان کی رہنمائی اور تربیت کے لئے مجھے کافی مواد نہ دکھائی دیتا ہو، اور اگر میں بچوں کو کوئی تربیت نہ بھی دوں تب بھی جب تک وہ بے ضرر لطف حاصل کرتے رہیں اور ہنسی خوشی وقت گذارتے رہیں اس وقت تک ان کی رفتارِ حصولِ علم کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتی ہے، لیکن اگر ہر وقت اور ہر موقع پر انہیں کچھ نہ کچھ سبق دیا جاتا رہے تو

[illegible]

سامعہ

ان وہ لسوں کے استعمال کرنے کے متعلق جن کا استعمال نہایت مستقل اور اہم ترین ہے، میں جو کچھ
عرض کر چکا ہوں وہی بچے والوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بطور نمونہ کام دے سکتا ہے، اجسام
ے ساکت ہوں چاہے متحرک دیکھنا اور چھونا ہر حالت میں کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ لیکن سننا چونکہ محض ہوا
ں جنبش پیدا ہوتے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس لئے جب کوئی جسم حرکت میں ہوتا ہے تب ہی وہ شور و آواز
یدا کرتا ہے، اگر وہ ساکن ہو تو ہم کوئی آواز نہ سن سکیں۔

رات کے وقت جب ہم اپنی مرضی سے چلتے پھرتے ہیں تو ہمیں سوائے متحرک اجسام کے کسی اور چیز کا
نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں نہایت تیز کان اور اس حس کے ذریعہ جو پہلے تجربہ حاصل ہو چکا ہو اس کا
ا پر قوت فیصلہ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ جس جسم کی وہ حس پیدا کردہ ہے
ہ بڑا ہے یا چھوٹا، دور ہے یا نزدیک اور یہ کہ اس کی رفتار تیز ہے یا سست ہے یا طوفانی۔ ایک مرتبہ
ب ہوا میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو اس حرکت سے ہوا میں ایک جوابی دباؤ پڑتا ہے جس کے باعث
ا میں ایک گونج پیدا ہو جاتی ہے جو ہمارے احساس کو تازہ کر دیتی ہے اور ہم ایک دوسرے مقام پر
س بلند اور تیز آواز کو سن لیتے ہیں۔ اگر میدانوں اور وادیوں میں آپ اپنے کانوں کو زمین پر لگائیں
آپ کو لوگوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اس سے کہیں زیادہ فاصلے پر سے سنائی دے سکیں گی
تنے فاصلے سے کہ آپ کو کھڑے ہو کر سنائی دیتی ہیں۔

جس طرح کہ دیکھنے اور چھونے کا موازنہ کیا جا چکا ہے۔ اب اگر سننے کا بھی موازنہ اس طرح کر لیا جائے
بہت بہتر ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کسی ایک جسم سے جب دو اثرات رواں ہوتے ہیں تو آلۂ حسی
کے پاس ان میں کا کون سا اثر پہلے پہونچتا ہے، جب آپ توپ کی چمک دیکھتے ہیں اس وقت
آپ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں لیکن جب آپ اس کی آواز سنتے ہیں تو گولہ آپ تک پہونچ چکتا ہے
ور آپ کو حفاظت کا وقت نہیں مل سکتا ہے، چمک اور گرج کے درمیانی وقفے کا حساب لگا کر طوفان کا
اصلہ معلوم کیا جا سکتا ہے، یہ تمام واقعات بچے کو سیکھنے دیجئے اور جن جن واقعات تک اس کی
سائی ہو سکے ان کا تجربہ حاصل کرنے دیجئے اور ما بقی کو تحقیقات کے ذریعہ معلوم کرنے دیجئے۔

میں تو اس بات کا بڑا خواہش مند ہوں کہ آپ کے سکھانے پر سیکھنے کی بجائے بچہ کچھ بھی نہ سیکھے تو بہت ہی بہت بہتر ہوگا

ہماری آواز میں ایک آلہ ہوتا ہے جو سننے کا جواب ہے، ہمارے دیکھنے میں کوئی ایسی جوابی چیز نہیں ہے اور جس طرح ہم آواز کو دوہرا سکتے ہیں۔ رنگوں کو نہیں دوہرا سکتے ہیں۔ لہٰذا مجھول آواز مستعد آلوں کی مشق سے کانوں کو تعلیم و تربیت دینے کا مزید ایک ذریعہ مہیا ہو جاتا ہے۔

علم موسیقی انسان کی آوازیں تین قسم کی ہوتی ہیں خلقی یعنی محض گویائی۔ موسیقی یا ترنم یعنی سریلی آواز سوز یعنی کیفیت کا اظہار کرنے والی آواز اور یہ آخری آواز جذباتی زبان کا کام بھی دیتی ہے۔ اور گانوں اور تقریروں میں بھی جان ڈال دیتی ہے، بچے میں بھی یہ تینوں آوازیں بالکل اسی طرح موجود ہوتی ہیں جس طرح کہ ایک بڑے آدمی ہیں، لیکن فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بچہ ان کے استعمال سے انجان ہوتا ہے، وہ ہنستا ہے۔ چلاتا ہے۔ رنجیدہ ہوتا ہے چیختا ہے اور کراہتا ہے لیکن اپنے جذبات کو کسی تقریر یا گیت میں ادا نہیں کر سکتا ہے۔ ان ہر سہ آوازوں کا بہترین استعمال موسیقی ہی کے ذریعہ آ سکتا ہے، بچوں میں اس قسم کی موسیقی کی قابلیت معدوم ہوتی ہے۔ اور ان کے گانوں میں جذبات بالکل مفقود ہوتے ہیں، اسی طرح ان کی گفتگو میں بھی اثر نہیں ہوتا ہے: بچے چلاتے ضرور ہیں لیکن پُراثر الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے ہیں: بچوں کی آواز میں بھی اتنی ہی کم قوت ہوتی ہے جتنی کہ ان کی تقریر بے اثر ہوتی ہے۔ میرے چیلے کا طرز گفتگو اور بھی سیدھا سادا ہوگا، اور چونکہ اس کے جذبات ہنوز خوابیدہ ہی ہیں اور وہ اس کے لب ولہجہ کو متاثر نہیں کر سکتے ہیں، اس لئے آپ بچے سے کوئی جگر سوز یا خوش گوار قصہ نہ پڑھوائیں، اور نہ آپ بچے کو کوئی نام نہاد فصیح یا بلیغ تقریر سکھانے کی سعی فرمائیں جن چیزوں کو وہ سمجھ نہیں سکتا اور جن جذبات سے وہ بالکل ہی ناآشنا ہے، ان کے اظہار کے لئے بچے کو اپنی عقل صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آپ بچے کو سیدھے سادے الفاظ بولنا اور ان الفاظ کا صاف تلفظ ادا کرنا سکھائیے اور یہ سکھائیے کہ وہ بغیر تصنع کے نظم و نثر کا صحیح لب ولہجہ معلوم کر سکے، اس کی نقل کرے اور مدرسوں کے

بچوں کے عام نقائص کو نظر انداز کر کے بغیر چیخنے چلانے کے ہمیشہ اتنی ہی اونچی آواز سے گفتگو کیا کرے۔ جو دوسرے لوگ سن سکیں۔ الغرض کسی حالت میں بھی تضیع اوقات نہ ہونے دیجئے۔

موسیقی کے لئے بھی یہی طریقہ زیادہ مناسب اور ٹھیک ہے، آپ بچے کی آواز سریلی سدھی ہوئی ہموار اور مکمل بنائیے اور بچے کے کانوں کو اوقات موسیقی اور سروں سے آشنا کرا دیجئے اور بس اس سے زیادہ کچھ نہ کیجئے۔ مذاحیہ اور تھیٹروں کی موسیقی بچے کی عمر کے لئے غیر موزوں ہے، میری رائے میں اس سے تو یہ بہت ہی بہتر ہو گا کہ موسیقی کا ایک لفظ بھی نہ سیکھے۔ اگر میرے چیلے کو الفاظ کے ذخیروں کی ضرورت ہو گی تو میں بذات خود اس کے لئے گیت موزوں کروں گا جو اتنے ہی دل چسپ اور سادہ ہوں گے جتنے کہ ایک بچے کے خیالات سادہ ہوتے ہیں۔

آپ شاید یہ فرض کر بیٹھیں کہ چونکہ امیل کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی مجھے کوئی جلدی نہیں ہے اس لئے شاید میں موسیقی بھی نہ سکھاؤں گا، آئیے ہم بے ضرورت دماغ سوزی اور اس کی شدت سے امیل کو محفوظ کر دیں اور اس کے ذہن کی رسمی اشاروں کی طرف رہ نمائی کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں یہ تو میں جانتا ہوں کہ بظاہر یہ معاملہ دشوار ضرور معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ بادی النظر میں تقریری حروف کے علم کے مقابلے میں گانے کے گیتوں کا علم گو زیادہ ضروری نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقتاً ان کے مابین ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جب ہم تقریر کرتے ہیں تو اس میں گویا ہم صرف اپنے ذاتی خیالات ہی کا اظہار کرتے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے ہمیں ان خیالات کا پڑھنا یعنی موسیقی سیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

علیمی دُنیا پر ایک نظر

ب بیک کالج

جلسۂ تقسیم اسناد کے سلسلے میں ڈاکٹر لاک وڈ نے پچھلے دنوں برک بیک کالج کی ترقی و توسیع کے متعلق
مختصر سی تقریر کی، اور اس تقریر میں لندن یونی ورسٹی کے نظام عمل میں اس کے مقام کو واضح کیا، انھوں نے
ج کی تدریجی ترقی اور اس کے بڑھتے ہوئے معیار پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا، شروع شروع میں اس کالج
ل کچھ غیر تعلیمی سا تھا اور فن مباحثہ، حفظان صحت، شطرنج اور ورزش محض تفریحی مشاغل کا درجہ رکھتے
ن جنگ میں تعلیمی مشاغل میں نمایاں ترقی ہوئی اور تحقیقات کے شعبوں میں بھی جان سی پڑ گئی۔ اب تو
ٹ گریجویٹ کلاس میں طلبہ کی تعداد ۴۰۰ ہونے لگی اور مختلف ڈگری کلاس میں پڑھنے والے طلبہ کی
ڈیڑھ ہزار تک پہونچ گئی ہے پچھلے سیشن میں مختلف طلبہ نے ۲۰۰ ڈگریاں حاصل کیں جن میں سے ۲۲ ڈاکٹریٹ
کی تھیں اور ڈگری امتحانات میں کامیاب ہونے والے ۲۷۰ طلبہ میں سے ۱۴۲ آنرز ڈگری کورس میں شامل تھے

طلبہ کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر لاک وڈ نے کہا کہ اس کالج میں داخلے کی ایک شرط کل
ی ملازمت تھی بلکہ ۱۹۵۰ کے اعداد و شمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ طلبہ کی کل تعداد ۱۵۷۷ تھی جس میں
۴۹۰ طلبہ مختلف اداروں کے معلم تھے ۔ ۲۰۰ ٹکنیکل اسسٹنٹ، ۱۲۷ سکریٹری اور ۴۰ اسکول ملازم
تقامی سرکاری افسر اور ۸۰ کیمیا داں تھے۔ اور باقی تعداد پادریوں۔ قانونی مشیروں، ڈاکٹروں اور گھریلو
بار میں مدد کرنے والوں پر مشتمل تھی۔

ان جملہ دقتوں کے باوجود طلبہ کی یونین نے پچھلے ۹۴ سال میں طرح طرح کے مشاغل کا اہتمام
یونین کی بالغ نظری اور پختہ کاری کے پیش نظر ہے یونین ۴۳ سال تک کالج کی مجلس انتظامیہ
لئے دو نمائندے منتخب کرتی رہی اور ایک ایسے کالج میں جہاں پڑھنے والوں کی عمر [illegible]

کی جو اس قسم کی نمائندگی قائم رہ سکتی ہے:

مدرسین کی تربیت

یونی ورسٹی کالج ہل کے پرنسپل مسٹر جے آرج نکلسن نے پچھلے دنوں "مدرسین کی تربیت" کے موضوع پر ایک مختصر مگر جامع تقریر کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اساتذہ کی تربیت اور ان کے لئے مطالعہ کی فوقیت کی بھی وضاحت کی۔ ان کے خیال میں بوڑھے ہونے کے باوجود مدرسین کی تربیت ضروری ہے، بعض لوگ تجربہ کار اور تعلیم یافتہ مدرسین کو اس کلیے سے مستثنیٰ قرار دینے کے عادی ہو چکے ہیں، حق یہ ہے کہ تدریس میں جان ڈالنے کے لئے اور اسے بچوں کے لئے زیادہ موثر اور دلچسپ بنانے کی خاطر مدرسین کو نئے نئے خیالات و رجحانات سے واقف ہونا ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ کی تربیت میں جوان اور بوڑھے کی قید اٹھا دی جائے، لیکن تدریس میں ایک اور تکنیکی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، انسان ذہنی اعتبار سے بہت پیچیدہ ہوتا ہے، بعینہٖ جس طرح ایک مشین اپنے کل پرزوں کی ساخت میں پیچیدہ ہوتی ہے۔ تھارن ڈائک اور دوسرے مفکرین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ چالیس چھیالیس سال کی عمر میں بھی پڑھنے لکھنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے، اگر بالغ انسان مطالعہ سے گریز کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ بڑھاپے نے اس کے دماغی قویٰ کو معطل کر دیا ہے، بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک نہیں بیسیوں مسائل ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنی توجہات کو ایک مقام پر مرکوز نہیں کر سکتا۔

مسٹر نکلسن نے مزید کہا "بالعموم جو شخص تکنیکی مہارت کا مالک ہوتا ہے اور اس میں ادبی ذوق کم کم ہوتا ہے، آگے چل کر اچھا اور مفید بالغ طالب علم بن جاتا ہے، تکنیکی مہارت کے مالک اور صنعت کار اپنی حدود سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کسی فن کو سیکھنے کے لئے اور اس میں دسترس پیدا کرنے کے لئے اس کے مبادیات کو سمجھنا اور اس کی حدود کو جاننا ضروری ہوتا ہے، ذہن کی تعلیم ..... کے سلسلے میں بھی یہ بات پوری پوری صادق آتی ہے۔ مدرس کے لئے خود اپنے ذہن اور اپنے شاگردوں کے ذہن کے تعامل کا تجزیہ ضروری ہے، اسے اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کے اختلاف کا علم ضروری ہے، اور اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ خود اس کا ذہن ہمیشہ بہترین نہیں ہوا کرتا۔

اسی مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مسٹر مکلن نے کہا یونی ورسٹی میں پڑھانے والوں کو طریق تدریس کی تربیت نہیں دی جاتی۔ جہاں تک میرا ذاتی تعلق ہے اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس دنیا میں کچھ پیدائشی مدرسین بھی ہوتے ہیں جنہیں قدرت درس تدریس کا عجیب و غریب ملکہ بخش دیتی ہے لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے"

اسکاٹ لینڈ میں تعلیم

اسکاٹ لینڈ کے محکمہ تعلیم نے ۱۹۵۳ء کی جو تعلیمی رپورٹ پیش کی ہے اس میں ٹیکنیکل تعلیم کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی ہے لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ تعلیم کے دوسرے شعبوں سے بے توجہی برتی گئی ہے،

یہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو فروغ دینے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں، لیکن اس رپورٹ کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی عالمگیر جنگ کے اثرات اب تک باقی ہیں جس کی وجہ سے ان اداروں کی رفتار ترقی کچھ رکی رکی سی معلوم ہوتی ہے۔ ابتدائی مدارس میں بچوں کو انگریزی بولنے، پڑھنے لکھنے اور سمجھنے میں اب بھی دقت محسوس ہوتی ہے، تاریخ و جغرافیہ کی تدریس میں پہلی سی بے ترتیبی باقی ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ تدریس فہم و ادراک سے بعید ہوتی ہے، علم الحساب کی تدریس میں جو خامیاں تھیں وہ آج بھی موجود ہیں، ان میں بنیادی علم کو مربوط کرنے میں ناکامیابی اور مختلف مسائل میں وقت اور توجہ صرف کرنا شامل ہیں یا مطالعۂ قدرت کی تدریس بھی کچھ ان سے مختلف نہیں ہوتی۔ سماجی مشاغل کے اہتمام میں بھی کچھ کوتاہیاں ضرور ہیں، ان مشاغل میں کامیابی کا انحصار بالعموم معلم کی شخصیت اور اس کی تدریس پر ہوتا ہے۔ البتہ آرٹ اور موسیقی میں طلبہ نے اچھی خاصی ترقی کر لی ہے۔ جسمانی تربیت کی تعلیم کے لئے ہنوز کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس روداد کے مطابق جونیر اسکولوں میں اب تک پرانے طریقے رائج ہیں اور اسکاٹ لینڈ کی پرانی درسی روایات زندہ ہیں۔ اچھی اور عمدہ اسکیموں میں وسعت نظر اور بلندی فکر کو کافی دخل ہوتا ہے، پھر بھی ان میں سے بعض اسکیموں کو از سر نو مرتب کرنا ہوگا۔ ان میں سے کچھ نامعقول اور غیر مناسب بھی ہیں۔ نامناسب اور غیر موزوں اس لئے کہ حسن تعلیم گاہوں کے لئے انہیں مرتب کیا گیا ہے۔ "

انہیں کے لیے مفید نہیں ہیں۔ اور سب سے زیادہ غیر اطمینان بخش حالت ان اداروں کی ہے جن میں
بچوں کی صلاحیتوں کی تعمیر و تشکیل کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی اور غیر نصابی مشاغل یا کم کوش بچوں کی
تعلیم کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ اگر پچھلے سال کی تعلیمی حالت کا اس سال کی تعلیمی
حالت سے موازنہ کیا جائے تو حالات بہتر اور امید افزا نظر آتے ہیں، اس کے باوجود پچیس سال پرانے تدریسی
طریقوں کے اثرات اب بھی غالب ہیں اور ان میں سینئر اسکول سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ
کے مدارس نئے تعلیمی تجربوں سے بہت کم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگرچہ بعض مدارس جدید رجحانات کے بھی حامل
نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود اس رپورٹ سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمی ترقی کی دوڑ میں اسکاٹ لینڈ کو
ابھی دشوار گزار منزلیں طے کرنا ہوں گی۔ اس سے پہلے ان بچوں کے مسائل حل ہوتے نظر نہیں آتے۔ جو
پندرہ سال کی عمر میں تعلیم و تدریس کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، بہرصورت اس تعلیمی رپورٹ سے یہ واضح ہو جاتا ہے
کہ اسکاٹ لینڈ کے مدارس میں تجربے پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ ان کے پیش نظر صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ
کہ اساتذہ کی کمی اور دوسری تعلیمی دشواریوں کے باوجود آگے بڑھنے کی جدوجہد جاری رہ سکے، بالخصوص دیہاتی
علاقوں میں اس مسئلے کا حل زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، ریاضی اور سائنس کے اساتذہ کی تو عام طور پر کمی محسوس
کی جا رہی ہے۔ اب موسیقی، آرٹ اور تربیت جسمانی کے مدرسین بھی کم یاب ہیں۔
سینئر ثانوی مدارس کی حالت قابل اطمینان ہے، یہاں بچوں کو لیونگ سرٹیفکٹ ملتے ہیں لیکن جملہ
مدارس میں خواہ وہ ابتدائی ہوں یا جونیئر یا سینئر ثانوی مدارس ہوں نئے تعلیمی رجحانات اور تدریسی طریقوں میں
بہت کچھ اختلاف آرا موجود ہے اور اسکاٹ لینڈ میں تعلیم کی مشاورتی کونسل کی مسلسل رپورٹوں سے اس کا بخوبی
اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کی کمی، نئے منصوبوں کو بروئے کار لانے کا غیر مناسب انتظام، سماجی پس منظر
سینئر ثانوی مدارس پر یونیورسٹی کے اثرات۔ پرانے اساتذہ کا پرانے طریقوں سے گریز کرنا یا اسی قسم کے
بیسیوں اعتراضات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ والوں کو اپنی تعلیمی ترقی کے ان دشوار گزار مراحل
کا علم ہے اسی لیے انہیں دور کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں، اور فی الواقع یہی ترقی کی نشانی ہوا کرتی

سرکاری جریدے کے اعلانات

نیڈ/۲۰۱۱۵ م۔ ایم اے امین حزیری ایم اے ایک امیدوار ایک خالی اسامی پر لارنس کالج گھوڑا گلی میں ۶ مارچ ۵۸ء سے بشاہرہ ۲۲۵-۱۵-۴۰۰ روپے نائب مدرس مقرر ہوئے (قائم مقام)

م۔ عبدالستار ایم اے۔ ایک امیدوار ایک خالی اسامی پر ۹ اپریل ۵۸ء سے بشاہرہ ۲۲۵-۱۵-۴۰۰ روپے قائم مقام نائب مدرس مقرر ہوئے۔

ای/۱۴۱۱۳ م۔ رشید احمد خاں ایم۔ اے۔ بی ٹی۔ قائم مقام لیکچرر سیاسیات گورنمنٹ کالج کیمبل پور اپنے سابقہ عہدہ پر گورنمنٹ ہائی اسکول شورکوٹ (جھنگ) میں بحیثیت سائنس ماسٹر واپس ہوئے (تاریخ حاضری سے)

ای/۱۴۰۰۳ ایس نذر محمد بخاری ایم۔ اے۔ بی ٹی (۲۵۰/۳۰۰) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور۔ ایس شبیر حسین بخاری۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس افسر بکار خاص دفتر ناظم تعلیمات پنجاب کی جگہ پر تاریخ حاضری سے ڈی۔ آئی۔ ایس۔ گجرات مقرر ہوئے (بشاہرہ خود)

ای/۱۴۱۹۸ م فضل الدین۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل (۱۵۰/۳۵۰) مدرس عربی سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور۔ م عبدالمجید خاں بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس کی جگہ تاریخ حاضری سے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپتن مقرر ہوئے (بشاہرہ خود)

م۔ حکیم بخش خاں۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۵۰ ۔ ۲۵۰/۲۰۰) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان م مستنصر باللہ پی۔ ای۔ ایس کی جگہ جن کا تقرر بحیثیت ڈی۔ آئی۔ ایس ملتان ہو چکا ہے، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان مقرر ہوئے (تاریخ حاضری سے۔ بشاہرہ خود)

م۔ عبدالحمید مسلم۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۴۰ ۔ ۲۵۰/۳۰۰) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر م۔ حکیم بخش خاں کی جگہ تاریخ حاضری سے، ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خاں مقرر ہوئے (بشاہرہ خود) ایس۔ امام بخش خان ایم اے۔ بی ٹی (۴۰ ۔ ۲۵۰/۳۰۰) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس۔ ملتان۔ م عبدالحمید مسلم کی

م۔ عبدالغنی ایم۔ اے، بی۔ ٹی (۲ ۱۳۰ - ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادن خان
م۔ محمود الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے، اے، ڈی۔ آئی۔ ایس راولپنڈی مقرر
ہوئے (بشاہرۂ خود)

۱۹۸۰۰۹/ن چودھری اصغر علی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۸۳ ۱۳۰ / ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس۔ سیالکوٹ م۔ محمود حسین
صدیقی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے۔ اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس لاہور مقرر ہوئے (بشاہرۂ خود)
م۔ محمود حسین صدیقی۔ بی اے۔ بی۔ ٹی (۳۹۰ ۱۳۰ / ۲۵۰) اے، ڈی۔ آئی۔ ایس۔ لاہور۔ م۔ عبدالقیوم
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے۔ اے، ڈی۔ آئی۔ ایس شیخوپورہ مقرر ہوئے۔
م۔ عبدالقیوم ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۹۰ ۱۳۰ / ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس شیخوپورہ، چودھری اصغر علی کی جگہ
تاریخ حاضری سے۔ اے۔ ڈی۔ آئی۔ ایس۔ سیالکوٹ مقرر ہوئے (بشاہرۂ خود)

۱۹۹۰۰/ن م۔ عبدالحمید بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۹۳ ۱۳۰ / ۲۵۰) مدرس سائنس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (لاہور) شیخ
محمد نواز کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے مدرس سائنس گورنمنٹ نارمل اسکول قصور مقرر ہوئے۔
(بشاہرۂ خود)

شیخ محمد نواز بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۳۵۳ ۱۳۰ / ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول قصور م۔ عبدالحمید
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل اسکول قصور مقرر ہوئے۔
م۔ مجید علی خاں۔ ایم۔ ایس سی (زراعت) دعم ایک امیدوار (جو فی الحال پنجاب زراعتی کالج لائلپور
میں بحیثیت اگری کلچر اسسٹنٹ، فروٹ سیکشن کام کر رہے ہیں) ایک خالی اسامی پہ تاریخ حاضری سے گورنمنٹ
نارمل اسکول ننکانہ صاحب میں مدرس زراعت مقرر ہوئے (بشاہرہ ۱۰۰ روپے۔ ۱۳۰ / ۲۵۰)

۱۹۹۹۱/ن چودھری علم الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۳۴۳ ۱۳۰ / ۲۵۰) مدرس انگریزی گورنمنٹ اسکول پنڈدادن خان (جہلم)۔ م۔
محمد اصغر ملک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے مدرس انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال
مقرر ہوئے (بشاہرۂ خود) آزمائشی م۔ محمد اصغر ملک بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ / ۲۵۰) معلم انگریزی گورنمنٹ
ہائی اسکول ساہیوال (شاہپور) آزمائشی چودھری علم الدین کی جگہ تاریخ حاضری سے مدرس انگریزی گورنمنٹ

Regd. No. L. 3257

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ھے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ھے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ھے - جو کہ مینیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)